''چہارسُو''

......مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں ......

مناظر عاشق ہرگانوی کا تخلیقی دائرہ کافی وسیع ہے۔قدرت نے ان کو تجرباتی ذہن و دماغ عطا کیا ہے۔چنانچہ تجربہ پسند طبیعت محض معروف و مقبول شعری اصناف تک ہی محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ دیگر شعری اصناف سخن میں تجربہ کرنے پر انہیں مجبور کرتی ہے۔آزاد غزل، ہائیکو، ماہیا، کہہ مکرنی، غزال، کہمن، ہتکونی، اردو دوہا، دوہا غزل، غزل نما اور رینگا وغیرہ اصناف میں موصوف نے مجموعے اردو کو دیئے ہیں اور اولیت کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض اصناف کے موجد دوسرے شاعر ہیں لیکن مناظر عاشق ہرگانوی نے خود بھی تجربے کیے ہیں، ان اصناف کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور دوسروں کو متحرک کر کے کتابیں شائع کی ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعری میں حیات و کائنات اور انفرادی احساسات و کیفیات کا حسین وجمیل مرقع نظر آتا ہے۔جذبات و کیفیات کی نقش گری میں انہیں مہارت حاصل ہے۔اسی لیے مشاہدات و تجربات کو چاند تاروں کی چمک اور تابانی ومنوری عطا کرتے ہیں۔ ......**ڈاکٹر مظفر مہدی**

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۱۵۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت

...... صورتِ معنی، معنیٔ صورت ......

جدید نظم کی تفہیم کا باقاعدہ آغاز حلقہ اربابِ ذوق کے توسط سے ہوا۔اردو تنقید میں یہ پہلا موقع تھا کہ فن پارے کو باقاعدہ اور زندہ وجود مان کر اس کے معنی کے ابعاد تک رسائی کی کوشش کی گئی (جو بہرحال ثمر بار ثابت ہوئی)۔ بلاشبہ اسی کوشش کی بدولت فن پارے کے غیر ضروری متعلّقات، روایتی تاویلات و تاثرات کی حوصلہ شکنی ہوئی۔تفہیم کے انہی اصولوں کا ''ادبی دنیا''، ''اوراق'' اور دیگر کئی ایک رسائل نے خیر مقدم کیا۔ازاں بعد جدید و مابعد جدید ناقدین نے اس ضمن میں حیرت زا کارنامے انجام دیے تو تفہیم نظم کا باقاعدہ، الگ اور منفرد انداز وقت کی ضرورت بن گیا۔۔گزشتہ سات دہائیوں میں نظم مجید امجد کی ہیئت، تکنیک اور معنویت کے حوالے سے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ناقدین نے جو تفہیم کی، وہ مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتی رہی ہے۔جنید امجد نے بڑی محنت سے اس سارے کام کو سنین وار ''صورتِ معنی، معنیٔ صورت'' میں یکجا کر کے قارئین مجید امجؔد کے لیے آسانیاں بہم کی ہیں۔ موصوف نے مجید امجد کی سوانح کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے ایک مفصّل مضمون بھی تحریر کیا ہے، جو قابلِ توجہ ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مجید امجؔد کے سوویں سالِ ولادت کے موقع پر گراں بہا تحفہ سے کم نہیں۔اُمید ہے اس سے طلبا، اساتذہ، شعرائے نظم، ناقدین و محققین برابر مستفید ہوں گے اور اہلِ نظر سراہیں گے۔ ......**غلام شبیر اسد**

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۴۰۰ روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، فیصل آباد۔

...... متاعِ فکر ......

شائستہ سحؔر دنیائے شعر وسخن میں اپنی ایک منفرد پہچان کی حامل ہیں۔اُن کی شعری تخلیقات معتبر اخبارات وجرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں۔پیشۂ معلّمی سے وابستگی کے باعث شعر وادب سے اُن کا شوق وشغف فطری نوعیت کا ہے۔اُن کا کلام عمومی نسائی شعری ڈگر سے ہٹ کر ہے، جس سے ایک تازہ کاری کا احساس مترشح ہوتا ہے۔''متاعِ فکر'' سے چند شعری استشہادات مع ناقدانہ تصریحات سپرد قرطاس ہیں۔

شائستہ کی شاعری احساسِ ذات اور کربِ ذات کی ردا اوڑھے ہوئے ہے، جس میں حرماں نصیبی کے قصے اور محرومیوں کے فسانے ہیں۔ مجموعی طور پر اِن کا سخن حزینہ رنگ کا حامل ہے۔غم کی آنچ شدید نوعیت کی ہے جو قاری کو بھرپور انداز میں متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ان کا نظریۂ شعر، شعر برائے شعر گفتن خوب است کے زمرے سے منسوب نہیں ہے۔ان کی سخن سنجی شعری واردات کی حیثیت رکھتی ہے جو خود میں تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اِنہیں اِس امر کا بخوبی ادراک ہے۔

مرے مقدر میں اُلجھنیں ہیں، مرا مسرت سے کیا تعلق
سدا نہیں رہنا میں نے جگ میں رہے گی میری کہانی باقی

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۵۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۴،شمارہ:مارچ،اپریل ۲۰۱۵ء

رابطہ:537/D-1 'گلی نمبر 18،ویسٹریج-III'راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-5462495,5490181

فیکس:(+92)-5550886

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

☆

قرطاس اعزاز

''اُس کے سفید پروں تلے ریت تھی اور وہ اڑان میں تھا''
(بہاؤ)

''اے ارجن، موت نیزوں اور بھالوں کے بدن میں اترنے سے واقع نہیں ہوتی بلکہ پرماتی کر بھلا دینے سے انسان مر جاتا ہے۔''
(اے غزالِ شب)

''میری آنکھیں نہیں ہیں، یسوع میری مدد کرنے آیا''
(فاختہ)

''گدھ نے کہا ''کڑیل جوانوں کے یہ مُردے بڑے لذیذ ہوتے ہیں'' سرحد کے ایک طرف مرنے والے شہید اور دوسری جانب مرنے والے کافر۔۔۔لیکن دونوں لذیذ''
(پکھیرو)

''محمد علی ڈاکیا بدفشانی گھوڑے پر سوار جس کے تھیلے میں میرے نام کا اگر ایک خط ہے تو وہ خط کس کا ہے۔''
(ڈاکیا اور جولاہا)

''چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں''
(راکھ)

''ڈولفن ابھرتی گئی، گیلے بدن پر سُورج کو وصول کرتی، روشن ہوتی ابھرتی گئی، سندھ کے پانیوں میں سے ایک اندھی دیوی کی مانند ابھرتی گئی''
(قربت مرگ میں محبت)

''آؤ مدینے چلیں، جس کے راستے میں تتلیاں ستاتی ہیں''
(منہ وَل کعبے شریف)

''باپ رخصت ہو جائے تو سورج مدھم پڑ جاتا ہے، ماں بچھڑ جائے تو چاندنی پھیکی پڑ جاتی ہے''
(چھوٹی سی بات)

''چھن چھن کردی گلی وِچوں لنگدی۔۔۔
ساڈھے سجناں دی ڈاچی بادامی رنگ دی''
(غارِ حرا میں ایک رات)

مستنصر حسین تارڑ
کے نام

''عشق کے امتحاں''

محبوب خان بگٹی
(ڈیرہ بگٹی)

نام:
مستنصر حسین تارڑ

پیدائش:
یکم مارچ ۱۹۳۹ء، لاہور

والد:
چوہدری رحمت خان تارڑ

والدہ:
محترمہ نواب بیگم

بہن بھائی:
۱۔ مستنصر حسین تارڑ
۲۔ زبیر حسین تارڑ
۳۔ کرنل مبشر حسین تارڑ
۴۔ پروین منظور
۵۔ شاہدہ الطاف
۶۔ شائستہ ذوالفقار

تعلیم:
ٹیکسٹائل انجینئرنگ ڈپلومہ (لندن)
ایف اے (گورنمنٹ کالج لاہور)

شادی:
۱۹۷۰ء۔ بیگم میمونہ تارڑ

اولاد:
۱۔ سلجوق مستنصر تارڑ
۲۔ سمیر تارڑ
۳۔ قرۃ العین (ڈاکٹر)

اعزازات:
۱۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی
۲۔ بہترین ناول نگار تمغہ از وزیر اعظم پاکستان برائے ناول ''راکھ''
۳۔ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے عالمی فروغ اردو ادب، دوحہ (قطر)
۴۔ سونے کا تمغہ از ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی برائے ادبی خدمات
۵۔ مختلف ٹی وی اور ادبی اداروں کی طرف سے اعزازات
۶۔ ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ہم عصر ادیبوں میں سب سے زیادہ تحقیقی کام ہوا۔
۷۔ روزنامہ ''ڈان'' کے مطابق جدید سفرناموں کا انہیں باوا آدم کہا جاتا ہے۔
۸۔ ناول نگار، سفرنامہ نگار، کالم نگار، ڈرامہ نگار، افسانہ نویس اور مزاح نگار
۹۔ پچھلے بیس سالوں سے پاکستان کے بیسٹ سیلر اردو مصنف ہیں۔

ناول:

۱۔ ''بہاؤ'' — بی بی سی نے اسے کلاسک کا درجہ دیا جبکہ ایک بھارتی ادبی سروے میں اسے بیسویں صدی کا بہترین ناول قرار دیا۔

۲۔ ''راکھ'' — وزیر اعظم کی طرف سے سال کا بہترین ناول قرار دینے کا تمغہ ملا۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی، جرمنی کی اردو پروفیسر خاتون ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہلڈ نے اسے کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک کے ایک پرچے کے لیے بطور جنوب مشرقی نمائندہ ناول کے طور پر چنا۔ جرمنی میں اس کے کچھ ابواب ترجمہ بھی کیے گئے۔

۳۔ ''قربتِ مرگ میں محبت'' — تینوں کا مجموعہ

۴۔ ''ڈاکیا اور جولاہا'' — ممنوعہ محبت کی ایک داستان

۵۔ ''قلعہ جنگی'' — افغانستان کے طالبان کے حوالے سے لکھا گیا

۶۔ ''خس وخاشاک زمانے'' — روزنامہ ''ڈان'' کے مطابق یہ پنجاب کی ۱۹۳۰ء سے لے کر ۲۰۰۹ء تک کی رزمیہ ثقافتی اور رسم و رواج کی داستان ہے جو امریکہ اور کینیڈا میں پنپ رہا ہے۔

۷۔ ''اے غزالِ شب'' — عبداللہ حسین نے اسے تارڑ کا بہترین ناول قرار دیا جبکہ روزنامہ ''ڈان'' نے اسے ایک شہ پارہ قرار دیا۔

۸۔ ''فاختہ'' — اس ناولٹ میں سوویت یونین اور جنگ کی خوفناکیوں کے بارے لکھا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اسے اردو ادب میں کلاسیکی کا درجہ دیا ہے۔

۹۔ ''پکھیرو'' اسے پہلا جدید پنجابی ناول قرار دیا گیا ہے جبکہ گرونانک دیو یونیورسٹی ، بھارت کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

۱۰۔ ''پیار کا پہلا شہر'' پیرس کے پس منظر میں لکھی گئی یہ ایک سادہ مگر دل کو چھو لینے والی رومانوی تحریر ہے اس کے 56 ایڈیشن اب تک چھپ چکے ہیں اور اس کا مرکزی کردار ''پاسکل'' یادگار بن گیا ہے۔

۱۱۔ ''دیس ہوئے پردیس'' اس ناول کی تعریف قرۃ العین حیدر نے بھی کی۔

۱۲۔ ''جپسی'' سوئٹزرلینڈ اور پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا تقریباً ایک آپ بیتی ہے۔

سفرنامے:

۱۔ ''نکلے تیری تلاش میں'' تارڑ صاحب کی پہلی ادبی مہم جوئی جس کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا میں جانے گئے۔ ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ اپنے طرز کی وجہ سے اسے سفرناموں میں رجحان سازی کا ذریعہ بھی کہا گیا۔ کافی عرصے تک زیادہ بکنے والی کتابوں میں شمار ہوتا رہا۔

۲۔ ''اندلس میں اجنبی'' سرزمین اندلسیہ کی تاریخ پر ایک تحقیقی انداز کا سفرنامہ

۳۔ ''خانہ بدوش'' بیروت میں خانہ جنگی کے دوران سفر کرتے ہوئے ساحلوں سے ہوتے ہوئے روم تک جا نکلے۔

۴۔ ''نِکی پیکنگ کی'' چائنہ کے متعلق ایک کلاسیکی سفرنامہ

۵۔ ''نیپال نگری'' پہاڑوں کے اس دیس کے متعلق سفرنامہ

۶۔ ''سنہری اُلو کا شہر'' دہلی، آگرہ اور فتح پور سکری کا سفرنامہ

۷۔ ''ماسکو کی سفید راتیں'' سوویت یونین اور موجودہ دور کے ماسکو کے تناظر میں لکھا گیا ایک خوبصورت سفرنامہ

۸۔ ''الاسکا ہائی وے'' کینیڈا کی یاقون وادی اور الاسکا کے متعلق پہلا سفرنامہ

۹۔ ''منہ ول کعبہ شریف'' حج کے تجربات پر مشتمل ایک سفرنامہ

۱۰۔ ''غارحرا میں ایک رات'' غار حرا میں اکیلے گزاری گئی ایک پوری رات کی کہانی پر مشتمل ایک سفرنامہ

پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے سفرنامے

۱۔ ہنزہ داستان

۲۔ سفر شمال کے

۳۔ برفیلی بلندیاں

۴۔ چترال داستان

۵۔ رتی گلی

۶۔ یاک سرائے

۷۔ شمشال بے مثال

۸۔ دیوسائی

۹۔ سنولیک

۱۰۔ کے۔ٹو کہانی

(تارڑ صاحب نے اپنا سفرنامہ ''کے ٹو کہانی'' دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی کو اپنے کوہ پیاؤں کی ٹیم کی راہنمائی کرتے ہوئے لکھا جس کا پہلا ایڈیشن پندرہ دن میں فروخت ہوگیا۔ ''کے ٹو کہانی'' اس وقت لانچ ہوئی جب پی آئی اے کا جیٹ طیارہ خدائی پہاڑی کے سفید پیرامائیڈ کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔)

افسانے:

سیاہ آنکھ میں تصویر کے علاوہ ''کوٹ مراد'' ''پریم'' ''یہ'' ''بابا بیگلوس'' کی وہ مختصر کہانیاں ہیں جو انڈیا کے مشہور شاعر اور ڈائریکٹر گلزار سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں اور انہوں نے دو نظمیں بھی لکھیں جو ان کے شاعری کے مجموعے میں شامل ہیں۔

ٹی۔وی ڈرامے:

۱۔ ہزاروں راستے

۲۔ فریب

۳۔ پرواز

۴۔ صاحب سرکار

۵۔ کیلاش

۶۔ سورج کے ساتھ ساتھ

سات سال تک پی ٹی وی میں صبح کے پروگرام کی میزبانی کرتے رہے۔ پچھلے چار عشروں سے زائد وہ اپنی بیگم میمونہ کے ساتھ ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے تین بچے ہیں۔ پہلا سلجوک جو ایک سفارت کار ہے اور اس وقت اقوام متحدہ میں خارجہ امور کے تحت پاکستان کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دوسرا بیٹا سمیر ایک سینئر سول سرونٹ ہے اور شعبہ کسٹم میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ تیسری بیٹی قرۃ العین میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور امریکہ کے شہر اور لینڈو ریاست فلوریڈا میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

اُن کا مستقل پبلشر ''سنگِ میل پبلی کیشنز'' پاکستان کا سب سے بڑا اور قابل احترام پبلشنگ ہاؤس ہے۔

تارڑ کی مزید تفصیلات کے لیے اُن کے فیس بک اکاؤنٹ اور تارڑ کے پڑھنے والوں کی دنیا تک رسائی حاصل کیجیے۔

جنہوں نے مسکرانا سکھایا

مستنصر حسین تارڑ

دھوپ، ٹھٹھرتی ہوئی گدلی اور بے رنگ جو شدتِ سرما کے بوجھ تلے دب کر فضا میں ہی تحلیل ہو جاتی ہے۔

دھوپ، سفید سیسے کی طرح پگھلی، کرنیں چبھتے کھُبتے کانٹے، موسم گرما کی آگ جیسے آسمان سے دیوانگی برس رہی ہے۔

مگر یہ دھوپ۔۔۔

فروری کا آخیر، ایک فٹ پاتھ، دھوپ کا وہ لمس جو بدن سے چھوتے ہی اُن رُتوں کو معدوم کر دیتا ہے جنہیں شمار کر کے ہم اپنے آپ کو بوڑھا یا جوان کہتے ہیں۔۔۔کوزی (Cosy) نگھی اور آرام دہ دھوپ۔۔۔میری ہتھیلیاں مجھے بتلاتی ہیں کہ پتلون کی جیب میں اور باہر فضا کا ایک ہی درجۂ حرارت ہے۔ میں اتوار کی دوپہر کو کاہل الوجودی کی تمام تر لذتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

چوڑے فٹ پاتھ پر سیکنڈ ہینڈ کتابیں اور رسالے اپنے کاغذی جسم پھیلائے اسی دھوپ میں پڑے اونگھ رہے ہیں۔

ایئر فورس کے چند کیڈٹ ہوابازی کے رسالوں کو الٹ پلٹ رہے ہیں۔ جدید ترین لڑاکا ہوائی جہازوں کی تصاویر دیکھ کر اُن کے چہروں پر وہی شہوت پھوٹنے لگتی ہے جو اسی عمر کے عام لڑکوں کے بدن کو اس وقت بے چین کرتی ہے جب وہ کسی نیم برہنہ جسم کو دیکھ لیتے ہیں۔

کچھ طالب علم پرانی کتابوں کے ڈھیروں میں سے کورس کی کتابیں تلاش کر رہے ہیں۔

دھوپ، مہربان اور نسوانی بدن میں سے آتی آنچ ایسی دھوپ۔

چند بچے کامکس دیکھنے کے علاوہ ٹٹ بٹس کے پرچوں میں پوشیدہ پن اُپس بھی ملاحظہ کر رہے ہیں۔

میں نیشنل جیوگرافک کے ڈھیر میں سے ایسے شمارے کی تلاش کرتا ہوں جو میرے پاس نہیں ہیں۔ دو شمارے ملتے ہیں۔ کتابوں والے سے قیمت دریافت کرتا ہوں۔۔۔دس روپے فی! میں رسالے اسی ڈھیر میں غرق کر کے پھر دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔

ایئر فورس کے کیڈٹوں، باریش مولانا، طالب علموں اور بچوں سے پرے فٹ پاتھ کے دوسرے کنارے پر کھڑا ایک لمبا تڑنگا، خوش لباس گورا سا شخص کتابیں دیکھ رہا ہے۔

''جھیل کے شفاف اور نیلے پانی پر ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی ہے۔ دور بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے ہیں۔ کناروں پر پھولدار بیلیں اور پودے جھکے ہوئے تھے اور بے شمار تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے دور دور تک چلے گئے تھے۔ دوسرا کنارہ بہت دور تھا اور کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا تھا۔ کبھی دور دور تک محل اور قلعے دکھائی دیتے۔ کبھی گھنے اور سرسبز باغ اور کبھی ریت کے ٹیلے اور نخلستان نظر آتے''

میرا جی چاہا کہ میں اُسی کے ایک کردار کی طرح جا کر پوچھوں ''ایک چھ فٹ کے لمبے تڑنگے خوبصورت گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں؟''

بیڈن روڈ پر متعدد آنہ لائبریریاں تھیں اور ان سب کے مالک مجھ سے بے حد نالاں تھے۔ میں صبح سویرے ایک ضخیم سی کتاب لے جاتا اور شام ہونے سے پیشتر ہی واپس کر جاتا۔ ظاہر ہے ایک روز کا کرایہ صرف ایک آنہ بنتا جب کہ وہی کتاب عام حالات میں کم از کم آٹھ دس گنا زیادہ رقم کی وصولی کا سبب بنتی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے دور سے دیکھ کر ہی وہ انکار میں سر ہلا دیتے کہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے۔ میں ان کے تمام تر ذخیرے یہاں تک کہ ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی، تیرتھ رام فیروز پوری اور ابن صفی کی کتابیں بھی چاٹ چکا تھا۔ اس بلاتفریق مطالعے کے دوران میں مجھے ان مصنفوں تک بھی رسائی حاصل ہوگئی جو میرے ادبی مستقبل پر اثر انداز ہوئے۔ بلونت، بیدی، کرشن، منٹو، قاسمی اور شفیق الرحمٰن۔ پھر میں انگلستان چلا گیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک سگریٹ فیکٹری میں بڑے بڑے کارٹن اٹھاتے ہوئے جانے ایک روز کیا ہوا کہ شفیق الرحمٰن کی ''برساتی'' ایک فلم کی طرح میرے سامنے حرکت کرنے لگی۔ ''برساتی'' ایک سفر نامہ ہے جس نے نوعمری کے اوائل میں میرے اندر چھپے ہوئے آوارہ گرد کو تھپکی دی اور میرے بدن میں دیوانگیٔ سیاحت کا پہلا کانٹا چبھویا۔ اس روز میں گھر واپس آیا اور شفیق الرحمٰن کو ایک مخصوص قسم کا احمقانہ فین لیٹر لکھ دیا۔ چند روز بعد مجھے ایک ایسا خوشبودار اور زنانہ ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا لفافہ ملا جسے دیکھ کر میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ قیامت کر دی۔ خط کھولا، وہ لڑکی جو ہم ہمیشہ پیچھے چھوڑ آتے ہیں، اس کا نہ تھا۔۔۔شفیق الرحمٰن کا تھا۔ ''یونان صرف موسمِ بہار میں جاؤ، پھولوں سے اٹا ہوگا۔ سوئٹزر لینڈ موسم گرما میں خوشگوار ہوتا ہے اور اطالیہ۔۔۔کسی بھی موسم میں چلے جاؤ۔'' وہ ان دنوں شاید لیفٹیننٹ کرنل یا میجر تھے۔ اس پہلے فین لیٹر کو لکھے ہوئے آج شاید اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔

ایئر فورس کے کیڈٹوں، باریش مولانا، طالب علموں اور بچوں سے پرے فٹ پاتھ کے دوسرے کنارے پر جو لمبا تڑنگا، خوش لباس گورا سا شخص کتابیں دیکھ رہا تھا، شفیق الرحمٰن تھا مگر آج میرے سیاہ بالوں میں چاندی کے تار چمک رہے تھے اور میں نے بھی ادب کے سمندر میں پھنکارتے بڑے بڑے جہازوں کے درمیان کاغذ سے چند کشتیاں تخلیق کر کے ڈال دی تھیں اپنی کتابوں

کی صورت میں اور شفیق الرحمٰن وہ بیچارے اب بھی میجر ہیں مگر ایک فرق کے ساتھ کہ اس کے بعد جنرل کا ہیبت ناک اضافہ بھی ہو چکا ہے۔

''یہ خود فریبی کی نیلی جھیلیں اور دوسرے کنارے عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہم زندگی بھر اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ یقین دلانے کی کوشش میں کہ جو چیز یہاں نہیں ہے وہ وہاں ہے۔۔۔ دوسرے کنارے کے متعلق تم نے کیسے سہانے خیالات دل میں بسا رکھے ہیں۔ میں وہاں کئی مرتبہ گیا ہوں۔ وہ کنارہ بالکل ویران ہے۔ اس کنارے سے کہیں برا ہے، میری مانو تو تم کبھی اس طرف مت جانا ورنہ تمہیں افسوس ہوگا۔ دوسرا کنارہ بس دور سے ہی اچھا لگتا ہے۔''

میرا بھی یہی خیال تھا کہ دوسرا کنارہ بس دور سے ہی اچھا لگتا ہے مگر آج میں شفیق الرحمٰن سے پہلی مرتبہ ملا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کنارے پر کھڑا یہ شخص نزدیک آ کر بھی اتنا ہی سحرانگیز ہے۔۔۔ صرف مجھے اس کے جنرل ہونے پر اعتراض ہے۔ اسے میں توپ قسم کا جنرل بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ آرٹلری (توپ خانے) کے نہیں میڈیکل کے جنرل ہیں اور آپ جانتے ہیں اگر کسی ناتواں قریب المرگ مریض کو یہ کہہ دیا جائے کہ اب جنرل صاحب تمہاری خبر لیں گے تو وہ بیچارہ تو مارے دہشت کے صرف فوت ہی ہو سکتا ہے نا! ادھر پاکستان آرمی میں مزاح نگاروں کی اتنی وافر تعداد دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کاکول اکیڈمی میں اُن دنوں چارلی چیپلن انسٹرکٹر لگا ہوگا۔

آخر آپ جنرل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خاں، میجر ضمیر جعفری اور کرنل صدیق سالک کو کس کھاتے میں ڈالیں گے؟

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا شفیق صاحب چند رسالے تھامے میری جانب آ رہے تھے۔

''بھئی لاہور پہنچتے ہی یہ کتاب محمد خالد اختر کو دے دیجیے گا۔ وہ اسٹیونسن کے بارے میں بے حد جذباتی ہیں، اس کی شاعری کا مجموعہ ہے۔'' انہوں نے ایک سرخ جلد والی بوسیدہ کتاب مجھے دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کتاب کھول کر ایک نگاہ ڈالی۔

''میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو
اتنا امیر اور طاقتور بن جاؤں گا کہ
پھر کسی کو میرے کھلونے چھیننے کی جرأت نہ ہوگی۔''

''اور یہ آپ کے لیے ہے۔'' اُن کے تن سازوں ایسے مضبوط چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''قابوس نامہ ہے۔۔۔ ایک ایرانی شہنشاہ نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو دنیاوی قباحتوں سے بچنے کے آداب بتائے ہیں۔۔۔''

''بہت دیر ہو چکی'' میں نے کتاب وصول کر کے جیب میں اڑس لی۔

شفیق الرحمٰن کا معمول ہے کہ وہ ہر اتوار کی دوپہر پنڈی کی مال کے قریب فٹ پاتھ پر بکھری سیکنڈ ہینڈ کتابوں میں گم گزرتے ہیں۔ میرے جیسا بدذوق انسان یوں قابو آ گیا تھا کہ اپنے پنجابی ناول ''پکھیرو'' کی افتتاحی تقریب کے سلسلے میں پنڈی آنا پڑا۔ وہاں پنڈی کلب آنا ہوا جہاں شفیق الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے دیکھتے ہی حکم دے دیا کہ تم اتوار کا دن میرے ساتھ گزارو گے۔ یہ کچھ ایسے ہی تھا جیسے کوئی مس یونیورس آپ کو حکم دے دے کہ تم آج کی شب میرے ساتھ بسر کرو گے۔۔۔

''اگر آپ فارغ ہو گئے ہیں تو واپس گھر چلیں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''میں مصروف ہی کب ہوا تھا؟''

انہوں نے اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا جو حسب معمول نہایت غیر پیشہ وارانہ انداز میں کار چلاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔

شفیق صاحب کا گھر بھی اُن کی کہانیوں ایسا ہے۔ خوبصورت پلاٹ، شگفتہ اور نکھرے نکھرے کمرے۔ نفیس سجاوٹ۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کی تعمیر کے دوران شفیق صاحب معماروں کو اپنی کہانیاں سناتے رہے اور ان بھلے لوگوں نے مسحور ہو کر اینٹ اور سیمنٹ کی بجائے انہی کی تخلیقات سے تعمیر کر دی۔

''دوپہر کے کھانے کے لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تو میز پر سجی خوراک دیکھ کر میں بقیہ مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔

''بسم اللہ کیجیے۔'' شفیق صاحب نے دہی کا ایک پورا کونڈا میرے طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' میں بے ہوش ہوتے ہوئے بچا۔

''بہت مفید چیز ہے'' انہوں نے تقریباً دو سیر دہی میری پلیٹ میں انڈیلتے ہوئے اطلاع کی۔

پھر اطالوی سویوں کا ایک انبار آ گے آیا۔ اُبلی ہوئی سبزیوں کا ایک ڈھیر، مٹر قیمہ تو خاصے رقبے میں پھیلا ہوا، حلیم بھی تھی، دیگ میں تو نہ تھی بہرحال دیگچے میں کہہ لیجیے۔۔۔ سویٹ ڈش اور آخر میں پھلوں کا ایک باغ۔ روایت ہے کہ قدیم چین میں ایک شاہی دعوت کے دوران میں ایک مہمان خوراک کی کمی کے باعث انتقال کر گیا۔ تب سے چینیوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مہمان کو کم از کم بھوکے سے تو مرنے نہیں دیں گے۔ شفیق صاحب کے آباؤاجداد میں بھی شاید اسی قسم کا کوئی سانحہ ظہور پذیر ہوا تھا۔

کھانا ختم ہوا بلکہ ختم کروایا گیا تو میں تقریباً اونگھ رہا تھا۔ میں نے ایک نہایت احمقانہ مسکراہٹ لبوں پر سجا لی اور مجھے اس کے لیے زیادہ کوشش نہ کرنی پڑی اور پھر آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے جتن کرنے لگا۔

''آیئے ٹیرس پر بیٹھتے ہیں، کافی وہیں آ جائے گی۔''

ٹیرس پر بیٹھے ہوئے جو چیزیں دیکھنے کو ملیں ان سے نشہ دوآتشہ ہو گیا۔ شفیق صاحب کے دریائی سفرناموں دجلہ، فرات، ڈینیوب اور نیل کے

مسوّدے۔اُن کی تازہ کہانی ''دھند'' کا ڈرافٹ اور پھر وہ پرانی تصویری البم جس کے ہر صفحے پر شفیق الرحمٰن کے لازوال کردار کھلے ہوئے تھے۔

''یہ رونی ہے،شیطان۔شاید آپ جانتے ہوں؟'' انہوں نے ایک دبلے سے لڑکے کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔اس کی آنکھوں سے جیسے شرارت ابل رہی تھی۔''ان دنوں ولایت میں ہے۔''

ایک سرخ بالوں والی یورپی لڑکی بے حد اداسی سے کیمرے کو تک رہی تھی۔

''اس کا نام این ہے۔سکاٹ لینڈ کی۔۔۔''

''برساتی والی این؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

شفیق صرف مسکراتے رہے۔

''جس نے آپ کے سر پر بطخ رکھ دی تھی۔جو آپ کو نیو کاسل تک کار میں چھوڑنے آئی تھی۔۔۔جو آپ کو بے پناہ۔۔۔''

اس سے پیشتر کہ میری حالت مزید غیر ہوتی،انہوں نے صفحہ پلٹ دیا۔ایک خوش شکل اور سمارٹ سا نوجوان ساحل پر لیٹا ریت سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔

''یہ صاحب کون ہیں؟''

''محمد خالد اختر۔'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''جی نہیں۔'' میں نے زور زور سے سر ہلایا۔

''کیوں؟'' وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

''آپ کا مطلب محمد خالد اختر ہی ہے نا،اپنے خالد صاحب،عود پاک،سواتی اور کاغانی مہم،تذکرہ اہلِ لاہور والے۔۔۔''

شفیق صاحب ہنسنے لگے۔''بھئی اُن دنوں خالد جوانِ رعنا تھا، نہایت حسین،ہم دونوں لاہور میں پڑھتے تھے اور ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ہر اتوار کو ہم پیدل مارچ کرتے ہوئے دریائے راوی پر جاتے،بوٹنگ کرتے،پھر مقبرہ جہانگیر میں گھومتے۔۔۔پھر۔۔۔بہر حال رات گئے واپس ہوسٹل لوٹتے۔''

میں حیرت سے اُن دنوں کے محمد خالد اختر کو دیکھا کیا۔وقت! وقت! وقت! پھر بادلوں کی تصاویر کا ایک سلسلہ سامنے آیا۔ساون کے بادل، پانی سے بوجھل،بوجھ سے خالی ہلکے ہلکے بادل،صحرا پر اُمڈے ہوئے،ویرانے میں چمکتے،آبادیوں پر سایہ کیے ہوئے بادل!

ایک صفحے پر شفیق الرحمٰن کی جوانی کی تصاویر تھیں۔کرکٹ کھیلتے ہوئے،سوئمنگ پول میں،بال بکھرائے۔۔۔اپنی کہانیوں کے ہیرو کی طرح۔ قصر الحمرا کے جھروکوں میں اور مسجد قرطبہ کے صحن میں۔

ساتھ والے کمرے کے کھلے دروازے میں سے سانتانہ یا سپیریمز قسم کی موسیقی دھما دھم برآمد ہو رہی تھی،انہوں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ ہوا سے کھل گیا۔۔۔دھما دھم۔۔۔وہ پھر اٹھے اور دروازہ بند کر دیا۔

تیسری مرتبہ ان کا خوبرو بیٹا باہر آ گیا۔''کیا بات ہے ابو؟''

''بیٹے موسیقی۔۔۔''

بیٹے نے پوری بات سنے بغیر اندر جا کر جلدی سے ٹیپ بند کر دیا۔

شفیق صاحب پھر اٹھے۔''بیٹا موسیقی ضرور بجاؤ۔۔۔ٹیپ آن کر دو فوراً۔۔۔صرف دروازہ بند رکھو،شاباش۔ان کے لہجے میں دوستی اور اپنائیت تھی۔اُن کی اپنی تحریروں کے بزرگوں سے بالکل جدا،جو بات بے بات پر نئی نسل کو کوستے ہیں اور یوں اُن کی قدرتی نشوونما میں حائل ہوتے ہیں۔

باہر شام ہو رہی تھی۔میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔لاہور کے لیے آخری گاڑی پندرہ منٹ میں چھوٹتی تھی۔

وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئے۔کار گیٹ سے باہر نکلی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا،ان کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ایک چھ فٹ کے لمبے تڑنگے خوبصورت گورے سے لڑکے آپ ہی ہیں؟

''دنیا کا گوشہ گوشہ نقشے میں موجود ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں ایک ایسا جزیرہ ضرور ہے جس میں انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا۔اس جزیرے میں ایسے ایسے رنگ ہیں جو انسانی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھے۔ طرح طرح کے خوشنما پرندے ہیں جن کے چہچہوں میں ایسی موسیقی ہے جس سے انسان نا آشنا ہے۔اس کا کونہ کونہ پراسرار اور مسحور ہے۔۔۔وہ جزیرہ اس سیاح کا منتظر ہے جو کسی دن کشتی لے کر چپکے سے آ جائے گا۔''

شفیق الرحمٰن اس منتظر جزیرے میں چپکے سے کشتی لے کر چلا گیا اور پھر اس نے اپنی تحریروں میں وہ تمام رنگ بکھیر دیئے جو انسانی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھے۔کہانیوں کے پس منظر میں خوشنما پرندوں کے چہچانے کی موسیقی ابلتی ہے اور وہ اس جزیرے کے تمام اسرار،سارے سحر بیان کرتا چلا جاتا ہے۔یہاں تک کہ ہم سب بھی مسحور ہو جاتے ہیں۔

''ہزاروں خواہشیں''

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں نسوانی کرداروں کی بھرمار ہے،مصنف کی جانب ان کا التفات اور قلبی وابستگی کے قصے بھی پے در پے موجود ہیں،بقول مشتاق احمد یوسفی:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ ''گھر اجڑے''

فاروق اقدس

(راولپنڈی)

براہِ راست

اردو ادب بالخصوص وطنِ عزیز میں کتب بینی کا چلن تیزی سے مفقود ہو رہا ہے۔ اس قحط سالی کی بے شمار وجوہات کے علاوہ ایک اہم سبب کتاب کی خریداری سے قاری کا گریز بھی ہے۔ ہماری خوش قسمتی کے جناب **مستنصر حسین تارڑ** ذوق شوق سے پڑھے بھی جاتے ہیں اور اُن کی کتابیں ہاتھوں ہاتھوں فروخت بھی ہوتی ہیں بلکہ بہت سی کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود قاری کی تلاش کا سفر ختم نہیں ہوتا۔

ادارہ چہارسو اس حوالے سے خوش قسمتی کا حامل ہے کہ آج کی نشست میں پاکستان کے نامور، باغ و بہار بلکہ صدا بہار تخلیق کار **مستنصر حسین تارڑ** صاحب رونق افروز ہیں۔ اس خوبصورت محفل کی آراستگی میں نامور ادیبہ محترمہ عذرا اصغر اور اُن کی لائق صاحبزادی عزیزہ شبہ طراز اگر ہمارے قدم کے ساتھ قدم اور آواز کے ساتھ اپنی آواز شامل نہ کرتیں تو ہمارے لیے اس خوبصورت محفل کا انعقاد اس قدر آسان نہ ہوتا جس قدر اُن کے تعاون نے بنا دیا۔

وقت اور موقع کی مناسبت سے ہم محترم **مستنصر حسین تارڑ** صاحب، عذرا اصغر صاحبہ اور عزیزہ شبہ طراز کی خدمت میں اظہارِ سپاس پیش کرنا فرضِ اولین گردانتے ہوئے مستقبل کے حوالے سے نیک توقعات کا اظہار بھی لازمی خیال کرتے ہیں!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کا تخلیقی جوہر وراثت ہے، عطیہ خداوندی یا محنت ولگن کا ثمر؟

☆☆ آپ کے سوال کا جواب کسوٹی کے انداز میں دیا جائے تو جواب ہاں میں ہے وہ اس طرح کہ میرے دادا کاشت کاری سے وابستہ تھے اور انہوں نے سکول کا منہ تک نہ دیکھا تھا البتہ میرے والد صاحب پورے گاؤں میں میٹرک پاس کرنے والے پہلے فرد تھے اور انہوں نے زراعت پر بیس پچیس کتب اردو میں تحریر کی تھیں اور اسی موضوع پر ایک رسالہ بھی نکالتے تھے اس کے علاوہ ہمارے گھر اردو کے دیگر جرائد بھی آتے تھے سو اس طرح مجھے لکھنے کا شوق اور للک پیدا ہوئی۔ ہر چند میرے ساتھ گورنمنٹ کالج میں کچھ ایسے طلبہ بھی تھے جو بعد میں بڑے ادیب بنے مگر میں اس کو وراثت کے بجائے عطیہ خداوندی، محنت اور لگن کا ثمر کہوں تو غلط نہ ہوگا۔

☆ کچھ یاد پڑتا ہے ابتدا کب اور کس طور ہوئی تھی؟

☆☆ میں کوئی منصوبہ بند ادیب نہیں ہوں میرا شمار تو اُس تنکے کی مانند ہے جو پانی کے بہاؤ پر اس کی مرضی کے مطابق تیرتا رہتا ہے۔ کوئی ۱۹۶۰ء دہائی کے اوائل ایام سے مجھے آنہ لائبریری سے کتابیں پڑھنے کی ایسی لت پڑی کہ میں نے دسویں جماعت تک آتے آتے نسیم حجازی، ایم اسلم، منشی تیرتھ رام اور بے شمار ادیب پڑھ ڈالے۔ میری رفتار اس قدر زیادہ تھی کہ جو لوگ ایک کتاب ہفتہ دس دن میں ختم کرتے تھے میں ایک دن میں ہی ختم کر لیا کرتا تھا لہٰذا لائبریری والے صاحب میری شکل دیکھ کر دُور سے ہی انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتے تھے کہ کوئی نئی کتاب نہیں آئی۔ ۱۹۶۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا وہاں مجھے علم ہوا کہ سوویت یونین میں ایک لٹریری کانفرنس ہو رہی ہے سو میں نے بھی اپنا نام ارسال کر دیا۔ جواب میں منتظمین نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کو کونسی زبان آتی ہے تو میں نے اردو، انگریزی، پنجابی، بلوچی سمیت کوئی سات آٹھ زبانیں لکھ کر بھیج دیں۔ وہ لوگ یہ پڑھ کر بہت مرعوب ہوئے اور انہوں نے فوری طور پر مجھے دعوت نامہ بھیج دیا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو میں پہلا پاکستانی تھا جو بطور ادیب روس کی کانفرنس میں شریک ہوا۔ واپسی پر نوائے وقت کے ایڈیٹر جناب مجید نظامی کے اسرار پر میں نے پہلا سفرنامہ ''لندن سے ماسکو'' تحریر کیا اور وہ رسالہ ''قندیل'' میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد والد صاحب کا اسرار بڑھا کہ تم واپس آ جاؤ کیونکہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ساتھ میری گرل فرینڈ بھی تھی اور میں اُس کے ساتھ شادی بھی کرنا چاہتا تھا مگر میرے لیے والد صاحب زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ میں پہلا پاکستانی ہوں جس نے لوگوں سے لفٹ لے کر ۱۹۶۹ء میں انیس ممالک کا سفر کیا اور اپنا پہلا باقاعدہ سفرنامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' شائع کیا۔ اس کے بعد لوگوں نے مجھ سے اکثر دریافت کیا کہ آپ افسانہ نگار ہیں،

ناول نگار ہیں یا سفر نامہ نگار ہیں تو میرا جواب یہ ہوتا کہ میں ایک آوارہ گرد ہوں۔اس کے بعد میرے سفرنامے ''نکلے تیری تلاش میں'' کا ایک باب ماسکو یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں شامل کیا بلکہ مستقل طور پر میری تحریریں ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہیں۔گزشتہ دنوں ماسکو یونیورسٹی نے مجھے خصوصی طور پر لیکچرز کے لیے بھی مدعو کیا تھا۔

☆ پہلے آپ کے ڈراموں کی دھوم تھی پھر سفرناموں کا چرچا ہونے لگا اوراب ناول آپ کی شناخت ٹھہرا۔اس عرصے میں افسانے کا ذکر نہ ہونے کے برابر رہ گیا؟

☆☆ قریب پچیس سال پہلے میرے افسانے تواتر سے شائع ہوتے تھے۔ میرے کئی افسانوں پر بمبئی والے گلزار صاحب نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اُن پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر میں ناول نگار ہوں اس لیے میری مختصر کہانیاں بھی اکثر طویل ہو جاتی ہیں۔شاید آپ کو علم ہو کہ ادب میں میرے واحد دوست عبداللہ حسین ہیں اُن سے بھی میں نے بارہا اس بات کا ذکر کیا ہے کہ میں جب کہانی لکھتا ہوں تو اُس کا پھیلاؤ زیادہ ہو جاتا ہے جواب میں عبداللہ حسین بولے اسی صورت حال کا مجھے بھی سامنا ہے۔شاید ہم لوگ مختصر کہانی کو سوٹ نہیں کرتے۔ بہر حال میں نے گذشتہ دنوں کوئی ڈیڑھ سال لگا کر چودہ کہانیاں لکھی ہیں اوراس کا مجموعہ جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے ابھی اس کا کوئی عنوان میرے ذہن میں نہیں آیا۔

☆ اچھا یہ فرمایئے آپ افسانہ، ڈرامہ، ناول،سفر نامہ، کالم نگاری کی درجہ بندی کس طرح کرنا پسند کریں گے نیز آپ کی تسکین کا بہترین ذریعہ کیا ہے؟

☆☆ شکر کیجیے یہ سوال آپ ایک تخلیق کار سے اُس کی معنوی اولاد سے متعلق کر رہے ہیں اگر کسی سے آپ اُس کی ذاتی اولاد کے بارے یہ سوال کر بیٹھیں تو وہ کم از کم آپ کے گلے تو پڑ ہی جائے گا۔تو جناب اس سوال کے جواب میں یہی کہوں گا کہ جو میرا کام ہے وہ مجھے کرنے دیجیے اور کام قاری اور نقاد کے کرنے کے ہیں وہ بہتر طریق پر کر رہے ہیں۔

☆ موقع کی مناسبت سے کچھ باتیں آپ کی اداکاری اور میزبانی کے حوالے سے بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں؟

☆☆ پچھلے دنوں کی بات ہے ایک خاتون میراانٹرویو کرنے آئیں۔زور ان کا اس بات پر تھا کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتلاؤں۔ میں نے کہا کہ بی بی میری عمر پچھتر برس ہو چکی ہے تفصیل بتلانے کے لیے پچھتر برس ہی درکار ہوں گے۔سو جناب پاکستان ٹیلی وژن پر چارسو سے زیادہ ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کیے۔سبھی نامور لکھنے والوں اور پرفارم کرنے والوں سے بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کے مواقع ملے۔صبح کی نشریات کے آغاز کا کریڈٹ بھی مجھے جاتا ہے۔الیکشن کی نشریات تو اس قدر زیادہ کیں کہ لوگ مجھے مسٹر الیکشن کے نام سے بلانے لگے تھے۔اور کافی نامور گلوکاروں کے ساتھ بھی کمپیئرنگ کی اور مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا وہ بطور ٹی وی اینکر کے دیا گیا۔ میں اور طارق عزیز ایسے اینکرز ہیں جنہیں اس حوالے سے پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔

☆ آپ کی تخلیقی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کرنے والے اگر درست ہیں تو اس کا جواز جاننا بھی غلط نہ ہوگا؟

☆☆ میں آپ کا سوال سمجھ نہیں پایا کہ کون لوگ اور کیوں میرے فنی سفر کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں اگر مراد سفرنامہ اور ناول کی ہے پھر بھی سوال اگر واضح ہوتا تو جواب دینے میں آسانی ہوتی۔

☆ کچھ لوگ آپ کے تخلیقی کام کو میٹا فکشن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ **JOHN BARTHS** کے خیال میں میٹا فکشن کی تعریف یہ ہے کہ ''ایسا ناول جو کسی دوسرے ناول کی تقلید و نقل ہو نہ کہ حقیقی دنیا کی'' آپ کے ناولوں کا مزاج کس امر کی نشان دہی کرتا ہے؟

☆☆ ہر چند آپ کا سوال پیچیدگی کا حامل ہے مگر مجھے جواب میں یہ کہنے میں قطعاً کوئی عذر نہیں کہ جتنا ادب ہے وہ سب کسی نہ کسی شکل میں نقل ہے۔ہم اپنے سے پہلے والوں کو جتنا پڑھیں گے اتنے ہی ان کے اثرات ہماری تحریروں میں نمایاں ہوں گے۔ میں نے بے شمار ملکی و غیر ملکی اہل قلم کو پڑھا ہے۔کافکا اور کامیو کے علاوہ اور بھی کئی ادیبوں کے میری شخصیت پر اثرات واضح ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میری تخلیقات کسی ادیب کی نقل یا چربہ ہیں۔ کہنے والے تو قرۃ العین حیدر پر بھی ورجینا اولف کے اثرات کا ذکر کرتے ہیں مگر میں اتنا بُرا لکھتا ہوں کہ وہ کسی کی نقل ہو ہی نہیں سکتا۔اب غالب کو ہی لے لیجیے وہ بیدل کی نسل ہیں پورے پورے مصرعے مستعار لیے ہیں اُن پر تو کوئی اعتراض نہیں کرتا۔اب بابا بلھے شاہ کی مشہور ترین کافی ''کیہ جاناں میں کون'' مولانا روم کی ہے بابا جی نے تو اس کا صرف پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔تو یہ لین دین کا جو سلسلہ ہے بڑے لوگوں کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے پہلے سفرنامے ''نکلے تیری تلاش میں'' کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر آپ نے پن پوائنٹ کرنا ہی ہے تو اس کی ماں کا نام بر ساتی ہے جو شفیق الرحمٰن ہیں۔

☆ آپ کی تخلیقی بصیرت کو فریدالدین عطار کی فارسی نظم ''منطق الطیر'' سے مستعار گردانے کا سبب کیا ہے؟

☆☆ دیکھئے جی سبب تو میں کوئی نہیں بتلا سکتا مختلف لوگوں پر مختلف چیزیں اثر کرتی ہیں۔ مجھ پر بھی ہوا، پانی اور پرندوں کے برتاؤ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ پرندے مجھے پسند ہیں لیکن وہ پرندے جو سچ کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ میرے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کے قریب ساٹھ صفحات اس موضوع پر تحریر ہوئے ہیں۔جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں منطق الطیر سے متاثر کیوں ہوں۔

☆ کرنل محمد خان کی اس رائے میں کس قدر حقیقت ہے کہ سفرنامہ لوگ اس لیے لکھتے ہیں کہ اس میں کھُل کھیلنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں؟

☆☆ یہ سوال آپ نے میری کتاب ''اندلس میں اجنبی'' کے دیباچے سے لیا ہے جو کرنل محمد خان کا تحریر کردہ ہے۔اور یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ کرنل صاحب کا تحریر کردہ واحد دیباچہ ہے جو انہوں نے کسی کے لیے تحریر کیا اور میرے لیے یہ کسی بھی بڑے سے بڑے اعزاز سے زیادہ اہم اور عزیز ہے۔اب جہاں تک سوال کھُل کھیلنے کا ہے تو یہ مواقع اُن لوگوں کے لیے تو سُود مند ہوں گے جنہیں کھُل کھیلنے کا موقع نہ ملا ہو۔میں پہلے ہی کھُل بھی چکا تھا اور کھیل بھی چکا تھا۔ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ ہاتھ مزید رواں ہو گیا تو اور بات ہے۔

☆ ایک سفر نامہ جغرافیائی ،ایک موسم اور ماحول کی نمائندگی کا حامل ایک تہذیب وتمدن کی ترجمانی اور ایک تاریخی بیان لئے ہوتا ہے۔آپ کے سفرنامے کس مزاج کی نمائندگی کے حامل ہیں؟

☆☆ اگر میں آپ کے سوال کا جواب ٹیلی وژن کی میزبانی کے پس منظر میں دوں کہ میزبان موقع کی مناسبت سے جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے احساسات ہوتے ہیں۔تو ایک مصنف بھی جو تحریر کرتا ہے وہ تمام دکھ،سکھ اور آلام جو اس پر گزرے ہیں وہ اپنے انداز میں بیان کرتا ہے۔مثلاً میں نے جیو ٹی وی سے ایک پروگرام ''شادی آن لائن'' کیا۔وہ قریب آٹھ سال چلا۔میں نے اپنے طور پر آہستہ آہستہ اُس پروگرام کو ادبی رنگ دے دیا۔سو تحریر جو ہوتی ہے وہ لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔اب آپ گانے کو دیکھئے گانا اہم نہیں ہوتا اُسے گانے والا اہم ہوتا ہے مثلاً ایک غزل اختر بائی فیض آبادی نے اگر گائی ہے تو وہ شاہکار ہوگی اور اگر کوئی مجھ جیسا اناڑی اُس پر ہاتھ صاف کرے گا تو آپ جانتے ہیں اُس غزل کا کیا حشر ہوگا۔

☆ اس رائے میں کس حد تک حقیقت پائی جاتی ہے کہ آپ نے ادبی حیثیت منوانے کے لیے سفرناموں سے زیادہ ناول پر توجہ مرکوز کی؟

☆☆ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں خود کو منوانے کے لیے نہیں لکھتا۔بھئی میرا کام تو تماشا دکھانا ہے سو میں تخلیقی اظہار کر کے تماشہ دیکھا کر مطمئن ہو جاتا ہوں۔مجھے اس سے غرض نہیں کہ کون مجھے مانتا ہے اور کون نہیں مانتا۔قصہ کچھ یوں ہے کہ اپنے منہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میری ساٹھ کتابیں ہو گئیں اور فروخت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ایک دور ایسا آیا کہ ''ڈان'' جیسے اخبار نے مجھے سفرنامے کا ''باوا آدم'' کا خطاب دے ڈالا۔حالانکہ اُس سے پہلے میرے کئی ناول اور کہانیاں منظر عام پر آ چکی تھیں۔اب چونکہ بڑھتی ہوئی عمر اور شاید مطالعہ اور مشاہدہ یکجا ہو کر ''بہاؤ'' کی شکل میں آئے تو لوگوں نے اس کو زیادہ سراہا مگر جو کچھ بھی ہوا یہ از خود ہوا کسی منصوبہ بندی یا پلاننگ کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

☆ آپ کے سفرناموں کی فضا کو لوگ اُداس یا نیم اُداس بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ دراصل میرے اندر کی فضا سوگوار ہے۔آپ کو میرے ناول میں اکثر موت کا ذکر ملتا ہے،جس سے قاری کو فضا سوگوار نظر آتی ہے لیکن میں موت کو مثبت انداز میں لیتا ہوں۔میرے خیال میں کائنات کا حُسن جو ہے وہ موت کا مرہون منت ہے۔میرا ایک ناول ''یک سرائے'' ہے جس میں موت ایک مستقل کردار کے طور پر دکھائی گئی ہے۔میں نے اسے مرد کردار دکھایا ہے میں اُسے کہتا ہوں کہ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔نہ یہاں کوئی گھاٹی ہے نہ دراڑ نہ دریا،آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ میں اس جگہ کو تمہارے لیے خوبصورت بنانے آیا ہوں۔آج سے پانچ سو یا ہزار سال بعد میں نہیں ہوں گا تو یہ دریا،یہ پہاڑ،یہ ٹیلے اسی طرح لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوں گے۔چنانچہ فنا کا جو احساس ہے وہ چیزوں کو خوبصورت بناتی ہے۔میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بڑا ادب ہمیشہ سوگوار ہوتا ہے۔اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیجیے کہ میں خود کو بڑا ادیب یا اپنے کام کو بڑا ادب گردان رہا ہوں۔کوئی بھی ماسٹر پیس پڑھنے کے بعد آپ دنوں ،ہفتوں اُس کے سحر میں گرفتار رہتے ہیں جس میں خاص طرح کی اُداسی ہوتی ہے۔میں بے شمار مثالیں اس ضمن میں دے سکتا ہوں مگر طوالت کے خوف سے اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ کرداروں کے برتاؤ میں آپ بڑے من موجی واقع ہوئے ہیں۔جب جی چاہتا ہے جس کردار کو بلا لیتے ہیں جیسے فاطمہ کو لندن اور بھارت سے یوں برآمد کر لیا جیسے کاموںنکے یا سادھو کے سے بلایا ہو؟

☆☆ تخلیق کار جو ہوتا ہے چاہے وہ میوزیشن ہو،مصور ہو یا فکشن رائٹر ہو ایک طرح سے اپنی تخلیق کا نا خدا ہوتا ہے۔اُس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو جب چاہے جہاں چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جو کردار بلایا گیا ہے کہانی یا سیکونس اُس کے بغیر مکمل ہوتا ہے یا نہیں۔

☆ آپ کے کرداروں کی اکثریت پاکستانی معاشرے کی نمائندگی کرنے کے بجائے کثیر الثقافتی مزاج کی حامل کیوں ہوتی ہے؟

☆☆ سب سے پہلا جواز تو گلوبل ویلیج کا ہی بنتا ہے اُس کے بعد جواز یہ ہے کہ میں گھوما پھرا بہت ہوں۔میرے پاس باہر کے کردار ہیں جب میں نے ''پیار کا پہلا شہر'' اور ''جپسی'' تحریر کیے تو لوگ باگ کہنے لگے یہ تو اسپین کا پس منظر ہے تو سمرکند موم نے برٹش پس منظر کی کہانیاں کم لکھی ہیں ملایا،سنگاپور کے پس منظر میں زیادہ لکھی ہیں مثلاً ہیونگ وے نے امریکہ کے پس منظر میں ایک ناول لکھا ہے۔باقی تمام کام دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے ہم تو بس قدیم آبادیوں کے گلی محلے اور ساس بہوؤں کے جھگڑوں تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔میرے ناولوں میں پاکستانی معاشرت کی موجودگی کا اندازہ عبداللہ حسین کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے کہ

مستنصر حسین تارڑ پاکستانی معاشرت کا بائیوگرافر ہے۔

☆ لاہور شہر کو بھی آپ کے ہاں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہر پھر کر آپ کے کردار لاہور کا رُخ ضرور کرتے ہیں؟

☆☆ جو شخص جس چیز کے بارے میں معلومات رکھتا ہے یا جس سے جذباتی لگاؤ ہے وہ اُسی کا ذکر کرے گا۔ یہ الزام تو آپ قرۃ العین حیدر پر بھی لگا سکتے ہیں کہ اُن کے ہاں لکھنؤ چھایا ہوا ہے۔ انتظار صاحب کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر پھر کے دیومالائی پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ عینی آپا لاہور آئیں تو میں اُنہیں پرانے لاہور کی گلیوں کی سیر کرانے لے گیا۔ جنہیں دیکھ کر وہ بولیں ''یہ تو ہو بہو لکھنؤ ہے'' میں نے کہا ایک فرق ہے آپا ''لکھنؤ مر چکا ہے جبکہ لاہور ابھی زندہ ہے'' ایک اعتراض یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ لاہور کے تمام بڑے ادیب اور فنکار کہیں اور سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ تو اس کی بابت منیر نیازی کا جواب قابلِ توجہ ہے کہ جب تک لاہور مہر نہیں لگاتا تب تک ادیب یا فنکار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ تو جو آپ کا ماحول ہے آپ اُسی کو پوٹرے کریں گے۔

☆ اردو ناول کو زندہ رکھنے کے لیے ناول کی جدید ٹیکنیک کو جاننا از حد ضروری ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ جدید ٹیکنیک پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اپنی تخلیقات میں اُس کے برتاؤ کی نسبت اظہار خیال فرمائیں؟

☆☆ یہ میرا کام نہیں ہے۔ نا میں پہلے سے سانچے بناتا ہوں نہ پیمانے۔ تخلیق کی ضرورت کے مطابق سب کچھ خود بخود ڈھوتا جاتا ہے۔ اب یہ کام ناقدین کا ہے کہ وہ اس بات کا پتہ لگائیں کہ آیا میرے ناولوں میں کوئی ٹیکنیک ہے بھی یا نہیں پھر اُس کے بعد جدید اور قدیم کا فیصلہ ہوگا۔

☆ ناول کو سفر نامے کی نسبت بڑا کام کیوں گردانا جاتا ہے۔ آپ کے ناول اور سفر نامے بالمقابل ہوں تو کیا صورت بنتی ہے؟

☆☆ میں جو بھی تخلیقی کام کرتا ہوں پوری محنت، دیانتداری اور لگن سے کرتا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں کہ ناول کو اہمیت کیوں حاصل ہے یا اُسے بڑا کیوں گردانا جاتا ہے البتہ یہ بتلا سکتا ہوں کہ پوری دنیا میں ناول کو ادب کی پہچان مانا جاتا ہے۔ پاکستان میں نجانے ہم لوگ کیوں شاعری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ مثلاً ہم چائنہ گئے تو ہمارے شاعروں کو بڑی مایوسی ہوئی وہاں کے پندرہ بڑے اہلِ قلم ہمیں ملنے آئے تو وہ سب کے سب ناول نگار تھے۔ میں نے ''خس و خاشاک زمانے'' میں تحریر کیا ہے کہ ناول جو ہوتا ہے وہ قوموں کی زندگی کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۳۰ء میں پنجاب سے شروع ہو کر ۲۰۰۰ء کے قریب کینیڈا میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ ''وار اینڈ پیس'' میں نپولین کے زمانے کی جنگوں کا تمام احوال درج ہو گیا ہے۔

☆ سارتر کے کردار کی طرح ''خس و خاشاک زمانے'' کا کردار روشنی کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دینا اتفاق ہے یا استفادہ؟

☆☆ استفادہ میں نے ہر چیز سے کیا ہے۔ ظاہر ہے روشنی کی تلاش ہر روشن دماغ انسان کی جستجو ہونی چاہیے۔ میں نے بھی ''خس و خاشاک زمانے'' میں مشرقی پاکستان کے سانحہ کی راکھ کو کریدنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

☆ آپ کی نسبت ایک اختلافی رائے یہ بھی ہے کہ جس کثرت سے آپ سوالات اُٹھاتے ہیں، اُن کے جوابات اُس حساب سے نہیں دیئے جاتے؟

☆☆ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے بارے میں لوگ اختلافی رائے رکھتے ہیں۔ میرے دل میں اُن کے لیے بے حد احترام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ سوالات کے جوابات دینا میرا کام نہیں بلکہ یہ ذمہ قاری اور نقاد کا ہے اور وہ بحسن و خوبی اپنا فریضہ نبھا رہے ہیں۔

☆ اردو املا میں انگریزی کا بے مہابا استعمال بھی قابل گرفت گردانا جاتا ہے؟

☆☆ صحیح طور پر گردانا جاتا ہے۔ میں خود اسے غلط سمجھتا ہوں۔ آپ یہ دیکھئے کہ اگر ناول یا سفرنامے کا کردار ایچیسن یا کینیئرڈ کالج کا پڑھا ہوا ہے تو وہ اورینٹل کالج کی زبان نہیں بولے گا اور اس سے آپ اگر زبردستی یہ زبان بلوائیں گے تو وہ آپ کی زبان ہوگی کیریکٹر کی ہرگز نہیں۔

☆ مشرف عالم ذوقی فرماتے ہیں کہ تجربہ وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس مکالمہ نگاری کا فن نہیں ہوتا۔ اس رائے کی روشنی میں قاری یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ ناول صرف مکالمہ نگاری کا کمال ہوتا ہے؟

☆☆ مکالمہ لازمی چیز ہے وہ منظر کو زبان عطا کرتا ہے۔ وادیاں، چشمے اور کوہ و دمن اپنی تعریف خود نہیں کر سکتے جب تک تخلیق کار اپنے قلم سے اُنہیں زبان عطا نہ کرے۔ پرندہ چہچہا کر اپنے ہونے کا ثبوت فراہم نہیں کرے گا تو منظر میں جان کس طرح ڈلے گی۔ لہٰذا مکالمہ منظر نامے کو زبان دینے کے لیے لازمی شے ہے۔

☆ ذوقی صاحب کے بقول ''خس و خاشاک زمانے'' محترمہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' سے ٹیکنیکی اور تخلیقی طور پر ہر حال میں بہتر ناول ہے؟

☆☆ میں نے کبھی کسی طرح کا کوئی کلیم نہیں کیا۔ لوگ اپنے طور پر رائے قائم کرنے میں آزاد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں قرۃ العین ہوں یا دیگر سینئر اہلِ قلم وہ اپنے وقت کے بڑے لوگ تھے اور انہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں اور تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑا کام کیا۔ چونکہ میرا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے تو مجھے اُس کا ایڈوانٹیج بھی حاصل ہے اور ارتقائی ترقی کا بونس بھی مجھے ملنا چاہیے۔ اس حوالے سے میری تخلیقات کو کچھ لوگ بہتر کہہ رہے ہیں تو وہ غلطی پر نہیں ہیں۔ میں چھوٹے بڑے کی بات نہیں کر رہا میں صرف لوگوں کی رائے کی نسبت اظہارِ خیال کر رہا ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو بہتری کی طرف جانا چاہیے اور اپنے گرد و پیش کی صحیح صحیح عکاسی بھی کرنی چاہیے، جس کی میں نے پوری کوشش کی

ہے۔ بہرحال میں ذوقی صاحب کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور اُن کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا ہوں ۔ ایک طرح سے ذوقی صاحب نے میرے حق میں کانٹے بوے دیئے ہیں اب دیکھئے انہیں میں کب تک اور کس طرح چنتا ہوں۔

☆ یہ رائے کس حد تک مبنی بر حقیقت ہے کہ ''آگ کا دریا'' میں تاریخ کے ابتدائی دور کا جو خلا باقی رہ گیا تھا وہ آپ کے ناول ''بہاؤ'' نے پورا کر دیا ہے؟

☆☆ جی نہیں! میں ایسا ہر گز نہیں سمجھتا۔ انہوں نے اپنا کام کیا ہے اور میں نے اپنا۔ نا میں اُن کا خلا پُر کر رہا ہوں اور نا اُنہوں نے میرا خلا پُر کیا ہے۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اے حمید کی نسبت لاہور کے بیان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ الفاظ دیگر یہاں بھی آپ کو اے حمید پر فوقیت دی جا رہی ہے؟

☆☆ اے حمید میرے پسندیدہ قلمکار تھے انہوں نے لاہور کے حوالے سے ''ضربِ اسلام'' تحریر کر کے بڑا کام کیا ہے لیکن وہ بنیادی طور پر امرتسر کے تھے اس لیے اُن کی تخلیقات میں لاہور کی نسبت امرتسر زیادہ نمایاں ہے۔ چونکہ میرے ہاں لاہور کا ذکر زیادہ ہے اس لیے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میں نے لاہور کے بیان میں زیادہ دلکشی پیدا کی ہے۔

☆ منشا یاد مرحوم کی اس رائے کی بابت آپ کیا کہنا چاہیں گے کہ آپ کے ناول ''راکھ'' کے تمام کردار اصلی ہیں؟

☆☆ فکشن کے بارے میں ایک تصور عام ہے کہ '' Fiction is basically suspention of Disbelive'' یعنی بے یقینی کو تعطل میں ڈال دینا۔ آپ کہتے ہیں یہ کردار نہیں ہو سکتا مگر فکشن کی طاقت اُسے ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ''راکھ'' میں بے شمار کردار اخذ کیے گئے ہیں اگر اُن میں پانچ فیصد حقیقت ہے تو پچانوے فیصد میری محنت اور قلم کا ثمر۔ وہ حقیقت میں اس طرح ہیں کہ وہ کہیں نہ کہیں تھے۔ اب اگر ہم ''بہاؤ'' کے کرداروں کا ذکر کریں تو پانچ ہزار سال پہلے کے کردار اصلی کیونکر ہو سکتے ہیں مگر عبداللہ حسین کہتے ہیں کہ میں نے ''پاروشنی'' کا کردار اس قدر طاقتور بنا دیا ہے کہ وہ حقیقی لگتا ہے۔

☆ خالد فتح محمد کے بقول ''خس و خاشاک زمانے'' میں بعض کرداروں کو بڑھا چڑھا کر نہ دکھایا جاتا تو یہ ناول زندگی سے بڑا ناول ہو سکتا تھا؟

☆☆ خالد صاحب خود بھی بہت زبردست فکشن نگار ہیں ۔ انہوں نے میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے مگر آپ نے صرف ایک اختلافی جملے پر سوال کر ڈالا۔ بہرحال مجھے خالد صاحب کی رائے کا احترام ہے اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہی سمجھتے ہوں گے۔

☆ جو لوگ آپ پر تکرار اور بسیار نویسی کا الزام لگاتے ہیں انہیں آپ کس طرح مطمئن کرنا چاہیں گے؟

☆☆ میں قطعی طور پر ایسے لوگوں کو مطمئن کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ اگر خود نا آسودہ رہنے پر مُصر ہیں تو میں کون ہوتا ہوں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ بسیار نویسی ہے کیا؟ اگر آپ کا معیار متاثر ہوتا ہے پھر تو آپ مصنف کو تنقید کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ سعادت حسن منٹو نے بیالیس سال کی عمر میں چالیس کتابیں لکھیں، کرشن چندر نے کتنی کتابیں لکھیں، بیدی کی سو سے اوپر کتابیں ہیں۔ جتنے بھی معروف ادیب گزرے ہیں سب نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ آپ احمد ندیم قاسمی کو لے لیں، ممتاز مفتی کو لے لیں درجنوں کے حساب سے اُن کی تصانیف اس کے باوجود ہیں کہ وہ لوگ کُل وقتی ادیب نہیں تھے جبکہ میرا اوڑھنا بچھونا ہی ادب ہے۔ اگر میں ادبی زندگی کو دو صفحات روزنانہ پر بھی تقسیم کروں تو آپ حساب لگا لیجیے کہ میرا ادبی اثاثہ کتنا ہونا چاہیے۔

☆ اس رائے میں تو قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ ''بہاؤ'' جیسا ناول مستند تحقیق و جستجو کے بغیر تحریر نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے قارئین کو اپنی جدوجہد سے باخبر کیجیے؟

☆☆ جی ہاں! میں نے بارہ سال کی تحقیق و جستجو کے بعد ''بہاؤ'' تحریر کیا۔ میں نے اُس دور کے لوگوں کی پسند و ناپسند، کھانے پینے اور رنگ کے ساتھ اُن کے خوابوں کو بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے مگر اس طرح کہ لوگوں کو یہ احساس نہ ہو کہ میں اپنے بہت سے ہم عصروں کی طرح قاری پر اپنے تجربے کی دھاک بٹھا رہا ہوں ہاں یہ ضرور ہونا چاہیے کہ قاری تشکک کا شکار ضرور ہو کہ بھئی مصنف نے اس میں تحقیق کی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تحقیق ہوئی بھی ہے تو اُس کی مہک، اُس کی خوشبو قاری کو محسوس ہونا چاہیے۔

☆ ''خس و خاشاک زمانے'' میں شیکسپیئر کے حوالے سے صفحہ 352 اور 444 پر جس سہو کی نشان دہی کی گئی ہے اُن کی بابت آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

☆☆ ہاں جی! اس طرح کی غلطیاں اکثر مصنف سے ہو جاتی ہیں۔ لکھنا آپ اوتھیلو چاہتے ہیں آپ کے ذہن میں ہیملٹ ہوتا ہے آپ وہ لکھ دیتے ہیں۔ ''خس و خاشاک زمانے'' پر ایک خاتون نے ایم فل کیا۔ اُس میں قریب بہتر کردار ہیں جو لگ بھگ اسی برس کے زمانے میں چل پھر رہے ہیں مگر اُن خاتون کے بقول انہوں نے اُس میں قطعاً کوئی جھول نہیں دیکھا۔ میں ایک خاکی انسان ہوں اور خود کو خطا کا پتلا گردانتا ہوں۔ پرفیکشن صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو حاصل ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کو GARCIA MARQUEZ کے ناول '' ONE HUNDRED YEAR OF SOLITUDE'' کا اردو ورژن بھی کہتے ہیں؟

☆☆ آپ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے مجھے یہ بات کہی کہ آپ نے GARCIA MARQUEZ MAGICAL REALISM سے لیا ہے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ میرا ناول ''پکھیرو'' GARCIA کے ناول سے پہلے منظرِ عام پر آ گیا تھا۔ MAGICAL REALISM ہماری لوک داستانوں

میں عام نظر آئے گا مثلاً حاتم طائی کو لے لیجیے وہ کس طرح اچانک آ کر غائب ہو جاتا ہے۔سو میں نے GARCIA سے کچھ نہیں لیا۔جن سے متاثر ہوتا ہوں یا استفادہ کرتا ہوں اُس کا اقرار بھی کرتا ہوں کیونکہ اس سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔بھئی آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میرا ناول اردو ورژن ہے۔آپ یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول اسپینش زبان میں لکھا جاتا تو ہو بہو اسپینش ورژن ہوتا۔یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہمیشہ وارث شاہ کو پنجاب کا شیکسپیئر کہا جاتا ہے۔شیکسپیئر کو انگلینڈ کا وارث شاہ کیوں نہیں کہتے۔

☆ کم وبیش نصف صدی پر محیط ادبی ریاضت کے صلے میں ملک وقوم نے آپ کو جو عزت واحترام اور نام ونمود دیا اُس کی بابت آپ کے ہاں کس حد تک اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ مجھے اُس وقت سخت الجھن ہوتی ہے جب میں اپنے ملک کے ادیبوں،شاعروں کو گلا مند دیکھتا ہوں۔میرے خیال میں اُنہیں اپنی ناقدری کا ذمہ دار ملک وقوم کو ٹھہرانے کے بجائے اپنی تخلیقات پر توجہ دینا چاہیے۔اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا ریڈر بہت معصوم ہوتا تھا اور رائٹر نسبتاً بہتر آ گہی رکھتا تھا۔وقت اور ذرائع کے ساتھ ریڈر رائٹر سے بہت آ گے نکل گیا۔اب ریڈر کا رائٹر سے مطالبہ یہ ہے کہ بھئی ہم سے زیادہ نہ سہی کم ازکم اتنا تو پڑھو جتنا ہم جانتے ہیں۔اگر آپ خود کو ریڈر سے بہتر تصور کریں گے یا ریڈر کو حقیر جان کر خود کو افلاطون سمجھنے لگیں گے۔جب تک آپ قاری کے دُکھ سُکھ،خوشی اور غم میں شیئر نہیں کریں گے تب تک وہ آپ سے اجنبیت کا اظہار کرتا رہے گا۔مجھے قطعاً اپنے لوگوں سے ناقدری کی کوئی شکایت نہیں بلکہ مجھے تو اس قدر لوگوں نے عزت دی اور سر آنکھوں پر بٹھایا کہ اُس پر باقاعدہ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔حال ہی میں فیصل آباد ادبی ریفرنس میں شرکت کے لیے جب میں گیا تو وہاں مجھے اتنی تعداد میں لوگ ملنے آئے کہ انتظامیہ کو سیکورٹی طلب کرنا پڑ گئی۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بہت بڑا رائٹر ہوں بلکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ میں قاری کو اپنی سطح پر لانے کے بجائے اُس کی سطح پر جا کر لکھتا ہوں اور اُسے ایجوکیٹ کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتا۔اس سے مجھے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ قاری اور میرے درمیان اجنبیت کے بجائے محبت اور خلوص کا ایک رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔

☆ ایک ادیب کے اندر اضطراب کا ہونا فطری بات ہے۔وقت اور تخلیقات کی تعداد کے ساتھ یہ کم ہوتا ہے یا بڑھتا ہے۔دونوں صورتوں میں آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆☆ دیکھیں جی میرا شمار اُن لوگوں میں قطعاً نہیں ہوتا جو ہر وقت سوگوار صورت بنائے آہ وزاری میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔یقیناً ادیب کا حساس ہونا اچھی بات ہے۔میں بھی مشرقی پاکستان کے سانحے پر باقاعدہ آنسوؤں سے رویا تھا۔پشاور کے سانحے نے بھی مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔میں اس بات کا قائل نہیں کہ پہلے جو ادب لکھا گیا آج ویسا نہیں لکھا جارہا یا پہلے جو خوراکیں کھائی گئیں وہ آج میسر نہیں۔آج بھی بہت طاقتور ادب لکھا جارہا ہے۔آج بھی انسان کے کھانے کو بہت کچھ دستیاب ہے۔تو میں ارتقاء کا قائل ہوں اور یہی زندگی کا روشن پہلو ہے۔

☆ اچھا یہ فرمایئے معاشرتی رجحان،تبدیلی یا انقلاب میں ادیب کا کسی قسم کا کوئی رول ہوتا ہے؟

☆☆ قطعی نہیں! ادیب صرف انڈیکیٹ کرسکتا ہے،سمت دکھلا سکتا ہے مگر براہِ راست تبدیلی لانے پر قادر نہیں ہوتا۔دوستوفسکی ہوں یا کوئی اور بڑے ادیب وہ صرف نشاندہی کرسکتے ہیں اور ایسا ہر بڑے ادیب نے کیا ہے۔ہر چند میرا شمار بڑے ادیبوں میں نہیں ہوتا لیکن میرے ناولوں میں بھی آپ کو بعض قومی معاملات پر اشاروں کنایوں میں اپنی رائے کا اظہار نظر آئے گا۔

☆ آپ تو ماشاء اللہ پاکستان کے بیسٹ سیلر رائٹر ہیں۔عام طور پر کتاب کی اشاعت پبلشر کے بجائے ادیب کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔اس سے ادب کو کس طرح کے نقصانات کا اندیشہ ہے؟

☆☆ مجھے نام تو نہیں لینا چاہیے لیکن حق بحقدار رسید کے مصداق یہاں میں سنگ میل پبلی کیشنز کا نام لوں گا جنہوں نے قرۃ العین حیدر کو پہلی بار کتاب کی رائلٹی دی۔پبلشر کے پاس بُرا بھلا ایک نیٹ ورک ہوتا ہے جس کے ذریعے کتاب کسی نہ کسی تعداد میں تقسیم ہوجاتی ہے۔اب ادیب خود جب کتاب چھاپتا ہے تو سب سے پہلے اُسے لاگت کی فکر لاحق ہوتی ہے پھر وہ اپنے حلقہ احباب تک محدود ہو کر پہلے کتاب تقسیم کرتا ہے پھر تنقید نگاروں کا تعاقب کرتا ہے اور تنقید نگاروں سے کچھ ہاتھ آ جائے تو پھر مدیروں کی لائن میں لگ جاتا ہے۔اس طرح ادب کا سفر اگر پیچھے کی طرف نہیں ہورہا تو کم ازکم آ گے کی طرف بھی نہیں بڑھ رہا۔

☆ ایک تاثر یہ بھی بہت تقویت پکڑ رہا ہے کہ ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے پبلشر کے مقابلے میں پڑھا لکھا پبلشر ادب کی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے؟

☆☆ میں اس خیال سے صد فیصد متفق ہوں۔جو بڑے پبلشرز ہیں اُن کے ہاں پڑھے لکھے لوگوں کی ٹیم مسودات جانچتی اور اُن میں ردوبدل کی تجاویز دیتی ہے۔عبداللہ حسین نے اپنا انگریزی ناول جب پبلشر کو بھیجا تو اُنہوں نے اُس میں سے بہت کچھ کاٹنے کا مشورہ دیا۔جواب میں عبداللہ حسین نے کہا کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔پبلشر کا جواب تھا''آپ رائٹر ہیں یہ آپ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔''محمد حنیف نے اپنا انگریزی ناول ''A Case of Exploding Mangoes''اشاعت کے لیے بھیجا تو امریکن پبلشر نے کہا کہ اس میں امریکن Slang ڈالیں کیونکہ ہمارے ہاں کے لوگ اس قسم کی انگریزی نہیں سمجھتے۔

☆ آپ کے نزدیک قاری کی اہمیت زیادہ ہے یا نقاد کی؟

☆☆ دونوں اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔نقاد کی ذمہ داریاں قاری کی

نسبت زیادہ ہیں۔ایک جینوئن نقاد کسی بھی تخلیق کو فرش سے عرش پر پہنچا سکتا ہے بشرطیکہ وہ پڑھا لکھا اور روشن دماغ ہو۔اب ہمارے ہاں ایسے ناقدین کی کتنی تعداد ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ Johnathan living stone seagull ایک ناول ہے جس پر فلم بھی بنی۔ایک برٹش نقاد دس سال بعد جا کر یہ ناول لے آیا اور اُس نے اس پر تنقیدی مضمون لکھ کر ''ٹائم'' میں شائع کرایا۔ناول کی شہرت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ہمارے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ الگ الگ گروہ کے الگ الگ تخلیق کار اور اُن کے الگ الگ تنقید نگار موجود ہیں۔ایسے وقت میں صفدر میر، جیلانی کامران اور احمد بشیر بہت یاد آتے ہیں۔اور ظاہر ہے اس صورت میں قاری خود بخود نقاد پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔

☆ آپ کی اگلی نسل اردو زبان وادب سے کس حد تک مانوس ہے اور مستقبل کے حوالے سے کس طرح کی امیدیں باندھی جاسکتی ہیں؟

☆☆ آپ کے سوال میں بین السطور جو خواہش پنہاں ہے اس پر تو شاید میری اگلی نسل پوری نہ اُترے۔ ماشاء اللہ گھر کے تمام افراد اردو زبان وادب سے بخوبی آشنا ہیں۔میرے علاوہ اپنی پسند کے ادیبوں کو پڑھتے بھی ہیں اور اظہار خیال بھی کرتے ہیں البتہ میرا جو بیٹا ڈپلومیٹ ہے وہ ایک ناول لکھنے کی پلاننگ ضرور کر رہا ہے۔

☆ کچھ تفصیل آپ پر ہونے والے تحقیقی کام کی بتلائیے؟

☆☆ میں صحیح تعداد نہیں بتلا سکتا کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ اس وقت سب سے زیادہ تحقیقی کام مجھ پر ہو رہا ہے۔اس سلسلے میں بھی عجیب وغریب صورت حال کا سامنا ہوتا ہے۔ایک خاتون ایم۔اے کا مقالہ لکھنے کے لیے میرے پاس تشریف لائیں۔میں نے کہا ''آپ نے میری کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں'' وہ خاتون بولیں ''کوئی نہیں''۔میں نے کہا ''بی بی پہلے آپ مجھے پڑھیے پھر تحقیقی مقالہ لکھیئے'' خاتون رونے لگیں کہ ''میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میرے پاس صرف دو ماہ کا وقت ہے۔ایم۔اے کرنے کے بعد نوکری مل سکتی ہے۔'' لہٰذا میں نے ان کی مدد کر دی۔کچھ لوگ سنجیدہ بھی ہوتے ہیں اب یہ خاتون ہیں سلمیٰ کاشمیری انہوں نے میرے اوپر ایم۔فل کیا اب دو سال پہلے پی۔ایچ۔ڈی منظور کرا کر آئیں تو میں نے کہا ''بی بی یہ سلسلہ بعد از مرگ ہونا چاہیئے'' تو خاتون نے کہا کہ ''نہیں سر! پالیسی تبدیل ہو رہی ہے'' میں سمجھتا ہوں یہ مثبت پیش رفت ہے۔کم از کم پچاس فیصد معلومات مصنف کے پاس ہوتی ہیں۔اُس کی غیر موجودگی میں بہت سی دھاندلی اور بے ایمانی بھی ہوسکتی ہے جو کہ اُس کی موجودگی میں ناممکن ہے۔تو یہ جو آپ نے دریافت کیا تھا کہ قاری اہم یا نقاد تو یہ قاری نے مجھ پر پی۔ایچ۔ڈی کیا ہے نہ کہ ناقدنے۔جب وہ میرے پاس ڈگری لے کر آئیں تو میں نے پوچھا کہ ''ڈاکٹر بن کر کیسا لگ رہا ہے؟'' تو خاتون نے کہا ''جب تک اپنے ہاتھ سے آپ میرے نام کے آگے ڈاکٹر نہیں لکھیں گے تب تک مجھے یقین نہیں آئے گا'' مجھے خوشی ہے کہ پشاور یونیورسٹی سے میں پہلا شخص ہوں جس کی زندگی میں اُس پر پی۔ایچ۔ڈی ہوا ہے۔یہ اس لحاظ سے بھی اچھا قدم ہے کہ اس طرح آرکائیز میں سفرنامے کے حوالے سے کام محفوظ ہو جائے گا اور آنے والے وقتوں میں لوگوں کے کام آئے گا۔

☆

''نکلے تری تلاش میں''

''نکلے تری تلاش میں'' مستنصر حسین صاحب کی اس کتاب کو مصور کرنے سے پہلے مجھے ۱۹۶۴ء میں پیرس میں البرٹ کامیو کے ناول ''لا اترانثرے'' کو بھی باتصویر کرنے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔تارڑ صاحب کی یہ کتاب میں نے پوری تو نہیں پڑھی اور شدائد حیات اور آوارگیِ خیالات نے آج تک کسی بھی نثر کی کتاب کو اوّل تا آخر پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔''نکلے تیری تلاش میں'' جب بھی اور جہاں سے بھی کھُل گئی پڑھنی شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا شدید مصروفیات کے باوجود۔اور جہاں جہاں سے بھی پڑھی بیان کی شگفتگی اور تحریر کی روانی کے رنگ اور رفتار کو ایک سا پایا۔قلم کی یہی جولانیاں اور رعنائیاں اور طرزِ انشا کی یہی شوخیاں اور انگڑائیاں دورانِ خون ملیں ایک تاثر چھوڑ گئیں جو صفحۂ قرطاس پر خطوط کی صورت میں ظہور پذیر ہوگیا۔تحریر آئینۂ قرطاس میں تصویر ہو کر نظر آئی یعنی یہ خاکے اُن کی تحریر کا محض ایک عکس ہیں لہٰذا اہلِ بینش مجھے نہیں خاکوں کی بھی داد جناب مستنصر حسین تارڑ کے حسنِ بیان اور جمالِ نگارش کو دیں اور یہ فقیر اُن کے صبر اور شوق کو مرحبا اور اُن کے تمکین وضبط کو آفرین کہتا ہے۔

صادقین

''پاروشنی کا سایہ''

(بہاؤ سے منتخبہ)

(مستنصر حسین تارڑ)

''**می آ وٗں**۔می آ وٗں'' رُکھوں کے اندر سے کہیں مور بولا۔

اُس نے اپنے ہاتھ میں لٹکی پَروں کی پوٹلی کو اُن بے شمار پرندوں کے ڈھیر پر رکھ دیا جو اب ہڈیاں ہو چکے تھے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''گئے برسوں میں پانی یہاں تک آتے تھے'' اُس نے قدموں میں بچھی سفید مٹّی کی تہہ کو دیکھا۔ رُکھوں کے ذخیرے میں چھپا ہوا یہ کلر اٹھا میدان پانچ چھ سو کرو لمبائی میں اور چوڑائی میں ہوگا۔ پہلے تو جھیل کے پانی رُکھوں کے تنوں تک آتے تھے پر اب وہ صرف بیچ میں سوڈیڑھ سو کرو کے رقبے میں سمٹ گئے تھے۔ گہرائی میں بھی بس اتنے کہ تہہ کا کیچڑ صاف نظر آتا تھا اور چوپائے اُس میں کھڑے رہ سکتے تھے پر لیٹنے سے ڈوبتے تھے۔ اب بڑے پانی بھی کم آتے تھے اور اگر آتے تھے تو دریا سے نکل کر یہاں تک پہنچتے پہنچتے زمین ہی میں گم ہو جاتے تھے اور یوں ہر برس یہ جھیل بھرنے کی بجائے کچھ اور سُوکھ جاتی تھی، کچھ اور سمٹ جاتی تھی۔ ہر برس پانی کے گرد ایک اور دائرہ بن جاتا، جہاں تک پانی پہلے تھا اور اب سُوکھ چکا تھا۔ ایسے دائرے پھیلتے ہوئے رکھوں کے اندر تک جاتے تھے کہ پانی بھی تو وہیں تک جایا کرتا تھا۔ اس کلر اٹھی زمین پر جہاں سے جھیل ہٹ چکی تھی پرندے گرتے تھے اور مرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ اس مقام پر پرندے صرف مرنے کے لیے آتے ہیں اور دُور دُور سے آتے ہیں، کبھی اکّا دکّا اور کبھی اَن گنت ڈاروں میں وہ اِدھر آتے۔ اُن کے مردہ جسم گلتے سڑتے اور اُن کی بُو رُکھوں کے اندر تک جاتی پر وہ سب ایک ہی جگہ پر گرتے اور یوں اُن کی ہڈیوں کا ایک ٹیلا سا بن گیا تھا۔۔۔ اِسی ٹیلے پر وہ بھی گرا تھا اور اب پڑا تھا اگرچہ ابھی گلا سڑا نہیں تھا۔

''می آ وٗں۔می آ وٗں'' مور بولا۔

پاروشنی کا سایہ کلر اٹھی زمین پر سفید ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنا سایہ دیکھتے ہی ڈر کے مارے ہچکی لی آسے پاسے دیکھا اور فوراً اپنا مُکھ موڑ کر سورج پاسے کرلیا۔ اُس نے پہلے کبھی بھُول چوک میں بھی سورج کی طرف پیٹھ نہیں کی تھی۔ اُس نے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ ایسا کرنے سے بُرا سامنے آتا تھا۔ پر آج تو وہ آسمان سے گرتے پرندے کو دیکھنے میں مگن انجانے میں ایسا کر بیٹھی تھی۔

''می آ وٗں۔می آ وٗں'' مور بولا۔

پاروشنی سورج کو سامنے رکھ کر رُکھوں میں داخل ہوئی اور اُن کی گھنیری چھاؤں میں راستہ بنانے لگی۔ یہاں گرم نمی میں اُس کے بدن کے مسام کھلے اور سانس لینے لگے اور پسینہ اس کی گردن سے رینگتا ہوا پیٹھ کو چھونے لگا۔ رُکھوں کے اس ذخیرے میں بارش اُتری رہتی تھی اور یوں ایک گیلی ہوا دم سادھے اِدھر موجود رہتی تھی۔ رُکھوں میں پیپل اور املی کے رُکھ زیادہ تھے اور ان میں سے بیشتر اگرچہ کھوکھلے ہو چکے تھے لیکن کوئی بھی انہیں چھونے کا سوچ نہیں سکتا تھا کیونکہ ان رُکھوں میں یکشنا اور یکشنی رہتی تھیں، اُن کی روحیں جو دیکھتی تھیں۔ پیپل کا ایک بہت بڑا تنا اُس کے راستے میں آیا تو پاروشنی اُسے پھلانگنے کی بجائے سر جھکا کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی اور اُس کے گرد چکر لگا کر واپس اپنے راستے پر آئی۔ چھاؤں اتنی گھنی تھی کہ کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا، کہیں کوئی ایک پتہ ہلتا تو سورج کی ایک کرن اس اندھیرے میں شتابی سے داخل ہوتی اور پھر جیسے تاریکی اُسے جذب کر لیتی۔ پر پاروشنی یہاں بھی دیکھ سکتی تھی اور نہ بھی دیکھ پاتی تو وہ یہاں آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی۔ صرف وہ تھی جو رُکھوں کے اندر جھیل تک جاتی تھی، اور کوئی نہ جاتا تھا۔

''می آ وٗں۔می آ وٗں'' مور بولا۔ اور اس بار وہ پاروشنی کو دیکھ کر بولا تھا۔ اُس کا اوپر والا ہونٹ دانتوں سے پرے ہوا اور پیپل کے پتوں میں سے آتی روشنی اُن پر لشکی اور وہ مسکراتی ہوئی اُس کے پاس سے گزر گئی۔ جب وہ بانجھ عورتوں کے رُکھ کے قریب ہوئی تو پل بھر کے لیے رُکی، پیپل کی شاخوں اور خاص طور پر اُس کے موٹے اور اوپر اٹھتے ہوئے تنے کے گرد بے انت ون سونے دھاگے بندھے ہوئے تھے، ہر دھاگہ ایک ایسی عورت نے باندھا تھا جو خشک تھی اور فصل چاہتی تھی اور اپنے آپ کو ہرا ابھرا کرنے کی اُمید پالتی تھی۔

اُس نے ایک گہرا سانس لیا، کم سے کم اُسے اِس پیپل کے ساتھ رنگین دھاگہ باندھنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئے گی، نیچے حدت دیتے بدن کے گیلے ہوتے حصے نے اُسے یہی بتایا۔۔۔ ورچن! اُس حصّے میں تھرتھراہٹ سی ہوئی اور پاروشنی نے گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ اُس نے اپنی گیلی انگلیوں کو ناک سے لگایا، وہاں گرم اور پھوٹنے والی مہک تھی جس میں فصل ہی فصل تھی۔

جہاں رُکھ ختم ہوتے تھے وہیں سے ڈوبو مٹی کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ انجان چلنے والا تو اس میں ڈوب سکتا تھا کہ اوپر سے ایسے تھے جیسے عام مٹی ہو پر اُس پر چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہوئی اور کہیں کہیں سرکنڈے اور دھامن اور کھبل دکھائی دیتے ہوں۔ اسے ہڑپ کرنے والی مٹی بھی بولتے تھے کیونکہ جنور یا بندہ جو بھی ادھر آیا تو اس نے اُسے اپنے اندر ایسے گم کیا کہ باہر کوئی نشان نہ ملتا کہ اِدھر کوئی تھا کہ نہیں۔۔۔ گھاس بھی واپس آجاتی اور اُس پر مچھر اور مکوڑے پہلے کی طرح منڈلانے لگتے۔ پر اس ڈوبو مٹی میں بھی پکے پیڈے راستے تھے جن پر لوگ چلتے تھے اور پاروشنی ان راستوں کو جانتی تھی۔ اُس نے یہاں رُک کر آنکھیں بند کیں اور ہوا کو اپنے اندر کھینچا، تھوڑی دیر تک دم روکا اور پھر اُس کے نتھنوں میں

کُترن کی بوجھل خوشبو آئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دائیں ہاتھ پر کُترن کی جھاڑی کے ساتھ وہ راستہ شروع ہوتا تھا جو چھپری اور کھیپ کی جھاڑیوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پیڈی مٹی یعنی کھیتوں کے قریب جا نکلتا تھا۔ دیکھنے میں تو یہ بھی ڈوبو مٹی ایسا ہی لگتا تھا، وہی چھوٹی چھوٹی گھاس اور باریک گتّی جو اُس کے اوپر اڑتی رہتی پر اندر سے یہ اُکّا پکّا پیڈا تھا۔ پاروشنی دھیرے دھیرے دیکھ دیکھ کر پاؤں دھرتی اس پر چلنے لگی۔ کہیں کہیں نرم مٹی بھی آ جاتی اور اُسے ٹخنوں تک دھنسے پاؤں کو کھینچ کر باہر نکالنا پڑتا۔ دریا کے بڑے پانی اس برس ابھی نہیں آئے تھے ورنہ یہ راستہ بھی ڈوبو ہو چکا ہوتا۔ کترن کی جھاڑیوں کے ایک جُھنڈ میں اُسے پندرُو پھر دکھائی دیا۔ وہ شاندار لِشکتی گردن اٹھائے خاموش کھڑا جیسے گم تھا، پاؤں، سر یا آنکھوں میں کوئی جنبش نہیں صرف کان کبھی کبھار اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھر جاتے۔ اُس کی آنکھیں اتنی تیز نہیں کہ پاروشنی کو دیکھ سکے۔ وہ گم کھڑا تھا اور اُسی سمے پاروشنی کے پاؤں تلے ایک سوکھی ہوئی ٹہنی ٹوٹی تو اُس کے کان اس آواز کی جانب پھرے، اُس دم ہوا کا ایک جھونکا پاروشنی سے اُدھر کو گیا تو اُس نے نتھنے پھُلا کر سونگھا اور کسی کی موجودگی کو جان کر ہوشیار ہوا اور پھر پلانگیں بھرتا ڈوبو مٹی پر سے بھاگتا رُکھوں کے اندر چلا گیا۔ پندرو ڈوبو مٹی پر اتنا بھار ہی نہیں ڈالتا تھا کہ وہ ڈوب سکے۔ پاروشنی جب کبھی جھیل کو جاتی تو یہ چنکارہ ہرن کنک رنگا، سفید پیٹ والا اپنی چھوٹی سی دُم جھاڑتا آنکھیں جھپکتا اُسے کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دے جاتا۔ وہ اُسے پندُور کہتی تھی۔ پاروشنی اپنے اندر میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تین کُرو کا پینڈا کرنے کے بعد اُس کے پیروں نے بتایا کہ ڈوبو مٹی ختم ہو رہی ہے، وہ اب زمین میں کم دھنستے تھے، اور وہ پلانگیں بھرتی ہوئی تیزی سے چلنے لگی۔

اُنہوں نے اُسے ڈوبو مٹی سے باہر آتے تو نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ سویرے سے اپنی کسیّوں اور کدالوں پر جھکے زمین کھود رہے تھے۔ بڑے پانی کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کب آ جائے۔ یہی دن اُس کے آنے کے تھے اور زمین کا یہ ٹکڑا اُن کے ذمے پڑا تھا۔ ہاں جھوریا پسینہ پونچھنے کو کھڑا ہوا تو وہ پھوک کی جھاڑیوں کے درمیان چلتی دکھائی دی۔ اُن دونوں نے جب اپنے بھرا کو دوبارہ جھکتے محسوس نہ کیا تو وہ بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھے ہو گئے اور اُدھر دیکھنے لگے جدھر تیسرا دیکھتا تھا۔ اس بار مینہ کم برسا تھا اور پھوگ پر پتے نہیں تھے صرف خشک ٹہنیوں کا جھاڑ تھا جس کا چاندی رنگ دُھوپ میں ٹھاٹھیں مارتے پانی کی طرح لشکارے مارتا تھا۔ اور ان خشک لشکتے جھاڑوں میں پاروشنی چلی جا رہی تھی۔ پھوگ کی ٹہنی اگر خشک ہو تو اُس کا رنگ تازہ راکھ ایسا ہوتا ہے پر اس میں ایسی لشک ہوتی ہے کہ گہری رات میں صرف ایک پھوگ دور سے جلتے الاؤ کی طرح دکھائی دیتی رہتی ہے۔ اور یہاں ان گنت الاؤ تھے جن کے بیچ پاروشنی چلی جاتی تھی۔

تینوں بھراؤں سے ایک کُرو کے فاصلے پر ماتی کا سیاہ جسم ایک کسّی پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے کانوں تک جب کسیّوں کی کھُس کھُس خاصی دیر تک نہ پہنچی تو اُس نے اپنی چھاتیوں پر سے لیڑا ڈھیلا کیا اور اُن پر تیرتے پسینے کو ہتھیلیوں سے پونچھا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ تینوں بلکہ چاروں اُس نے ایک ہی رات میں جنے تھے اور اُنہیں موت کے یَم کتّوں سے بچائے رکھنے کے لیے اُسی وقت دریا پر گئی تھی اور اُن چاروں کی ٹانگیں پکڑ کر اُنہیں کچھ دیر کے لیے پانی میں ڈبو دیا تھا۔ جب انہیں باہر نکالا تو اُن میں سے ایک بے جان لٹکتا تھا اور باقی تینوں پھیپھڑے پھُلا پھُلا کر چیختے تھے اور اُن کے ناک منہ سے پانی جاری تھا۔ اُن کے جُسے سوہنے سیاہ تھے، قد چھوٹے، ناکیں چپٹی اور بال گھنگھریالے تھے۔ وہ تینوں الگ سے کوئی کام کاج نہ کر پاتے، ہمیشہ جنوروں کی طرح سانجھے کام کرتے۔ اور اب وہ سانجھے ہی پاروشنی کو دیکھ رہے تھے اور اُنہیں اُن کی میاماتی دیکھ رہی تھی۔ ماتی کے چٹّے سفید دانت دھوپ میں لشکے اور اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں کو پھیلا کر ہیک لگائی۔ ''جھوریا'' وہ تینوں جھوریا تھے۔ پہلا دوجا اور تیجا جھوریا۔ ماتی کی آواز سنتے ہی تینوں کی نظریں پاروشنی سے الگ ہوئیں اور زمین پر جھک گئیں۔ وہ اُن کی میّا تھی، بڑی میّا کا زمینی رُوپ، وہ اُس کے چاکر تھے۔

پاروشنی نے اُن تینوں کو کسیّاں چھوڑ کر کھڑے ہوتے اور پھر ماتی کی ہیک پر دوبارہ زمین پر جھکتے دیکھتا۔

وہ اپنے حصے کی زمین کھود چکی تھی۔ ڈوبو مٹی اور دریا کے درمیان پھیلی ہوئی زمین پوری بستی کی تھی۔ مینہ اُترنے سے پہلے اور بڑا پانی کناروں سے باہر پھیلنے سے اگیتے سارے باسی اُسے کھودنے کے لیے اپنا اپنا حصہ بانٹ لیتے اور پھر اُس میں کنک۔ جَو اور مٹری وغیرہ کے بیج ڈال کر اُسے پدھّر کر دیتے۔ کھیتوں کو آسے پاسے گارے کی دیواریں بنا دیتے تا کہ پانی اُن کے اندر آ کر ٹھہرا رہے اور جذب ہو جائے۔ جب پھوٹ پڑتی، بُوٹے بنتے اور اُن میں بیج پڑتا تو وہ سب کا سانجھا ہوتا۔ کبھی کبھار جب بیج زمین میں پڑا سُو کھنے لگتا اور اُس میں پھُوٹ نہ پڑتی تو بڑی میّا کی ایک مورتی جو پکلی کی پکائی ہوئی ہوتی کھیتوں کے بیچ رکھ کر بستی کی کوئی جمی۔ بدھری یا کواسی اُس کے پاس لیٹ جاتی اور کوئی مندرا۔ پنڈویا چپّا اُس کے بیچ اپنا بیج اُتارتا اور یوں دنوں میں بڑی میّا کے زور سے زمین کا بیج بھی پھوٹ مارنے لگتا۔ ماتی کے تینوں پُتروں کا بیج بھی ایسے ہی بڑی میّا کے سامنے کھیت میں لیٹے ہوئے ہُنگا نے ڈالا تھا۔ ہُنگا اُسی رات دریا میں نہانے گیا تو پھر لوٹا نہیں۔ دوسرے کنارے چلا گیا جہاں سارے مرنے والوں کی روحیں جاتی ہیں۔ پاروشنی بھی بڑی میّا اور کھیتوں کے لیے سب کچھ کر سکتی تھی لیکن اُن کا جی چاہتا تھا صرف ورچن؟ یا سمرو ہو؟ کوئی بھی۔۔۔ ورچن یا سمرو کون؟ اُس کے بیچ بدن میں پھر ایک تھرتھراہٹ سی ہوئی اور وہ گھبرا کر تیز تیز چلنے لگی۔ جن کھیتوں میں سے وہ گزر رہی تھی اُنہیں بھی کھوادجا رہا تھا۔ کئیوں نے یہیں بستی سے باہر کھیتوں میں ڈیرے بنا لیے تھے اور اپنا مال ڈنگر بھی ساتھ لے آئے تھے۔ بڑے پانی کے آنے پر انہوں نے بستی کو لوٹنا تھا۔ اُس کی آہٹ ان ڈیروں کے پاس آتی تو کتّوں کی دُموں کو پہلے خبر ہوتی اور وہ دُھول میں دَھپ

دَھپ چلنے لگتیں اور جب وہ بھونکنے کو منہ کھولتے تو پاروشنی کو جان لیتے اور پھر لیٹ جاتے۔

جہاں بستی کا پہلا چھپّر تھا اُس سے دو تین کرو ادھر لمبے سینگوں والے بیلوں کا باڑا تھا۔ اِن بیلوں کے کوہان نہیں تھے اور انہیں اگر سامنے کی بجائے ایک پاسے سے دیکھا جائے تو یوں لگتا تھا جیسے اُن کا صرف ایک سینگ ہے۔ یہ پوتّر بیل صرف نسل بڑھانے کے کام میں لائے جاتے اور ویسے سارا دن بیکار بیٹھے جگالی کرتے رہتے۔ اُن کی دیکھ بھال کے لیے بستی کا سب سے بوڑھا شخص دُھروا وہاں بٹھایا گیا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ جانے والا ہے کیونکہ اب وہ ہر رات دریا کے پاسے جاتا اور کنارے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھتا اور روتا رہتا۔ اُس کی ہڈیاں دن بہ دن بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور وہ سوتے میں بھی یم کتّوں کے رونے کی آوازیں سنتا رہتا تھا۔ جب پاروشنی اُس کے قریب آئی تو وہ چارے کے اُن چھوٹے چھوٹے گٹھوں کو باڑے کے اندر لے جا رہا تھا جو بستی والے سویرے سویرے اُس کی دیوار کے ساتھ جوڑ گئے تھے۔

''مامن دھروا'' پاروشنی رُک گئی۔

دُھروا ایک گٹھے پر جھکا ہوا تھا، اُس نے ٹیڑھی آنکھ سے اُدھر کو دیکھا اور پھر اُسی طرح جھکا ہوا پاروشنی کے پاس آ گیا ''کسی کے دل میں میرا خیال نہیں۔ میرا اَکس بَل میرا زور تو جا چکا۔ چارے کے گٹھے دیوار کے ساتھ لگا کر چلے جاتے ہیں، انہیں پتہ نہیں کہ میں نے کتنے بڑے پانی دیکھے ہیں، مجھ میں اب ہمت نہیں۔''

پاروشنی بولی نہیں، دیوار کی طرف گئی اور ایک گٹھا اٹھا کر باڑے کے اندر لے گئی۔ پیشاب اور لید میں لتھڑے ہوئے بیلوں نے چارہ لانے والے کی چال اور ڈھنگ میں فرق جانا تو موندھی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور پھر اپنی دُمیں باریک لید میں چلا کر پہلے سے بھی زیادہ چوڑے ہو کر جگالی کرنے لگے۔ کُل چھ گٹھے تھے اور پاروشنی انہیں ڈھوتے ہوئے یوں نڈھال ہوئی کہ باڑے میں جو لِید اور پیشاب کی بُو تھی وہ اُس کے اندر اتھل پتھل کرتی تھی۔

''مامن دھروا تمہارا کام کاج تو ختم ہوا'' وہ باہر آ کر اُس سے ذرا پرے ہو کر بیٹھ گئی۔ دُھروا کی مہین ٹھوڑی پر گھنگھریالے بالوں کا صرف ایک گچھا تھا جو اُس کے کالے شاہ رنگ کی وجہ سے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا البتہ ہوا کے کسی جھونکے سے سرسراتا تو دُھروا اُسے فوراً ٹھوڑی کے ساتھ ایسے چپکانے کی کوشش کرتا جیسے وہ اڑ جائے گا۔ اُس کی چھوٹی سی کھوپڑی پر سیاہ ماس ایسے کسا ہوا تھا کہ جونہی وہ بولنے کو منہ کھولتا اُس کے سر کی ہڈی بالکل ہی ننگی دکھائی پڑتی۔

''آج کا کام کاج تو ختم ہوا پاروشنی۔ پر اِس آسے پاسے۔۔۔'' اُس نے سوکھتی اور اُبھری ہوئی رگوں والا ہاتھ چاروں اُور گھمایا ''اور اُدھر۔۔۔ اوپر'' اُس نے آسمان کی طرف انگلی کھڑی کی''۔۔۔ جو مانا ہے۔ جسے راضی رکھنے کو ہم بڑی میّا کے پاس بیٹھتے ہیں اور لِنگ پر پھول تیل چڑھاتے ہیں، جو بیچ میں سے بُوٹا نکلتا ہے اور جس کے یم کتے ہمیں دریا کے اُس پار لے جاتے ہیں۔۔۔ وہ جانے میرا کاج کب مکائے گا''

''مامن دُھروا۔ مانا ہے بھی کہ نہیں؟''

دُھروا نے یکدم پاروشنی کی طرف دیکھا جو آلتی پالتی مارے اُس سے دو کرو کے فاصلے پر دُھوپ میں بیٹھی تھی'' مجھے پتہ نہیں پاروشنی۔ پر میں سوتے میں یم کتّوں کو دیکھتا ہوں اور وہ تیز دانتوں والے سیاہ جنور مجھے کوئی دُکھ نہیں دیتے، بس میرے سامنے بیٹھ کر بُوتھیاں اوپر اٹھائے روتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ کتے مانا ہی تو بھیجتا ہے''

''کیا پتہ مامن، کیا پتہ۔''

دُھروا نے اپنی ٹھوڑی پر سرسراتے بالوں کو غصّے سے چپکایا ''کیا کہتی ہو؟''

''مامن۔ اگر کوئی بھول چوک میں سورج کی طرف پیٹھ کر لے۔ تو کیا ہوتا ہے؟''

''تو مانا اپنے یم کتّوں کو اُس کے گھر میں بھیج دیتا ہے۔۔۔ تُو نے ایسا کیا؟''

''بھول چوک میں مامن۔'' پاروشنی کے چہرے پر ایک سیاہی پھیلنے لگی۔ دُھروا کچھ چونکا اور پھر مانا کس کسی جانُوں کی طرح یقین کے ساتھ بولا ''تُو لِنگ پر تیل ڈال، اُسے دودھ لگا اپنے ہاتھوں سے اور جو پھُول مل جائیں تو وہ اُس پر رکھ۔''

پاروشنی نے جو سنا، وہ اُسے اچھا نہ لگا۔ اُس کا ماتھا جو پدھرا کھیت تھا اُس پر مینڈھیں سی بننے لگیں'' مجھے جو اور کام کاج نہ ہو تب یہ کرتی پھروں مامن۔۔۔ ہیں مامن۔۔۔ سویرے مجھے اپنے کنوئیں میں سے پانی نکال کر سب کے گھڑے اور جھجھریاں بھرنے ہوتے ہیں۔ اپنے حصّے کی زمین کھودنا ہوتی ہے۔ بڑا پانی آنے سے پہلے اُس میں بیج ڈالنا پڑتا ہے اور پھر کھانے پینے کا اور۔۔۔ جسے اور کوئی کاج نہ ہو وہ یہ سب کرے تو کرے۔۔۔ میں تو۔۔۔

پاروشنی وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

جھیل اور دریا کے بیچ دس کوس کا فاصلہ تھا۔ دو کوس میں رُکھ تھے، دو میں ڈوبو مٹی اور پھر دریا تک کھیت اور کہیں کہیں ٹیلے اور جھاڑیاں۔ بستی سے ذرا ہٹ کر چیوا اور اُس کی بھیڑوں کا چھپّر تھا۔ پاروشنی اب دریا کے قریب آ رہی تھی۔ بستی بائیں بازو پر رہ گئی تھی۔ پیڈی مٹّی پر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کے تلووں تلے بے اَنت روڑے، چھوٹے چھوٹے گیٹے اور ٹھیکریاں پچھلے پہر کی گرمی میں پھُنک رہے تھے۔ کنکر اور چھوٹے چھوٹے پتھر تو اُس راستے کا پتہ دیتے تھے جس پر ایک کوس پرے ہٹنے سے پہلے دریا چلتا تھا مگر ٹھیکریاں پکّی کے آوے کی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے گھڑوں اور صحنکوں کی یہ ٹھیکریاں آوا چڑھانے کے وقت بھانڈوں اور برتنوں کے درمیان رکھی جاتی تھیں تا کہ وہ مُجونہ جائیں اور پھر

بعد میں پکلی انہیں آوے سے دُور یہاں تک پھینک دیتی تھی۔ اُس کے جلتے ہوئے تلووں نے پکلی کو کوسا اور وہ پیّاں بھار اُن جلتی ہوئی ٹھیکریوں پر کم سے کم بھار ڈالتی آگے بڑھنے لگی۔ دریا کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس کی ٹھنڈک میں ایک گرم سانس بھی گھل کر آتا تھا۔ پکلی نے آوا چڑھا رکھا ہے، پاروشنی نے سوچا اور مہاندرے سے مَس ہوتی ٹھنڈی اور گرم باس بدن میں اتارتی منہ کھول کر چلنے لگی۔ اسے اب پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے کُترن کی جھاڑی کی ایک جڑ منہ میں رکھی اور اُسے چبانے لگی۔ یوں پیاس کچھ کم ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی اُسے پکلی کے چھپّر دکھائی دینے لگے۔ اور اب تھکاوٹ نے اُسے بوجھل کرنا شروع کر دیا، اُس نے اپنے بدن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو پاؤں گھسٹنے لگے پر جونہی گرم ٹھیکریاں اُن پر لگیں تو وہ پھر پیّوں پر چلنے لگی۔

پکلی دونوں پاؤں جوڑے، گھٹنوں کے بیچ ایک گیلی اور کچی جھجھر رکھے اُس پر جھکی تھی۔۔۔ اُس کی انگلیوں میں ہاتھ بھر کی ایک سبز ٹہنی تھی جس کا سرا کُوٹ کر نرم کیا گیا تھا۔ وہ اِسے دائیں بازو میں رکھے گیری کے پیالے میں ڈبوتی اور پھر جھجھر پر بُوٹے اُلیکنے لگتی۔ پاروشنی کو اپنے چھپّر کی طرف آتے دیکھ کر اُس نے ٹہنی کو ایک نظر دیکھا اور پھر اسے گھما کر اُس کی جانب پھینک دیا ''یہ تو گیری نہیں چوستی۔ سویرے سے چار جھجھریں خراب ہوئی ہیں۔''

پاروشنی چپکے سے بیٹھ گئی۔

''ٹہنیاں لائی ہو؟''

''بھول گئی'' پاروشنی بولی اور ہتھیلیاں جھجھر کی گولائی پر رکھ دیں۔ گیلی مٹی کی ٹھنڈک اُس کے تلووں تک چلی گئی۔ پکلی کے اُلیکے ہوئے بوٹے اور مورتیں کچی مٹی میں رس بس چکے تھے۔ پکلی انہیں پہاڑی مٹی گیری کو گھول کر بناتی۔ گیری تین رنگ کی ہوتی تھی، کالی، پیلی اور رتی۔۔۔ جھجھر کے پیٹ کی گولائی پر آگے پیچھے مچھلی کے چانے بنے ہوئے تھے، پیپل کے پتّے تھے، ایک رُکھ کی شکل تھی اور اُس پر دو پکھیرو تھے اور ان کے پَر الیکتے ہوئے پکلی کی ٹہنی سے کالی گیری مٹی میں جذب ہونے کے بجائے سارے برتن پر پھیل گئی تھی۔

''پکلی یہ بیل بوٹے تم کیسے اُلیک لیتی ہو؟''

پکلی نے چھپر سے دُور آوے کے گرد بیٹھے اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیز دھوپ اور آگ کی نزدیکی سے بے پروا اُس میں کھر پڑ ڈال رہے تھے۔ سوکھی جھاڑیوں اور لکڑی کے علاوہ آوے میں سُلگانے کے لیے کھر پڑ سے بہتر کوئی ایندھن نہ تھا، یہ وہ گوبر تھا جو کھیتوں اور راستوں پر پڑا پڑا دھوپ سے سوکھ جاتا تھا۔ وہ ایک چھڑی کے سرے پر بندھے پتھر سے سلگتے ہوئے ایندھن سے برتنوں کو ڈھک رہے تھے۔ دریا کی طرف سے ہوا شرلاٹے بھرتی ہوئی آتی اور آوے کے سوراخوں میں داخل ہو کر اُپلوں میں سے گزرتی آگ کے چھوٹے چھوٹے بُلبلے بنا دیتی اور ان کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ جونہی آگ کسی جگہ پر شعلے میں بدلتی تو دونوں بچے فوراً اُسے چھڑی کے ساتھ دبا دیتے کیونکہ برتن بنانے والوں کا کہنا تھا کہ آوا جلے تو گیا اور سُلگے تو بنا۔۔۔ آوا چڑھے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی ورنہ ہوا میں اس کی بُو ہوتی۔

''میں نے کی پوچھا پکلی'' پاروشنی نے پھر کہا۔

''ہاں یہ بیل بوٹے؟ ۔۔۔ یہ بیل بوٹے میرے سر میں نہیں آتے۔ یہ تو ٹہنیوں میں ہوتے ہیں اور آپ ہی آپ جھجھروں۔ صحنکوں۔ چاٹیوں، ڈولوں اور گھڑوں پر بن جاتے ہیں۔''

''مجھ سے نہیں بنتے۔'' پاروشنی نے اپنے سوجے ہوئے پاؤں کو دباتے ہوئے پکلی کی طرف دیکھا۔

''یہ تمہارا کاج نہیں ہے میرا ہے۔'' پکلی ہنس دی۔ اُس کا منہ کھلا تو پاروشنی نے دیکھا کہ اُس کا ایک اور دانت کم ہو گیا ہے۔'' ۔۔۔ جیسے دریا میں پانی ہے اور بیج میں بوٹا ہے ایسے ہی جس کا یہ کاج ہوتا ہے اُس کے پنجر میں یہ بیل بوٹے ہوتے ہیں جو آپ ہی بنتے ہیں۔''

''اور یہ جھجھروں پر مچھلی کے چانے کیوں بناتی ہو؟''

''تجھے بتایا ہے کہ آپ بنتے ہیں۔ اور مجھے تو ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ جو میں بناتی ہوں تو مچھلی کے چانے ہیں، تو نے آج بتایا ہے۔''

''جھجھر اور گھڑے میں پانی ہوتا ہے اس لیے اس پر پانی کے جنور کی مورت بناتے ہیں پکلی''

''تجھے زیادہ سمجھ ہے تو پوچھتی کیوں ہے۔۔۔ کیوں آئی ہے؟''

''جھجھر لینے۔''

''چھپّر کے اندر سے لے آ۔ پکی ہوئی''

دریائی سروٹ اور جھاڑیوں سے بنے ہوئے چھپّر کے نیچے فرش پر پرالی بچھی ہوئی تھی اور اُس پر گیرو سو رہا تھا۔ آہٹ پر اُس نے ایک آنکھ کھولی اور پھر پاسا پلٹ کر سو رہا۔ گیرو کے چار چفیرے پکے ہوئے برتنوں کی پالیں لگی تھیں۔ پاروشنی نے ایک جھجھر اٹھائی پر وہ بھاری لگی اُس میں مٹی زیادہ لگ گئی تھی۔ پھر اُس نے دوسری اٹھائی تو وہ ہلکی لگی، اُسے ہتھیلیوں میں تھامے وہ باہر آ گئی۔

''گیرو سے بھی کام کاج لیا کر۔''

''ماتا نے عورت ذات کو زیادہ زور دیا ہے، زیادہ بُوجھ دی ہے۔ مہامیّا بھی عورت ہے''

پکلی جو ایک صحنک کے درمیان میں بوٹے اُلیک رہی تھی سر اُٹھا کر بولی ''مرد ذات کا کیا ہے، چھوٹے اور بیچ کام کرنا یا بیج ڈالنا بس۔۔۔ تیری طرف چار جھجھریں، تین گھڑے، دو ہانڈیاں، ایک چولہا اور ایک صحنک ہو گئی۔ کنک آنے پر یاد رکھنا'' اور پھر صحنک پر جھک گئی۔

پاروشنی نے پکلی کے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کو دیکھا جو کالے پانی میں ڈوبتی اور صحنک پر چلنے لگتی آپ ہی آپ۔ درمیان میں گھنے رُکھوں کے دو جنور

تھے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے پھنکارتے ہوئے اور ایک بندہ جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے انہیں پکڑے ہوئے تھا۔ ایک جنور کی ٹانگ کو ایک غرّاتے ہوئے کتے نے پکڑ رکھا تھا۔ اس ساری مورت کے آسے پاسے مور اور ستارے بنے ہوئے تھے۔ پکلی نے پہلی ٹہنی کو پھینک کر ایک اور ٹہنی کو اٹھایا اور اُسے اپنے بچے کھچے دانتوں تھلے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر اسے بڑی احتیاط سے کالے پانی میں ڈبو کر صحنک پر بنے ہوئے مور کے پیٹ میں چند لکیریں کھینچیں تو ایک انسانی شکل بن گئی۔

''می آ وں، می آ وں'' رُکھوں کا مور پاروشنی کے اندر بولا۔ وہ جانتی تھی کہ جب پنجر خالی ہو جائے تو اُسے خالی کر دینے والا سانس بیلوں اور موروں میں چلا جاتا ہے اور یہی جنور اُسے دریا کے پار لے جاتے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کنک آنے پر یاد رکھنا''

''پر دیکھ لے چھوٹی جھجھر لے جا رہی ہوں اور اسی کو بھر کر کنک دوں گی۔'' پاروشنی نے لچے بغیر اپنے چوڑے کولہوں پر بڑی آسانی سے جھجھر رکھ لی اور چلنے کو تھی کہ پکلی بولی ''تیرے اندر کچھ ہے؟''

پاروشنی کی آنکھیں کچھ اور سیاہ ہو گئیں ''کیوں پوچھتی ہے؟''

''تیرے کولہے چوڑے ہوتے جا رہے ہیں اور اُن پر لنگی کسی جا رہی ہے اس لیے۔''

''میں ہوں ہی ایسی'' اور اپنا غصہ دکھانے کے لیے ایک پاؤں زمین پر مار کر وہ آوے کی طرف چلنے لگی۔

پکلی کے دونوں بچے پنڈوا اور سکرا اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ آوے کے پیٹ میں پکلی کے بنائے ہوئے برتن ایک خاص ترتیب سے اوندھے رکھے ہوئے تھے اور اُن کے بیچ ٹھیکریاں اور راکھ بھری ہوئی تھی۔ برتنوں کے علاوہ بچوں نے اپنے کھیلنے کو مٹی کی بیل گاڑیاں بنا کر آوے میں رکھی ہوئی تھیں۔۔۔ کچھ چھوٹے چھوٹے عجیب مہاندروں والے بُت تھے اور کچھ منکے بھی تھے۔ پنڈوا اور سکرا اپنے میں ایسے گم تھے کہ اُنھوں نے اپنی طرف آتی پاروشنی کے پاؤں تو دیکھ لیے پر سر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھ پائے۔ سلگتے آوے کا دُھواں آسمان کو جاتا تھا۔

''مہامیّا کوئی مورتی نہیں پکائی؟''

''نہیں، وہ پکلی آپ بناتی ہے اور پھر آپ ہی پکاتی ہے'' جانے اُن میں سے کس کے جھکے ہوئے سر میں سے آواز آئی۔

پاروشنی نے کھسکتی جھجر کو ذرا اوپر کر کے کمر کے ساتھ لگایا اور دریا کی طرف چلنے لگی۔

اِدھر اُدھر بکھری پکلی کے آوے کی ٹھیکریاں اب اتنی گرم نہ تھیں۔ آدھ کوس چلنے کے بعد اُس کے سامنے سروٹ اور کاہی کے سرسراتے جھنڈ کی ایک دیوار آئی اور وہ بلا جھجک اُس میں داخل ہو گئی۔ ایک رینگتا ہوا کِھوا اُس کے پاؤں کی آہٹ پر زمین کے ساتھ لگ کر پتھر ہو گیا۔ سروٹ کے باریک اور تیز دھار کے پتے پاروشنی کی باہوں پر زبانیں رکھنے کی کوشش کرتے جاتے اور کبھی کبھار اُس کے منہ سے درد کی ایک ہلکی سی چیخ نکلتی جب یہ پتے اُس کی باہوں پر سرخ لکیر کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ پر وہ اپنے چوڑے نتھنوں میں نمی کی باس اُتارتی جاتی تھی اور سروٹ کے پتّوں کی کاٹ سے لاپرواہ جھجھر کو تھامے اور دوسرے ہاتھ سے سروٹ کو آسے پاسے ہٹاتی چلتی جاتی تھی۔ اُس جھنڈ میں اور کوئی نہ تھا اور اُس کے چلنے سے جو سرسراہٹ پھیلتی تو وہاں آرام کرتے پکھیرو یکدم پھڑ پھڑ کر اُڑنے لگتے۔ وہ اونچے سروٹوں میں سے نکلی تو گھنی جھاڑیوں میں سے ریتلی زمین کے ٹکڑے نظر آنے لگے۔ جھاڑیوں کے خاتمے پر وہ رُکی۔ اُس کے قدموں میں بچھی زمین دھیرے دھیرے اونچی ہو کر ایک ٹیلے کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ آسمان اس کی آنکھوں کے برابر تک جھکا تھا۔ وہ جھکی اور جھجھر کو سنبھالتی ہوئی ایک بھُر بھری ڈھیم اٹھا کو پورے زور سے گھما کر ٹیلے کے پار پھینک دی۔ وہ ایسے ہی تھمی رہی جھجھر پر ہاتھ رکھے، سانس روکے اور۔۔۔ دُور ایک ہلکی سے چھپاک پھیلی، ڈھیم دریا میں گری تھی۔ وہ یہاں سے نظر نہ آتا تھا پر وہاں موجود تھا۔ اس چھپاک کی آواز سے اتنے کوسوں کی تھکان نے اس کے پنڈے کو یکدم چھوڑ دیا اور وہ ہلکی اور بے تھکن ٹیلے پر چڑھتی گئی۔ اُس کی نظروں کے آگے آسمان نیچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اُس کی نیلاہٹ پانی کی ایک لکیر میں چلی گئی۔ یہ گھاگرا تھا۔

وہ پاؤں سنبھالتی ٹیلے سے اُتری اور کنکروں کی گرم تہہ پر چلتی دریا کے کنارے تک آ گئی۔ اُس نے جھجھر کو زمین پر رکھنے کی کوشش کی تو وہ ایک پاسے لڑھک گئی۔ اُس نے چند ٹھیکریاں جمع کیں اور اُن کی ٹیک بنا کر جھجھر کو اُن پر ٹکا دیا۔ پانی کو پیاس سے دیکھتے اُس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر کسا ہوا لیڑا ڈھیلا کر کے کھول دیا، لیڑے کی پکڑ سے چھوٹنے پر اُس کی چھاتیاں پل دو پل کے لیے ایسے تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کی پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھ جائے تو وہ ہلتی ہے۔ تھرتھرائیں اور پھر اپنے بوجھ کو سہار کر پنڈے کا ایک خاموش حصہّ بن گئیں۔ دریا کی باس کو اُن کی اٹھان نے ایک ناک کی طرح سونگھا اور اپنے اندر رچایا۔ بستی کی ساری عورتیں اپنے اوپر والے حصے کو نہیں ڈھکتی تھیں، صرف وہ جو بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے ڈھیلی پڑ چکی تھیں یا وہ جنہیں چلتے پھرتے اُن کے بوجھ کی وجہ سے اُنہی پر تھکان ہو جاتی تھی ایسا کرتی تھیں۔ پاروشنی پر بوجھ بہت تھا۔ پھر اُس نے لونگی کے لڑ کھولے، ہاں وہ بہت کسی ہوئی تھی، اُس نے کولہوں کے گرداگرد ہاتھ پھیرا تو ماس یوں دبا اور ابھرا ہوا تھا جیسے رات اُس حصے پر کوئی زہریلا برساتی کیڑا چل گیا ہو۔ اُس نے لونگی اُتار کر جھجھر کے ساتھ ٹھیکریوں پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

پاروشنی اپنی نسل کا خاص قد بُت لیے ہوئے تھی۔ ہلکا سیاہی مائل

رنگ، گھنگھریالے اور بھورے بال جو ایک سُتھرے گھونسلے کی طرح سر پر رکھے
ہوئے تھے بھنویں اُوپر کو اٹھی ہوئیں، ناک چوڑی مگر اونچی، جبڑا ذرا آگے کو نکلتا
ہوا جیسے بھُو کے جنور کا ہوتا ہے، قد بُت ایسا کہ کنک کی فصل میں چلتے ہوئے پہلی
نظر پر دکھائی نہ دے اور سرونٹوں میں گم ہو جائے۔ ہونٹ موٹے اور بھرے
بھرے اور کولہے پھنیر سانپ کے پھیلے ہوئے پھن کی طرح۔ اُس نے پہلا قدم
پانی میں رکھا جو جھجکتے ہوئے رکھا اور پھر اس کے پاؤں اُس میں ایسے اٹھنے لگے
جیسے وہ عام زمین پر چلتی ہو۔ دس بارہ کرو کے بعد پانی ذرا گہرا ہونے لگا اور وہ
اسے اپنے پنڈے پر چڑھتے اور ٹھنڈک اُتارتے محسوس کرتی آگے ہوتی گئی۔
وہاں اتنا پانی تھا کہ وہ اگر بیٹھ جائے تو گردن تک آئے اور اُس میں اپنے آپ کو
دھو سکے تو وہ اس میں بیٹھ گئی۔ اس نے ناک پانی پر رکھی اور پھر سارے چہرے کو
پانی میں ڈبو کر اُسے جھٹکتی اور آنکھوں کو زور زور سے بھینچتی رہی۔ یوں اس نے
چہرہ دھویا۔ اب اُسے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے آنکھیں پانی کے برابر لا کر
دریا کو دیکھا جو پہاڑ پاسے سے بہتا آ رہا تھا۔ پانی بچھا ہوا برابر تھا۔ کہیں جھاگ
نہیں تیرتی تھی جو یہ بتاتی کہ اُدھر مینہ اُتر رہا ہے۔ پانی میں سے کسی پہاڑی بُوٹے
کے ڈنٹھل پتے نہ اُبھرتے گم ہوتے تھے جو یہ پتہ دیتے کہ اُدھر آس پاس کا پانی
دریا میں داخل ہو رہا ہے۔ پاروشنی نے گردن کو بل دے کر اپنا دایاں کان بہاؤ
کے قریب کیا اور سُنا، دریا خاموش تھا بول نہیں رہا تھا جو معلوم ہوتا کہ بڑے پانی
آنے کو ہیں۔

اس بار بڑے پانی کو دیر ہو گئی تھی۔

اُس نے سنا تھا کہ بہت پہلے بستی کے بچاؤ کے لیے دریا کے ساتھ
ساتھ ایک دیوار بناتے تھے اور پھر بھی پانی ادھر سے چلتا ہوا، کھیتوں میں سے ہو
کر، ڈوبو مٹی میں سے اور رُکھوں میں سے بہتا جھیل تک جاتا تھا اور اُسے پھر سے
اُس کی ناک تک بھر دیتا تھا۔ اُن دنوں کھدائی اور بوائی بعد میں کی جاتی تھی۔ پھر
اُس کی ہوش میں ایسا نہ ہوا تھا۔ اب تو دریا اتنا نیچے ہو گیا تھا کہ اس کے کنارے
ٹیلوں کی شکل میں خود ہی دیوار بن گئے تھے اور بڑا پانی آتا تو کھیتوں پر ایک دو
پوٹے مٹی بچھا کر اُسی وقت الٹے پاؤں دریا کو لوٹتا جیسے اُس کی مدد کو واپس جاتا ہو۔

پاروشنی کے اوپر پانی کے دو پرندے ہوا میں جیسے ٹھہرے ہوئے
تھے۔ وہ بھی جیسے بہاؤ کو سُنتے تھے پر وہ تیز آواز میں بولتے جاتے تھے۔

ٹیلے سے پرے سرونٹوں کی اوٹ میں سے دھکڑ دھکڑ سی آوازیں
آنے لگیں اور ساتھ میں ماتی کے پتروں کی خوشی کا شور مچاتی چیخیں اُس تک
پہنچیں۔ وہ زمین کھودنے کے بعد اپنی بیل گڈ پر بستی کو لوٹ رہے تھے اور بے
چارے بیلوں کو گُوٹ گُوٹ کر بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ عجیب بات ہے،
پاروشنی نے ٹھنڈک سے بدن پر اُبھرتے روئیں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے سوچا، اگر
بیل کا کوہان نہ ہو تو وہ پوتر سمجھا جاتا ہے اور ساری حیاتی باڑے میں بڑا چین سے
جگالی کرتا ہے اور اگر اُس کا کوہان ہو تو بے چارے کو گڈ میں جوت کر مارتے
مارتے ادھ موا کر دیتے ہیں۔۔۔ دھکڑ دھکڑ کی آوازیں دُور ہو رہی تھیں اور
ہولے ہولے دُور ہو گئیں۔ سرونٹوں کے اوپر دھول اُٹھ رہی تھی۔ پاروشنی نے
ایک بار پھر پانی کے بہاؤ پر اپنا کان لگایا اور اُدھر دیکھا جدھر سے جھاگ آیا کرتی
تھی اور جدھر سے دریا کے بولنے کی آواز آنی چاہیے تھی۔۔۔ بڑا پانی دیر سے
آئے گا اور ہم اپنی زمینیں کھود چکے ہیں۔ یہ دریا کہاں سے آتا ہے؟ کدھر جاتا
ہے؟ اور کب تک آتا رہے گا؟۔۔۔ اُس نے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا
جو اُبھرے ہوئے ٹاپوؤں سے پرے چند ٹیلوں اور لکیر کی شکل میں کچھ کچھ دکھائی
دیتا تھا اور اُس کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔ مور اور بیل تمہارے پنجر میں
سے نکلنے والے سانس کو دوسرے کنارے پر پہنچاتے ہیں۔

رُکھوں والا مور پھر اُس کے ٹھُڑتے جُسّے کے اندر جہاں ابھی
سانس تھی بولا ”می آؤں می آؤں۔“

”سوہنا مُنڈا“

ایک سوہنا مُنڈا سیاست کی دنیا میں گزر رہا ہے جس کا نام عبدالحفیظ پیرزادہ ہے۔ پیرزادہ کو یہ خطاب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے دیا تھا۔ دوسرا سوہنا مُنڈا اُردو ادب میں مستنصر حسین تارڑ ہے۔ اب یہ نام تارڑ کو کس نے دیا یہ بتانا مشکل ہے۔ آپ چاہیں تو اسے میرے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں۔ تارڑ جتنا خوبصورت آپ ہے اُس سے زیادہ خوبصورت تحریریں لکھتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی خوبصورتی کو غلط طریقے پر کیش کرا رہا ہے۔ ویسے میرے خیال میں اگر وہ ایسا کرے بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ اور نواب تو ایک بات پر خوش ہو کر جاگیر اور جائیداد بخش دیا کرتے تھے جبکہ تارڑ نے تو اتنی بے شمار خوبصورت کتابیں لکھی ہیں کہ اُسے تو جائیداد نہیں بلکہ کئی ملک بھی تحفے میں دیے جائیں تو شاید اُس کا حق ادا نہ ہو۔ میرے لیے تو یہی بات اطمینان کا باعث ہے کہ تارڑ کے ہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ آ رہا ہے اور اس کی تحریریں سنجیدہ حلقوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں اور یہی میرے خیال میں تارڑ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ممتاز مفتی

''شالا پردیسی تھیوے''

کرنل محمد خان

(●)

مصنف عموماً اپنی پہلی کتاب پر دوسروں سے دیباچہ لکھواتے ہیں کہ قارئین سے تعارف بھی ہو جائے اور زبانِ غیر سے اپنے مخفی محاسن بھی آشکار ہو جائیں۔ بعد کی کتابوں پر دوسرے لوگوں کے دیباچوں اور مقدموں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی فارمولا علامہ اقبال نے برتا اور بے شمار ماد شما قسم کے مصنفین نے بھی لیکن مستنصر حسین تارڑ اس قاعدے کے الٹ چلے ہیں۔ انہوں نے اپنے پہلے سفرنامہ کا دیباچہ خود لکھا اور کسی بیرونی سفارش یا دباؤ کے بغیر اپنے گُن گوائے اور گنوائے۔ اب ان کے دوسرے سفرنامے پر ایک غیر کے لیے کچھ مقدمۂ لکھنا گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک لاطائل کوشش ہے کہ مستنصر کی دی ہوئی تاب میں کسی مزید تاب کی گنجائش نہیں اور ادھر میری مشاطگی بالکل محدود بلکہ مفقود ہے۔

چند سال ہوئے میں نے پہلے مستنصر حسین کا سفرنامہ ''نکلے تری تلاش میں'' پڑھا اور پھر مستنصر سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر خوبصورت پایا اور یہ اسی دوہرے حسن کا رُعب ہے کہ جب مجھ سے موجودہ سفرنامے کا دیباچہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے چاروناچار فی الفور لبیک کہا۔ حالانکہ دیباچہ لکھنا تو درکنار، مجھ سے کوئی گرد پوش کے لیے چند سطور لکھنے کو کہے تو مہینوں روپوش رہتا ہوں کہ سچ مچ لکھنی ہی نہ پڑ جائیں۔ میرا دیباچہ نویسی کا خانہ یکسر خالی ہے۔

مستنصر کا نیا سفرنامہ مجھ تک کتابی شکل میں نہیں، اجزا کی صورت میں پہنچا۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ گویا اسے صحیح معنوں میں پڑھا نہیں، صرف چکھا ہے اور چکھنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کی لذت پہلے سفرنامے سے کسی طور کم نہیں۔ عین ممکن ہے کہ اُندلس کے تمام تر سفر میں ان کے ساتھ گھومتا تو اس کتاب مستطاب کی کئی خصوصی لذتوں سے آشنا ہوتا۔ بہر حال ''اُندلس میں اجنبی'' پڑھنے کے بعد ایک بات طے ہے کہ جوں جوں مستنصر کا قدم جوانی سے کہولت کی طرف بڑھتا ہے، اس کی تحریر جوان تر ہوتی جا رہی ہے اور ایک مصنف کی آبرو یا عظمت اس کی تحریر کی جوانی ہے جو لازوال ہے نہ کہ اس کا اپنا شباب جو بہر حال ناپائیدار ہے۔ (خدا مستنصر کا شباب تا دیر قائم رکھے۔)

ادب میں آج کل سفرناموں کا فیشن بہت چل نکلا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے لیے تخلیقی کرب میں ڈوبنا پڑتا ہے نہ بحرِ علم میں شناوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس سوئی کے جس ناکے سے مسافر گزرا، اسی سے قاری کو بھی گزار دیا اور سفرنامہ بن گیا۔ بعض چلتے پھرتے لوگ سفر کو اس لیے بھی موضوع سخن بناتے ہیں کہ اس میں اہل وطن کی نظروں سے دور، اجنبی دیار میں موضوع کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ نتیجتاً سفرنامہ کم اور مزاح پارہ زیادہ بن جائے تو اسے گھاٹے کا سودا نہیں سمجھا جاتا۔ بحیثیت مزاح نگار میرا اپنا طریقۂ واردات بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس کے برعکس زمانۂ قدیم کے سفرنامے پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے انسان تاریخی اور جغرافیائی کھنڈروں سے گزر رہا ہو اور مسافر راستے کی ہر سرائے اور کنوئیں پر علم کے انبار لگا کر اعلان کر رہا ہو کہ ''لو بیٹا، جتنا ہضم کر سکتے ہو، کر لو اور باقی آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دو''

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگھم ہیں۔ ان میں پرانے سفرناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔ اس کا قاری بیک وقت ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستنصر تاریخ کا سہارا لیتا ہے اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں اختلاف رائے ممکن ہے کہ خود مورخین میں اختلاف ہے لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستنصر کا مشاہدہ کھرا، خالص اور ناقابلِ دید ہے۔

مستنصر ان سیاحوں میں سے نہیں جو جمبو جیٹ میں بیٹھ کر مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں یا ایک ''اے کلاس'' ہوٹل سے دوسرے ''اے کلاس'' ہوٹل میں شب بسری کو سیاحت کا نام دیتے ہیں۔ مستنصر دھرتی کے ساتھ چلتا ہے۔ لغوی معنوں میں بھی اور استعارتاً بھی۔ وہ آپ کو قریہ قریہ، نگری نگری، کوچہ کوچہ پیدل چلتا یا مقامی بس یا ریل میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں آنے والے انسان ہیں۔ دھرتی پر چلنے پھرنے والے عام انسان! ان میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، حسین بھی اور کریہہ بھی، عظیم بھی اور حقیر بھی۔ وہ ان میں سے کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ کسی کو اپنے طنز یا تضحیک کا نشانہ نہیں بناتا۔ اس کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ اسے دھرتی کے تمام باشندے ایک ہی برادری کے بکھرے ہوئے فرد لگتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ کولہو کا بیل ہے جس کے کندھے پر ''پنجابی'' اور آنکھوں پر ''کھوپے'' ہیں اور وہ زندگی کے شب و روز ایک جانکاہ ڈگر پر گزار رہا ہے۔ چنانچہ وہ بقول خویش ''رسّے تڑا کر'' ملک سے باہر بھاگ نکلتا ہے لیکن دیارِ غیر میں پہنچ کر، خواہ وہ کتنے ہی ''گلشرے'' اڑا رہا ہو، اسے ہر وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل کے تار ارضِ وطن سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ظاہر کی نگاہ غرناطہ پر ہوتی ہے لیکن باطن کی آنکھ لاہور پر۔

مجھے مستنصر کے سفرناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے، وہ

ان کی فضا ہے۔ وہ دلربا سی نیم اداس فضا۔ نیم اداسی جو مستنصر کی نشیلی آنکھوں میں ہے اُس کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اُداس فضا جس میں غم کے گہرے بادل ہیں، نہ خوشی کی چمکدار دھوپ۔ بس دونوں کے بین بین رومانیت کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر، ریشمی سی اداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دُنیا کو فتح کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف دنیا دیکھنے اور اہل دنیا کا تماشہ کرنے کی آرزو ہے۔

اس آوارہ گردی میں جو مقامات اور شخصیات مستنصر کے مشاہدے میں آتی ہیں وہ اتنی غیر معمولی نہیں ہوتیں کہ اس کی روداد کو امتیاز بخشیں۔ جو چیز اس کی تحریر کو پرکشش اور لازوال بناتی ہے وہ اس کا خوبصورت انداز بیان ہے۔ بعض حصے تو اس قدر چلبلے اور شگفتہ ہیں کہ یہ شخص اگر سارا سفر نامہ اسی انداز میں لکھتا تو ہمارا امزاح کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔

دعا کہ مستنصر بکثرت ''شالا پردیسی تھیوے'' تاکہ اردو ادب میں حسین و جمیل سفر ناموں کا اضافہ ہوتا رہے۔ یہ دنیا مستنصر جیسے لوگوں ہی کے دم سے حسین ہے۔ وہ ملک، وہ شہر کس کام کا جہاں کم از کم ایک مستنصر حسین تارڑ نہ ہو۔

ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد

''روشنی کی تلاش''

''خس وخاشاک زمانے'' تارڑ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے بغیر اردو ناولوں پر گفتگو ممکن ہی نہیں ہے۔ اپنے ناول نگار دوستوں سے مخاطب ہوں جو افسانوں اور ناولوں میں تجربوں کا دم بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تجربہ تو ہونا ہی چاہیے، مگر زیادہ تر لوگ تجربہ تب کرتے ہیں جب ان کے پاس وہ فن یا ہنر نہیں ہوتا۔ جو مکالمہ نگاری پر قدرت رکھتا ہو، جہاں کردار نگاری کا جال بچھایا جاتا ہو۔ جہاں ایک کہانی صدیوں پر محیط فکر و فلسفے کا نیا باب روشن کرتی ہو۔۔۔ مستنصر حسین تارڑ کو پڑھتے ہوئے ایک وسیع دنیا آباد ہے۔۔۔ کیا ایسی کردار نگاری وہ لوگ کر سکتے ہیں جو صرف تجربے کا دم بھرتے ہیں؟ میرا جواب ہے نہیں۔۔۔ کیونکہ یہاں ہوا یا خلا میں معلق تحریر نہیں ہے۔ یہاں زندگی کو پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ جو زیادہ مشکل کام ہے اور جنہیں یہ ہنر نہیں آتا وہ تجربے سے کام چلاتے ہیں۔ ادب محض لفظوں کی بھول بھلیاں کا نام نہیں۔۔۔ یہاں منہ میں چھالے اگانے ہوتے ہیں۔ لہو تھوکنا پڑتا ہے۔۔۔ زندگی قربان کرنی ہوتی ہے۔۔۔ اور مستنصر حسین کی طرح زندہ کرداروں سے نئے فلسفوں کی دھوپ چرانی ہوتی ہے۔ سارتر کا ایک کردار اپنی کہانی دیوار میں ایک سوراخ کے بہانے موہوم سی روشنی کا طلبگار تھا۔ صدیوں پر محیط ناول ''خس و خاشاک زمانے'' میں تارڑ آزادی اور غلام فضا دونوں ایام میں اسی روشنی کو تلاش کرتے رہے۔ وہ بونے تو نظر آئے جو کنویں کی گہرائیوں سے نکل کر بخشتے کو تقسیم کا خوف دکھا رہے تھے۔ لیکن ایک تقسیم کے بعد بھی تقسیم کا سلسلہ بند کہاں ہوا۔ ہندو پاک کے ڈراؤنے خواب سے نکل کر یہ داستان سقوط بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، عراق کے پس منظر میں جب اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دکھاتی ہے، تو ارتقا، سائنس اور تیزی سے بھاگتی نئی دنیا کا خوف ذہن و دل پر طاری ہوتا ہے۔ تارڑ کے پاس لفظیات کا خزانہ ہے۔ ہزاروں مثالیں، تشبیہیں ایسی ہیں جو اس سے پہلے مغرب کے کسی ناول کا حصہ بھی نہیں بنیں۔ یہاں کچھ بھی مغرب سے مستعار نہیں، یہاں داستانی رنگ ہے۔ اور ذلیل ہونے کے لیے ہماری آپ کی خوفناک منتظر۔۔۔ ہزاروں کرداروں کو تارڑ نے اس فنکاری سے سمیٹا ہے کہ یہ کام نہ فاروقی کے بس کا تھا، نہ کسی اور کے۔ میں نے آگ کا دریا دوبار پڑھا ہے۔ اور ان لوگوں سے معذرت کے ساتھ جو ادبی صحیفے کو پڑھتے نہیں، پرستش کرتے ہیں۔۔۔ کہ یہ ناول آگ کا دریا سے بھی میلوں آگے کی چیز ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پاکستان میں جہاں بیکار کے ناولوں پر مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ اس ناول پر آفاقیت اور عالمگیریت کے حوالے سے گفتگو کے دروازے کیوں نہیں کھلے۔ ایک ناول نگار کی حیثیت سے مستنصر کو غیر معمولی زبان، اسلوب اور لہجے کی ضرورت تھی، تارڑ کے پاس یہ خزانہ موجود تھا۔ یہ ناول اردو زبان کے لیے ایک کرشمہ ہے۔ اس ناول کی آمد سے ہماری زبان کے قد اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

مشرف عالم ذوقی

''اندلس میں اجنبی''

ڈاکٹر وزیر آغا

(●)

مستنصر حسین تارڑ جب ایک طویل آوارہ خرامی کے بعد بالآخر ہسپانیہ پہنچے تو انہوں نے خود کو اس سرزمین پر ایک اجنبی کی حیثیت میں پایا، بعینہٖ جیسے راشد جب ایران گئے تو انہوں نے خود کو ایک اجنبی کے روپ میں دیکھا تھا۔ راشد کے احساس کو تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ فارسی زبان سے آشنا ہونے کے باوصف بولنے کی زبان سے شاید آشنا نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے شروع شروع میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کیا ہوگا۔ مگر مستنصر کو تو اس دقت کا سامنا نہیں تھا۔ بے شک جب وہ ہسپانیہ پہنچے تو خاکروب کی بات کو سمجھنے کے لیے انہیں ہسپانوی انگریزی ڈکشنری کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑی تھی یا جب وہ بس میں ایک حسینہ سے مصروف کلام ہوئے تو بے بس ہو کر زبانِ یارِ من کو سمجھنے کے لیے گائیڈ بک سے مدد لینے پر بار بار مجبور ہوئے مگر یہ مواقع تو کبھی کبھار ہی آتے تھے ورنہ جس طرح بُل رنگ میں بیٹھ کر انہوں نے ہسپانیہ والوں کی گفتگو میں بے تکلف شرکت کی۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہسپانوی زبان اگر ان کی مادری زبان نہیں تو کم از کم ایک رشتہ دار قسم کی زبان ضرور تھی۔ پھر جب ایک بار زبان کی دیوار باقی نہ رہی تو وہ ہسپانیہ والوں سے یوں گھُل مل گئے وہ انہیں جنم جنم سے جانتے تھے حتیٰ کہ وہ ان کے کھانے، نہانے اور گانے تک میں شریک ہو کر من تُو شُدی کی ایک منہ بولتی تصویر بن گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ہم آہنگی ثقافتی اور تہذیبی اشتراک کے بعد انہوں نے خود کو ہسپانیہ میں اجنبی کیوں محسوس کیا؟

میرے خیال میں اس اجنبیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ مستنصر گئے تو ہسپانیہ کی سیاحت کے لیے تھے لیکن وہ درپردہ اُس سرزمینِ اُندلس کی تلاش میں تھے جو ان کے اپنے نہاں خانۂ دل میں آباد تھی۔ وہ دراصل ایک ایسے ادھ جلے ورق کے متلاشی تھے جسے زمانے کی ہوا نے کتاب زندگی سے پھاڑ کر فضا میں اُچھال دیا تھا مگر جس کا نقش ان کے اپنے دل پر کندہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دل کے اس نقش کا ادھ جلے ورق کی تصویر سے موازنہ کریں اور لرزہ براندام تھے کہ اگر اس موازنے میں کوئی گھپلا ہو گیا تو ان کا وہ خواب بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گا جسے انہوں نے بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ گویا مستنصر نے ہسپانیہ کے طویل ماضی کی برفاب سِل سے ایک قاش سی کاٹ لی تھی۔ جو مسلمانوں کے قیامِ اندلس کی یادگار تھی وہ اب اس قاش کو اپنے سینے سے لگائے پھرتے تھے جبکہ ہسپانیہ والوں کے لیے ماضی کی اس قاش کا قطعاً کوئی مفہوم نہ تھا اور وہ اسے اپنے اجتماعی لاشعور کی تاریک ترین تہوں سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کوشاں تھے۔ بس یہ وہ ذہنی اور جذباتی خلیج تھی جو مستنصر اور ہسپانیہ والوں کے درمیان مُنہ کھولے آن کھڑی ہوئی تھی اور جسے عبور کر جانا نہ تو اہلِ ہسپانیہ کے لیے ممکن تھا اور نہ مستنصر کے لیے! مستنصر نے ماضی کے ادھ جلے ورق کو محض آثارِ قدیمہ یا باقیاتِ مسلمانانِ اندلس ہی میں تلاش نہ کیا بلکہ اسے ہسپانیہ والوں کی زبان، رسوم، عقائد حتیٰ کہ ان کے جسموں کی ساخت، لہجہ کی شیرینی اور لہو کے رنگ میں بھی ڈھونڈا۔ مگر وہ اس سے ایک قدم آگے بھی گئے۔ جب کوئی کارواں گزر جاتا ہے تو ٹوٹی ہوئی طناب اور راکھ کے ڈھیر کے علاوہ اپنی کچھ اور نشانیاں بھی چھوڑ جاتا ہے اور یہ نشانیاں مٹی میں مل کر گل و گلزار کی صورت میں صدہا سال تک درشن دیتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جب مستنصر کو کھجور کے درختوں میں بھی مسلمان فاتحین کے چہرے دکھائی دینے لگے تو پھر ان کے اور اہلِ ہسپانیہ کے درمیان احساسِ خلیج کا ناقابلِ عبور دکھائی دینا لازمی تھا مستنصر جہاں بھی گئے انہوں نے ہسپانیہ والوں کو اسلامی عہد اور اس کی علامات سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پایا جب کہ خود مستنصر ان سب علامات اور نشانیوں پر سو جان سے فدا تھے۔ محبت اور نفرت کی اس کش مکش میں مستنصر حسین یوں کھڑے تھے جیسے گندم چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان پڑی ہو۔ آخر آخر میں یہ کش مکش شاید ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ چنانچہ وہ ایک روز آہستہ سے اُٹھے اپنا سفری تھیلا اٹھایا اور سرزمین ہسپانیہ سے باہر آ گئے۔ ایک اجنبی کی طرح! یا شاید اُس بُل کی طرح جسے بار سلونا میں ذبح کیا گیا تھا اور جسے خچر گھسیٹ کر بل رنگ سے باہر لے گئے تھے۔

آخر میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ سفرنامے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم تو اس روایتی سفرنامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کے جغرافیہ کو بیان کرتا ہے۔ موسم کا حال، میدانی اور پہاڑی مناظر، آدابِ معاشرت، حاکم وقت کے خدوخال اور اگر وہ بیسویں صدی کا سفرنامہ نگار ہے تو غسلخانوں اور ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلّت یا فراوانی اور ہر قسم کے شکار کی جملہ تفاصیل اپنے سفرنامے میں سمیٹ لیتا ہے۔ دوسری قسم اُس سفرنامہ کی ہے جس میں سفرنامہ نویس جغرافیہ کے بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سُنے سنائے قصّوں کے اظہارِ مکرر میں لطف محسوس کرتا ہے۔ سفرنامے کی ایک اور قسم وہ ہے جو گیت مالا سے گہری مماثلت رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح گیت مالا میں گیت پروئے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح سفرنامہ لکھنے والا اپنے سفر کی ڈور میں سچی جھوٹی کہانیاں پروتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے سفر کرنے والے کو قدم قدم پر کسی نہ کسی واقعہ سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جس میں وہ خود ایک خُدائی فوجدار کا کردار ادا کرتا ہے۔ مگر مستنصر حسین تارڑ نے سفرنامے کی جس روایت کو توانائی بخشی ہے اس میں دو کردار اُبھرتے ہیں۔ ایک سفر کرنے والے کا کردار۔ دوسرا اس ملک کا کردار جس کی وہ سیاحت کرتا ہے۔ یوں سفرنامہ دو کرداروں کے

درمیان ایک عجیب سے ذہنی اور جذباتی تصادم کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ مستنصر کے سفرنامے میں یہ تصادم فراق اور ملن کی دھوپ چھاؤں میں ڈھل کر کچھ یوں ابھرا ہے کہ کبھی تو مستنصر خوش ہو کر فریقِ مخالف سے بغل گیر ہو گئے ہیں۔ اور کبھی ناراض ہو کر اس سے دُور ہٹ گئے ہیں۔ جسم کی سطح پر تو ہسپانیہ کی کشش ان پر غالب آئی ہے لیکن ذہنی اور خواب کی سطح پر وہ سرزمین اندلس کی طرف کھنچتے چلے گئے ہیں۔ ان کے اجنبیت کے احساس کا ایک نفسیاتی سبب شاید یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت دو زمانوں میں رہنے کی کوشش میں ہیں یعنی محض حال یا محض ماضی میں رہنے کے بجائے ایک ایسے مقام پر کھڑے ہو گئے ہیں جہاں حال نے ماضی کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ یوں مستنصر نے سفرنامہ نگاری کے سلسلے میں ایک سچے سیّاح کے رویّے کو پیش کیا ہے نہ کہ اُس مسافر کے رویّے کو جس کے سر پر زرِمی فورم، کی تلوار ہمہ وقت کھنچی ہوتی ہے اور جو کم سے کم وقت سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کے سوا اپنے سامنے کوئی اور مقصد نہیں رکھتا۔

بہاولپور

۲۶۔اگست ۱۹۸۳ء

بہت پیارے مستنصر،

تمہارا خوبصورت تحفہ موصول ہوا۔

میں اسے یقیناً لطف و مسرت سے پڑھوں گا اور کیوں نہ رشک مجھے آئے گا؟ ''خانہ بدوش'' کے جو حصے رسالوں میں چھپتے رہے ہیں، میں باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ اچھے ہی نہیں تھے، بہت ہی اچھے تھے۔ سچی لگن اور شب و روز کی محنت نے تمہیں ایک بڑا فنکار بنا دیا ہے۔ جس پر ہم فخر کرتے ہیں لیکن تم میں اور یجنل ٹیلنٹ نہ ہوتی تو شاید کچھ بھی حاصل نہ کر پاتے۔

جیو اور اتنی ہی، بہت سی اچھی کتابیں اور لکھو۔۔۔ اور یقیناً تم لکھو گے۔ اور تمہارا قلم نہیں تھکے گا۔

اگر کبھی موج اٹھی تو میں ''خانہ بدوش'' پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ (گو لکھنے کو تقریباً خیرباد کہہ چکا ہوں اور ''لفظ کے ساتھ لفظ'' جوڑنے کے خیال سے ہی ہول آتا ہے۔ ابھی تو میں تمہاری کتاب کے مزے لوں گا۔ اس سے فرحت اور خوشی کی گھڑیاں ''محفوظ'' کروں گا)۔

میں بھی پرسوں تیسرے روز ہی تھرپارکر (سندھ) کی صحرائی وادیوں سے لوٹا ہوں۔ دو روز ایک صحرائی شہر اسلام کوٹ میں ایک ہندو دوست کا مہمان رہا جس نے سمگل شدہ ڈیوک سے تواضع کی۔ اسلام کوٹ ایک سرحدی گاؤں ہے اور ۷۱ء کی جنگ میں ہندوستانی ہراول دستے اس سے پندرہ میل آگے تک بڑھ آئے تھے۔ آبادی ہندوؤں کی ہے۔۔۔ ایک فنٹاسٹک جگہ ہے اسلام کوٹ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک رائڈر ہیگر ڈ ایڈونچر میں گزر کر لوٹا ہوں۔ تم نے اگر مزید سفرنامے لکھنے سے بالکل توبہ نہیں کی تو میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس بہت ہی Faciniting صحرا میں ہو آؤ اور ایک ہفتہ اسلام کوٹ میں دھرم داس (جو میرے دوست کا نام تھا) کے مہمان ٹھہرو۔ تم پھر ایک حقیقتاً ونڈرفل سفرنامہ لکھ سکو گے۔ (جو ہمیشہ تھر کے صحرا کی طرح سرسبز رہے گا۔) ہم بارشوں کے موسم میں اس صحرا میں گئے۔ ریت کے اونچے ٹیلے سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے اور بعض وقت مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں انگلستان کے ایک Lake ڈسٹرکٹ میں سفر کر رہا ہوں۔ نگر پارکر (رن آف کچھ) ہم وقت کی کمی کی وجہ سے نہ جا سکے۔

''خانہ بدوش'' ختم کرنے کے بعد تمہیں لکھوں گا۔ ستمبر کی نو، دس تک غالباً میں کراچی جاؤں جہاں بیوی بچے میری راہ دیکھ رہے ہیں۔ گیا تو دو تین ماہ وہاں ٹھہروں گا ہی۔

Carry-on, Maedipp. & Good luck

محمد خالد اختر

''کیا تاریخ نقلی بھی ہوتی ہے''

منشایاد

(●)

مستنصر حسین تارڑ کا شمار ملک کے معدودے چند فل ٹائم اور بیسٹ سیلرز مصنفین میں ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی لائبریری میں چلے جائیں جو کتابیں سب سے زیادہ میلی اور خراب حالت میں ہوں گی وہ مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے ہوں گے بنیادی طور پر وہ ایک سیاح ادیب ہیں اور انہیں بھی راکھ کے مرکزی کردار مشاہد کی طرح کشتی کے کیل کی ''گڑھتی'' ملی ہوئی ہے۔ مگر وہ محض سفرنامہ نگار نہیں ہیں ان کے اندر ایک بہت توانا افسانہ نگار اور ایک باکمال ناولسٹ چھپا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سفرناموں میں بھی فکشن کی آمیزش کرتے رہے۔ اور اردو ناول سے مایوس قارئین کی ادبی پیاس کی تسکین ہوتی رہی۔ ان کے بعض افسانوں کا تاثر بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے اور ان کے ابتدائی ناولوں فاختہ اور پکھیرو کا دلکش انداز بیان بھی۔ لیکن بطور ناول نگار ان کی اصل شناخت ''بہاؤ'' سے شروع ہوتی ہے۔ اور اب ''راکھ'' نے ان کو بڑے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

سفرنامہ کتنا ہی مقبول اور عمدہ ہو ایک ادبی ناول کا مقابلہ نہیں کرسکتا کہ ایک خارجی ٹریک بہرحال موجود ہوتا ہے۔ ''پورنے'' ڈالے ہوئے ہوتے ہیں جن پر قلم پھیرنا ہوتا ہے یا خاکہ موجود ہوتا ہے اس میں رنگ بھرنا ہوتے ہیں لیکن ناول میں سب کچھ خود (Create) کرنا یا بنانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی فرضی دنیا تخلیق کرنا پڑتی ہے جو اصلی دنیا سے زیادہ اصلی اور سچی معلوم ہو اسی لیے ناول کو سفرنامے کی نسبت زیادہ بڑا اور تخلیقی کام سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مستنصر کو اپنی تسکین اور ادب میں کوئی بڑا مقام حاصل کرنے کے لیے اس طرف آنا پڑا۔

راکھ کا موضوع بظاہر وہ تہذیبی اخلاقی انحطاط اور قدروں کا زوال ہے جس سے ہم اور ہمارے جیسے ترقی پذیر بلکہ پسماندہ ممالک دوچار ہیں لیکن یہ پاکستان کی تقریباً پچاس سالہ سماجی اور سیاسی تاریخ بھی ہے اور اس کا زمانہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے سے لیکر موجودہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اس عرصہ کے ہر اہم سیاسی اور سماجی واقعے اور وقوع کو چھونے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا موضوع محض زوال تک محدود نہیں اس کے اسباب و علل سے بھی بحث کرتا ہے اور اس میں زندگی کی سی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔

سفرنامے میں خارج کا یا زیادہ سے زیادہ دستیاب تاریخ جغرافیے کا سفر بیان کرنا ہوتا ہے جبکہ ناولسٹ مستنصر حسین تارڑ کو بیک وقت کئی طرح کے سفر درپیش ہیں۔ عالمی تاریخ اور انسانی رویوں کے علاوہ پاکستان کی نسلی، لسانی، علاقائی اور جغرافیائی تقسیم اور فرقوں عقیدوں میں بٹی ہوئی قوم کے پچاس سالوں میں سفر۔ ملک کو توڑنے اور اسے کرپٹ ترین ملکوں کی فہرست میں دوسرے اور تیسرے نمبر تک پہنچانے والی سیاسی بداعمالیوں اور عسکری ریشہ دوانیوں اور کوتاہ اندیشیوں میں سفر تعصب، جہالت، استحصالی ہتھکنڈے اور ان کے چنگل میں کراہتے سسکتے بکوسا کے جیسے مفلس اور قلاش انسانوں کی زندگیوں اور معاشرے کے مختلف النوع کرداروں کے باطن میں سفر۔ بے شک راکھ ایک مکمل اور بھرپور ناول ہے لیکن سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ یہاں بھی کرداروں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ہے نہ قاری کو کسی ایک شہر، قصبے یا ملک میں ٹکنے دیتا ہے اور اسے پاکستان، بنگلہ دیش، انگلستان، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن اور پتہ نہیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔ مگر غنیمت ہے وہ سو پچاس صفحوں کے فلیش بیکس کے بعد مرکزی کرداروں کو اپنے اصلی اور بڑے لوکیل پاکستان واپس لے آتا ہے۔ مگر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ یہاں آ کر سست یا کاہل پڑ جائیں انہیں وادی سوات سے چولستان تک اور اسلام آباد سے کراچی تک چھوٹے بڑے سفر ہر لحظہ پیش آتے رہتے ہیں۔ سری بہلول، بٹ خیلہ، ڈھاکہ، لاہور، کامونکی اور قادر آباد ظاہر ہے لاہور کو مرکزیت حاصل ہے اور لاہور کی دو چیزیں ان چار چیزوں میں شامل ہیں جو مرکزی کردار مشاہد کو ہر دسمبر میں بلاتی ہیں۔ لیکن ناول نگار محض ان چار چھ چیزوں پر قناعت نہیں کرتا ناول میں زیادہ نہ سہی چار سو چیزیں تو ضرور ایسی ہیں جو قاری کو اپنے پاس بلاتی ہیں اور پھر اٹھنے نہیں دیتیں۔

مستنصر ایک جگہ لکھتا ہے:

''تو کیا تاریخ نقلی بھی ہوتی ہے۔''

''ہاں۔۔۔ نقلی بھی ہوتی ہے۔ جو ہم اپنے خود ساختہ نظریے یا مذہب کے حوالے سے بناتے ہیں جو ہمارے نصاب میں شامل ہوتی ہے جس میں صرف ہم ہی ہم ہوتے ہیں اور ہر صفحے پر ہم زندہ باد لکھا ہوتا ہے اور ہم اسی زندہ باد کے زعم میں مبتلا رہتے ہیں اور جب ایک دن اصلی تاریخ سامنے آتی ہے تو ہم چکرا جاتے ہیں شاید اسی کو تاریخ کا جبر کہتے ہیں''

''راکھ'' میں مستنصر حسین تارڑ نے پاکستان کی اصلی تاریخ کا چہرہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ناول کے شروع میں مجید امجد کی جو لائنیں اس نے دی ہیں اس کی روشنی میں اپنے دل کی سچی بات زبان پر لایا ہے کہ اس بیمار معاشرے کو سچ کی کڑوی گولی کی اشد ضرورت ہے اسی لیے اس کا ایک کردار کہتا ہے ''یہ ملک اب مزید کسی کنسپریسی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

ناول کی کہانی مشاہد اور مردان دو بھائیوں اور ان کی فیملی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق مستنصر کے آبائی علاقے ضلع گجرات سے ہے۔ اور وہ گوالمنڈی سے لکشمی مینشن (موجودہ احمد مینشن)

میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ فلیٹس میں رہتے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو بھی ہیں۔ راکھ میں قدیم لاہور کی ثقافتی جھلکیاں اندرون لاہور کی تبدیل ہوتی زندگی۔ مال روڈ اور اس سے ملحقہ علاقے میں کھاتے پیتے انگریزی لوگوں کا رہن سن۔ منٹو صاحب کے شب و روز، بھوانی جنکشن کے یونٹ کی لاہور آمد اور فلم بندی۔ سمعیہ نام کی پڑوسن لڑکی سے رقعے بازی، اوائل عمری کا پہلا پہلا نفسانی احساس اور کشمی مینشن کے مکینوں کا طرز بود و باش ناول کی پختہ بنیادوں کا کام دیتے ہیں۔ اس کے بعد قیام پاکستان، ہندو مسلم فساد شاہ عالمی کی آتشزدگی جب پہلی بار مرکزی کردار کو چیزوں اور قدروں کے جلنے اور راکھ اڑنے کا احساس ہوتا ہے۔ پھر مہاجر پناہ گیروں کا سلسلہ، انگلستان میں تعلیم کے سلسلے میں قیام، واپس آکر اپنے سے کم عمر کا مونکی میں پیدا اور سویڈن میں پرورش پانے والی سیاہ فام چوہڑی لڑکی برگیتا سے خاندانی مخالفت کے باوجود شادی اور زاہد کالیا کی وساطت سے شمالی علاقوں، اسلام آباد اور چولستان کی سیاحت جس کے دوران میں معاشرے کے تقریباً سبھی نمائندہ طبقوں کو قریب سے دیکھنے دکھانے اور ان کی سوچ سے آگاہ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی کیپٹن مردان اور اس کی منہ بولی بنگالی نژاد بیٹی شوبھا کے حوالے سے سقوط ڈھاکہ کے دنوں کی صورت حال وقفوں وقفوں سے پڑھنے والے کے دل پر کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ مردان نے احساس ہزیمت سے چارپائی پر سونا چھوڑ رکھا ہے اور دسمبر میں اس کی پرانی چوٹیں ہری ہو جاتی ہیں اور ٹانگیں درد کرنے لگتی ہیں۔ پھر کراچی کی ابتر صورت حال بھی انہی کرداروں کے حوالے سے بیان ہوتی ہے جس میں اظہار، داؤد، نقوی اور بعض دوسرے کردار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ سب زندہ اور سچ مچ کے کردار ہیں۔ اور آخر کار کراچی ہی کی ایک شاہراہ پر مردان ایک Stray Bullet کا نشانہ بن جاتا ہے۔

راکھ کو پنجابی میں کھیہ بھی کہتے ہیں اور کہاوت ہے کہ ''ککڑ کھیہ اڈائی اپنے سروچ پائی'' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ذات پات اور عقیدوں کے اختلاف، جہالت، غربت، نفرت اور تعصب میں گھرے ہوئے زوال زدہ معاشروں میں ہر کوئی دوسرے کے سر میں کھیہ ڈالنے پر کمر بستہ ہے۔ ہر سو اخلاقی، تہذیبی اور انسانی اقدار کی راکھ اڑتی دکھائی دیتی ہے ادھر بابری مسجد پر منہ میں کف اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں لیے انتہا پسند چڑھے ہوئے ہیں تو ادھر شاہ عالمی میں ٹھنڈی ہو جانے والی راکھ پر سنہری کلس والے مندر کا ملبہ گرتا ہے۔ تو یہ سب دراصل ککڑ کھیہ ہے۔ جو دونوں طرف کے لوگ اپنے اپنے ملک کے منہ پر ملتے اور ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں اور خوش اعتقادی دیکھئے کہ فسادات میں جب شاہ عالمی جلتا ہے تو ہر طرف اس بات کا چرچا ہے کہ لال مسجد کو آگ نے چھوا تک نہیں اور اگر چہ مندر بھی بچ جاتا ہے مگر اس کو قابل ذکر بات نہیں سمجھا جاتا۔

مستنصر نے ایسی منافقتوں اور دوہرے معیاروں کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے اور مجید امجد سے اس نے سچ بولنے اور سب کو باخبر کرنے کا جو عہد کیا ہے اس پر پوری طرح قائم رہتا ہے۔ زاہد کالیا کے حوالے سے بہت سی باتیں ہیں لیکن ذرا یہ صورت حال ملاحظہ فرمائیے:

''کالئے کے ایک دوست نے ایک عمر یورپ میں گزار دی اور بالاخر اپنی تمام تر دولت سمیٹ کر پاکستان آ گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ پاکستان وہ واحد ملک ہے جس میں آپ کے پاس دولت ہو تو آپ ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ انصاف بھی ''بیسٹ کنٹری ان دی ورلڈ، مائینڈ یو، بی پاکستانی، بائی پاکستانی۔''

مشرقی پاکستان کو ڈوبتے اور بنگلہ دیش میں تبدیل ہوتے دیکھنے والے کیپٹن مردان کے حوالے سے دو ایک چھوٹے چھوٹے مناظر بھی دیکھئے۔

پہلی جھلک: ''شوٹ دی باسٹرڈ''، ''لیکن دے آر مسلمز سر''، ''سو واٹ کیپٹن''

دوسری جھلک: ''میڈیکل سٹاف۔ سر۔ چند نرسیں اور زخمی اور قریب المرگ جوان سر'' انہیں ایویکیوٹ کیا جا رہا ہے برما کی طرف۔ دشمن ان بانسوں کے جنگل میں آ چکا ہے اور ووئی مسٹ ایویکیوٹ''

''انہیں ہیلی کاپٹر سے اتار دو''

ہیلی کے پر حرکت میں ہیں سر یہ زمین سے اٹھنے والا ہے سر۔ نرسیں اور مرتے ہوئے جوان سر۔''

''اتار دو''

''لیس سر''

لندن کے قیام کا تفصیلی ذکر تقریباً سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے جسے کم کیا جا سکتا تھا مگر بعض حوالوں سے یہ حصہ ضروری بھی معلوم ہوتا ہے خاص طور پر دوسرے عقیدے، قومیتوں اور معاشروں کو سمجھنے اور ان کی سوچ سے آگاہ ہونے کے لیے۔ یہاں پاکستانی طلبہ کے علاوہ یہودی، انڈین، افریقی، جرمن، سویڈش، بنگلہ دیشی اور افریقی نوجوان لڑکے لڑکیوں کی وساطت سے ناول نگار نے بعض بین الاقوامی Issues پر ان کی رائے اور ردعمل پیش کیا ہے۔ جیسے نہر سویز کی لڑائی، یہیں امبر تو یہودی سے ملاقات ہوتی ہے۔ جو عربوں کو بدو، کاورڈز اور گڈ فار نتھنگ کہتا اور بتاتا ہے۔ ان عربوں نے اپنی زمینیں خود یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کیں۔ یہودیوں نے صحرا آباد کئے بستیاں تعمیر کیں۔ اگر تم بلندی سے نیچے دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسرائیل اور عربوں کی سرحد کونسی ہے۔ ایک جانب ''لش گرین فیلڈز'' ہیں اور دوسری طرف صحرا اور ریت اور امبر تو دعویٰ کرتا ہے کہ ''اگلی صدی اسرائیل کی ہوگی۔ ایک دن آئے گا کہ عرب اور تمہارا پاکستان بھی اسرائیل کے پاس آئیں گے۔ جھکے ہوئے۔ مارک مائی ورڈ''

اور جب وہ ایک بحث کے دوران میں یہ کہتا ہے کہ

''ہمیں زمین چاہیے۔ ہم اور کہاں جائیں''

تو مشرقی پاکستان میں جرنیل کی بات یاد آتی ہے۔ جو کہتا ہے ''ہمیں بنگالی نہیں بنگال چاہیے۔

ناول کا سب سے قابل تحسین پہلو یہ ہے کہ اس نے ملکی اور بین الاقوامی معاملات اور واقعات کا تجزیہ کرتے اور نتائج مرتب کرتے ہوئے ایک دانشورانہ انداز اور تخلیقی سلیقے کا دامن نہیں چھوڑا اور شاید بہت ہی درست تجزیے کئے ہیں۔

''نسل انسانی کا سب سے بڑا کارنامہ ایک فخر ایک بلند آہنگ قربانی ہی تو ہے۔ اور قربانی آپ کو کہاں لے جاتی ہے۔ کافرستاں کے وہ آلڑوہ بڑے بڑے پتھر ہیں جن پر لاکھوں بھیڑ بکریاں کٹیں اور ان کا خون بہا۔ تو پتھر تو پتھر ہی رہا۔ اس پر کیا اثر ہوا۔ باجن کی قربانی ہوئی۔ مرضی سے ہاتھ میں پرچم پکڑے ہوئے یا مرضی کے خلاف جنہیں دھکیل دیا گیا ان سب کا End Result کیا ہوا۔ کراچی کی صورت حال کے بارے میں ایک بلیغ اشارہ کیا ہے۔

''مرڈر شیل بریڈاے مزدر''

افغان جہاد کے بارے میں اظہار کی وساطت سے کہا ہے ''اپنے وطن میں ہم لوگ ہتھیار ڈال دیتے اور دوسروں کی زمین کے لیے ہم ہتھیار اٹھا لیتے ہیں'' اور زاہد کالئے کی زبانی کہا ہے۔

''افغان جہاد کم از کم میرے لیے تو بہت مبارک ثابت ہوا۔ بہن یا۔ کیا کیا نہیں آیا ہے وہاں سے۔ اصل گندھارا تو ادھر تھا۔ گدھوں پر لادکر لاتے تھے مجاہدین۔ بابر کے مقبرے کی جالیاں، محمود غزنوی کے بیٹوں کی قبروں کے کتبے بہت دن میرے لان میں پڑے رہے اور لوگ ان پر بیٹھ کر وہسکی پیتے رہے۔''

سیاسی رہنماؤں اور سربراہوں کے بارے میں ان کا ارشاد سنئے۔

ایک سیاسی جینئس کا ایک تکبر ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا شکار ہو جاتا ہے کیا ضرورت تھی میں تمہاری مونچھوں سے اپنے بوٹوں کے تسمے بناؤں گا۔ اور ذرا ان بلیغ اور علامتی اشاروں کو بھی دیکھئے:

''اگر آپ پاور میں ہیں تو کچھ بھی اہتمام کر سکتے ہیں۔ منصف جوق در جوق آئیں گے اور حلف اٹھائیں گے۔ شہد کی مکھیاں تو بہت بعد میں آپ کی لاش پر حملہ آور ہوں گی۔''

65ء کی جنگ کے بارے میں میں نے اس سے اچھا اور سچا تبصرہ کہیں نہیں پڑھا سنا۔ جیسا اس ناول میں ہے۔

''باہر ستمبر 1965ء کی جنگ کا بلیک آؤٹ تھا۔ اہل لاہور جنگ کے اس ہیجان انگیز کھیل کو انجوائے کر رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ یہ کھیل پہلی بار کھیلا جا رہا تھا۔ وہ ابھی ایک مکمل جنگ کی مکمل تباہی سے نا آشنا تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ جب جنگ دنوں کو عبور کر کے مہینوں اور برسوں میں داخل ہو جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ ایک محدود جنگ ایک قسم کا جذباتی رومان ہے۔ جس میں آپ کا جذبہ حب الوطنی کسی خدشے کے بغیر پروان چڑھتا ہے۔''

ناول کا مرکزی کردار شاہد کہیں کہیں مستنصر کے اپنے بہت قریب آ جاتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ خصوصاً گاؤں، گوالمنڈی، لکشمی مینشن اور لاہور کی طالب علمانہ زندگی اور منٹو اور دوسرے بہت سے جانے پہچانے کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے۔ بلکہ لکشمی مینشن کے زمانے کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ سہواً ان سے صیغہ جمع غائب کی جگہ جمع متکلم استعمال ہو گیا اور وہ جو کاموکی کے بکوساہ کیے کے بیٹے کا قصہ ہے وہ تو سب لوگ جانتے ہیں۔ ایک ان پڑھ عیسائی لڑکے پر مسجد کی دیوار پر دل آزار تحریر کا الزام اور اس کا قتل اور قوم کے چہرے پر کھیہ اور بھی بہت سے کردار سچ مچ کے جیتے جاگتے لوگ ہیں لیکن یہ جو مستنصر اپنی ضرورت کے مطابق جس کردار کو جہاں جی چاہتا ہے لے جاتا یا بلا لیتا ہے اس پر کبھی کبھی تعجب بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر نابینا فاطمہ کا لندن اور بھارت سے یوں آ جانا جیسے کاموکی یا سادھو کے سے آئی ہو اور پھر ڈنمارک کی کرسٹین کی بیٹی جس کا اپنا نام بھی شاید کرسٹین ہی ہے تھوڑی دیر کے لیے بھارت جاتی ہوئی محض کاغذ کا ایک چرمر پرندہ پہنچانے لاہور مشاہد کے گھر پہنچ جاتی ہے مگر کھڑے کھڑے۔۔۔ اور تب بھی بہت حیرت ہوتی ہے جب مشاہد کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی شکل وصورت میں اس کی اپنی آمیزش ہے۔ وہ اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار یقیناً کرتا ہے لیکن یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اس کو اس طرح نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ مگر کوئی صدمہ یا پریشانی کہیں نظر نہیں آتی۔

ان چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں یا میری آبزرویشنز سے قطع نظر راکھ ایک بڑا ناول ہے۔ کتنا بڑا؟۔۔ اور کس سے بڑا۔۔۔ یہ سوال بے معنی اور نامناسب ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہونی چاہیے اور اسے بڑا بنانے میں اگر اس کے مواد نے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا ہے تو طرز بیان نے خوشنما لباس کا۔ تکرار اور بسیار نویسی مستنصر حسین تارڑ کی کمزوریاں ہیں لیکن اس ناول کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ اس میں پوری چار مرغابیاں اور ان کی تکرار سب کچھ کھپ گیا ہے۔ انہوں نے اردو املا میں بے شمار انگریزی برتی ہے مگر ایک تو یہ درست ہے اور دوسرے پروف ریڈنگ کا معیار اچھا ہے۔ تاہم کہیں کہیں انگریزی الفاظ کم یا تبدیل کئے جا سکتے تھے۔ البتہ پنجابی الفاظ لوگ گیتوں اور اشعار کا برمحل اور خوبصورت استعمال ان کے اسلوب کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔

کسی ادبی تخلیق کو محض خیالات یا فلسفہ طرازی کی بنیاد پر کوئی اعلیٰ مقام اور مرتبہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس کے لیے مضامین اور مقالات کی صف موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی تخلیق میں ادبی اور فنی حسن اور اسلوب میں دلکشی ضروری ہے۔ کرداروں، منظروں، واقعات اور جذبوں کی ایسی محاکاتی تصویریں اتاری جائیں کہ ذہن میں ان کا نقش دیر تک رہے۔ مستنصر حسین تارڑ کو قدرت نے اس کی صلاحیت اور سلیقہ عطا کیا ہے اور اس نے ناول کی طویل مشقت میں بھی اس پہلو کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے۔ چند مثالیں۔

ا۔ ماضی کے موسم وہیں رہ جاتے ہیں وہ صحن جن میں دھریک کے درخت ہوتے ہیں وہ ڈھے جائیں تب بھی ہم ان کی چھاؤں کو یاد کرتے ہیں۔

۲۔ اس کے اجتناب اور نام لینے سے گریز نے اسے خبر دی تھی کہ عافین شاید حالات کے بوجھ تلے یا واقعی اس کے عشق کے ایسے تناؤ میں آ چکی تھی جس میں نتھنے چرنے کو آ جاتے ہیں۔

۳۔ عارفین اور نازنین کو آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ خاص دباؤ اور درجہ حرارت میں ہی زندہ رہنے والے سمندر کے نیچے ہزاروں میٹر گہرائی میں پائے جانے والے بے رنگ آبی پھولوں کی طرح تھیں جو سطح آب پر آتے ہیں مسمار ہو کر پانی ہو جاتے ہیں۔ اردو ادب میں مہاجروں پناہ گیروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن مستنصر چند سطروں میں کیا نقشہ پیش کرتے اور کس انداز سے پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

''ان پناہ گیروں کی شکلیں ایسی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا اداکار ان جیسی شکل بنانے پر قادر نہیں تھا۔ ہزاروں برسوں سے کسی گھر میں رہنا۔ آس پاس کے ویرانوں کو قبروں سے آباد کرنا۔ پھر ان گھروں کو تنکا اٹھائے بغیر چھوڑنا۔ پھر بھوک دکھ اور بیماری اٹھا کر چلتے جانا اور اپنی ماؤں کو بیٹیوں کو بھی ننگے بدن دیکھنا، بہت کچھ دیکھنا اور کچھ نہ کر سکنا، بچوں کو کرپانوں میں پروئے دیکھنا اور کچھ نہ کر سکنا، بھوک بیچارگی اور موت سے بے شرم ہو جانا، تب جا کر کچھ کچھ ویسی شکل بنتی ہے جو ان پناہ گیروں کی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ مستنصر نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس کے دل میں تھا۔ اور مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ وہ سب سچ بھی ہے اور ہر حساس دل اور سوچنے والا ذہن انہی نتائج پر پہنچتا ہے۔ میں مستنصر حسین تارڑ کو ایک بڑا اور بھرپور ناول لکھنے اور اس کی راست فکری پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

۲۳۔ جون ۱۹۸۷ء

۲۶۔ ویسٹریج۔I

راولپنڈی،

محبّی تارڑ صاحب،

السلام علیکم۔

آج آپ کا پیکٹ ملا جس میں ''چِپسی'' ہے اور آپ کا خط۔ از حد ممنون ہوں۔ ''چِپسی'' کو اطمینان سے پڑھوں گا۔ نیاز صاحب نے اسے بہت عمدہ چھاپا ہے۔

اگروصاحب نے آپ کو ٹیلی فون کرنے کے لیے کہا ہوگا۔ دراصل پیغام یہ تھا یہ جب کبھی آپ اس طرف آئیں تو ضرور مطلع کریں تاکہ ملاقات (خواہ کتنی ہی مختصر ہو) ہو سکے اور اگر پنڈی اسلام آباد کے Trip پر آپ بے حد مصروف ہوں تو یہاں سے ٹیلی فون کر لیں تاکہ کتابوں کی اشاعت کے متعلق آپ سے مشورہ لے سکوں۔ شاید اُدھر سے ٹیلی فون پر صحیح پیغام نہیں پہنچ سکا۔

چھوٹا لڑکا بینک آف امریکہ میں ملازم ہو گیا ہے اور بڑا Citi Bank میں (لاہور میں) ہے۔ بیوی ان دنوں اپنی بہن کے پاس کراچی گئی ہوئی ہے۔ تبھی ٹیلی فون پر آپ کا Contact نہ ہو سکا کیونکہ چند دنوں کے لیے میں بھی بکھر گیا ہوا تھا۔

''ہزاروں راستے'' کے بارے میں چند دنوں تک اسلام آباد میں پوچھوں گا۔ میں نے آپ کو ایک خط ''کسان اینڈ کمپنی'' پر لکھا تھا، شاید آپ کو نہیں ملا۔

بیگم صاحبہ کو سلام، بچوں کو پیار۔

شفیق الرحمٰن

☆

''کھیتوں کے سلگتے سہاگ''

پروفیسر ریاض صدیقی
(کراچی)

اردو کی ادبی روایت میں ناول کی صنف کا پھیلاؤ بہت کم ہے۔ اور امراؤ جان ادا، فردوس بریں، گؤ دان، شکست، ٹیڑھی لکیر، آنگن، خدا کی بستی، آگ کا دریا، دیوار کے پیچھے اور آگے سمندر ہے جیسی تخلیقات پر یہ فہرست تمام ہو جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''بہاؤ'' اس فہرست میں قابل حوالہ اضافہ ہے جسے اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جانا چاہیے مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس کی بُنت میں نفسیات، تاریخ ثقافت، زبان اور بشریات یا اینتھر پولوجی کا سنگم ہوا ہے اور آثارِ قدیمہ نے زندہ ہو کر اپنے عہد کو بیان کیا ہے۔ اردو ادب کے نقادوں نے جیسے بھی اور جو کچھ بھی وہ ہیں ''بہاؤ'' پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ناول نگار نے بھی اپنی ہوا باندھنے کے لیے نہ تو اخباروں میں خبریں اور کالم شائع کرائے اور نہ فوریا فائیو سٹار ہوٹل میں کسی پر تکلف تقریب کا اہتمام کیا جواب ہمارے یہاں تنقید کا وسیلہ بن گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اپنے انٹرویو میں (مطبوعہ جنگ کراچی) نقادوں کی خبر لی ہے۔ ''بہاؤ'' سراسر ناول ہے تنقید کا متن نہیں مگر اس کے تخلیقی متن کی تہوں سے تنقیدی شعور کی روشنی نکلتی ہے جس طرح ایک اعلیٰ و مستند نقاد تخلیق کار ہوتا ہے اسی طرح ایک جینوئن تخلیق کار کے اندر ایک نقاد بھی چھپ کر مصروفِ تماشا ہوتا ہے۔

''سرسوتی میں   پورن جھکا ہوا بولا
نہیں گھاگھرا میں
رگ وید میں تو یہی آتا ہے۔
یہ رگ وید سے پہلے تھا اور گھاگھرا تھا اور ہے اسے دریا ہی رہنے دو، دیوی بنا کر دور مت کرو۔''

''اور ایسا ہونا تھا ورچن۔ تمہارے جسموں میں آنکس ہے اور تمہاری آنکھوں میں نیند ہے اور تمہارے دریا سست ہو چکے ہیں کوئی بھی زمین کا پتہ نہیں ہوتا ہے۔ نہ اس زمین پر پیدا ہونے سے وہ تمہاری ہو جاتی جب تک تم اس کی خدمت نہ کرو اس کی چاکری نہ کرو۔''

''بہاؤ'' قبل تاریخ (prehistoric) دور کی ایک زرعی بستی کی کہانی ہے جہاں ہڑپا اور موئن جودارو کے شہروں میں پائے جانے والے پکی اینٹوں کے مکانات نہیں ہیں بلکہ گارے مٹی پھوس اور سرکنڈوں سے بنائے گئے مکانات ہیں۔ ایسی کئی بستیاں سات دریاؤں کے کنارے آباد تھیں جو ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی قریب تھیں۔ تاریخ کی تلاش اور یک جائی کے دور میں مورخوں نے ہڑپا، موئن جودارو اور اس کی ان شاخوں کے بارے میں جو برصغیر میں ایک سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھیں، حقائق جمع کیے مگر گھاس اور گارے مٹی سے بنائی گئی نہ جانے کتنی بستیاں سرسوتی ندی کی طرح گنگا اور جمنا کے درمیان میں آ کر بے نام و نشان ہو گئیں۔ تارڑ نے اپنے تخیل کی طاقت سے ایک ایسی ہی بستی کو دوبارہ زندہ کیا ہے اور اسے اپنے وجود کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ منظر کو امکانی حد تک حقیقت کا روپ دینا مشکل یوں نہیں تھا کہ سندھ و پنجاب کے دیہاتوں کے اطراف بستیاں اب بھی ملتی ہیں۔ موئن جودارو اور ہڑپا میں جس قسم کی بیل گاڑیاں، کشتیاں، مٹی کے پکے ہوئے برتن اور کھلونے استعمال ہوتے تھے، سندھ و پنجاب کے دیہاتوں میں اب بھی استعمال ہو رہے ہیں۔ ان بستیوں کے باسیوں کا رہن سہن ان کی ثقافت اور رسومات وغیرہ ایک جیسی تھیں۔ ان بستیوں میں امن آشتی کا سکہ چلتا تھا۔ موئن جودارو اور ہڑپا کے دور میں بھی ایسی بستیاں پورے برصغیر میں پائی جاتی تھیں۔ گھوڑوں (اسوا جو فارسی میں اسپ ہو گیا) پر سوار آریا جن کے پاس رتھ جیسی سواری بھی تھی جب یورپی علاقوں سے ایران اور پھر ایران سے شمالی مغربی ہندوستان آئے تو ان بستیوں کو جی بھر کر روندا اور ان علاقوں پر مسلط ہو گئے۔ آریاؤں کی وحشی انڈو یورپین نسل تاریخ کی اولین امپائر ساز نسل ثابت ہوئی۔ یہی آریا موجودہ ہندوستان و پاکستان کی عوام کی اکثریت کے آباؤ اجداد تھے۔ وہ نیم وحشی، آوارہ خرام، آزاد رو اور کھلی فضاؤں میں رہنے کے عادی تھے چناں چہ فعال اور متحرک تھے جب کہ ہزاروں برس پہلے یہ آبادیاں اپنے خول میں بند تھیں اپنی زمین کی بوباس اور رسوم و روایات میں گم۔ ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار دریاؤں کے پانی اور برسات کے موسم میں آنے والے سیلابوں پر تھا یہی وجہ ہے کہ پانی ان کی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ دریاؤں کا پانی اور سیلاب آج بھی دیہاتی کسانوں کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔

''سارا کھیل پانی کا ہے۔۔۔ مہامیا بھی پانی بنا ہری نہیں ہوتی۔۔۔ اور جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں تو بس کچھ بھی نہیں ہوتا۔'' یہ بستیاں اس لیے تباہ ہو گئیں کہ اپنے آپ میں گم اور ٹھہری ہوئی تھیں۔ آریا آئے بھی تو دور دراز پھیلی ہوئی بستیوں کو ان کے آنے کا علم نہیں ہوا بالکل اسی طرح جیسے اندرونی علاقوں کے دیہاتوں میں اب بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جنہوں نے ابھی تک شہر نہیں دیکھا ہے۔ قدیم دور کی ان بستیوں کے باسیوں نے اپنی زمینوں کو سینچنے کے لیے کوئی متبادل طریقہ دریافت نہیں کیا۔ موسمی بارشیں اور دریاؤں سے آنے والے سیلابی پانی یعنی بڑے پانیوں کے آنے پر ان کے یقین نے انہیں دھوکا دیا۔

''سرسوتی جو بڑے پانیوں کی ماں ہے۔۔۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی پونجی گھاگھرا کے کنارے آتے وقت ساتھ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے جانے کیا کچھ پانی میں پھینکا۔ وہ جو شے پانی میں ڈالتے وہ خاموشی سے بہنے لگتی یا

ڈوب جاتی سوائے ایک شے کے جو رونے لگی۔''

ان پرانی بستیوں کے رہنے والے اگر چہ بہت سی باتوں کو نہیں مانتے تھے مگر ان کے ساتھ نبھاؤ صرف اس لیے کرتے تھے کہ ان سے پہلے باپ دادا یہی کچھ کرتے آئے تھے۔

''کبھی کبھار جب بیج زمین میں پڑا سوکھنے لگتا اور اس میں سے کونپل نہ پھوٹتی تو بڑی میاں کی ایک مورتی کھیتوں کے بیچ رکھ کر بستی کی کوئی جھی بدھری یا کواسی اس کے پاس لیٹ جاتی اور کوئی مندرا۔ پنڈو یا چپا اس کے بیچ اپنا بیج اتارتا۔''

زرخیزی کی یہ رسم دریائے نیل اور موئن جودارو ہڑپا کی تہذیبوں میں رائج تھی جو بعد میں بھی جاری رہی۔ رسوم و روایات سے چمٹے رہنے کی اس سائیکی سے ہمارا عام معاشرہ بھی اب تک جان نہیں چھڑا سکا ہے۔ کیوں کہ آباو اجداد کے طور طریقوں کی پیروی کا تصور ابھی تک کمزور نہیں ہوا ہے۔ روایات ورسومات کی مشکل یہ ہے کہ وہ سوچ کو عمل میں لانے اور تبدیلی پیدا کرنے سے روکتی ہیں۔ حکمران و دولت مند اقلیتی طبقہ مقامی لوک ثقافت کے تحفظ اور اس کے فروغ پر صرف اس لیے زیادہ توجہ دیتا ہے کہ سوچ اجتماعی کردار کے ساتھ مربوط ہو کر عمل کی سمت نہ اختیار کرے۔ علامت نگاری ہو یا فنی ہنر کاری، فینٹسی ہو یا جمالیاتی فضا بندی یا اسی قبیل کی دوسری جہتیں، موجودہ عہد کے جدیدیت پسندوں کی جاگیر نہیں ہیں ماضی کا لوک اور کلاسیکی ادب ان مظاہروں سے عاری نہیں ہے۔ تارڑ نے جس عہد کی لسانی اور ثقافتی فضا کو دریافت کیا ہے بیانیہ اس عہد کی علامتی، فنی ہنر کاری، فینٹسی اور جمالیات میں سانس لیتا ہے مگر اس میں سماجی حقیقت نگاری اور تنقیدی شعور کو سمو کر ناول نگار نے اسے اپنے عہد کا مہابیانیہ بنا دیا ہے۔

''بہاؤ'' کی ابتدا ایک بھوکے پیاسے پرندے کی اڑان سے ہوتی ہے جو دانے کی تلاش میں اڑے چلا جا رہا ہے اس میں زندگی کرنے اور گرتی ہوئی زندگی کو سنبھالا دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اس کے ذہن میں سوالات اُبھرتے ہیں اور اس موڑ پر وہ ہمارے سوالات کی علامت بن جاتا ہے۔ آگے کیا ہے؟ کہاں تک اور کب تک؟ میں کون ہوں؟ آگے کی جان کاری نامعلوم کو معلوم کرنے۔ جدوجہد کی حدآخر اور پہچان کی خواہش انسان کی فطرت ہے۔ پرندہ زندہ رہنا چاہتا ہے مگر اس کی اڑان کا راستہ اسے مرگھٹ کی طرف لیے جا رہا تھا یہ راستہ اس نے اپنے غلط فیصلے اور اندازے کی بنا پر منتخب کیا تھا تاریخ میں حکمرانوں اور ان کی معاونت کرنے والے دولت مند بھی اپنے غلط فیصلوں، اندازوں اور پالیسیوں ہی کے تضادات میں مبتلا ہو کر اپنے اجتماعی ثقافتی اور سماجی وجود کو کھو دیتے ہیں آخری لمحوں میں پرندہ ٹکراؤ کے تضاد سے آزاد ہو گیا اور اس نے خود کو صورتِ حال کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اب جس سمت وہ اڑان کر رہا تھا وہی اس کی خواہش تھی۔''

''پاروشنی نے اسے ہاتھ سے اُٹھایا اور اس کی کھلی چونچ میں پانی ٹپکاتے ہوئے کہا تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لیے آ گئے ہو۔۔۔ پرندے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مر چکا تھا۔''

پاروشنی کی اپنی ہری بھری اور ہنستی کھیلتی بستی بھی مٹ چکی تھی اور وہ اپنے ہی ویرانے میں اکیلی مرنے کے لیے رہ گئی تھی۔ ناول نگار نے اس علامتی بیانیہ میں پوری کہانی کا خلاصہ سمیٹ کر پیش کر دیا ہے ناول نگار اس مجموعی صورتِ حال کا موازنہ گو کہ اپنے معاشرے سے نہیں کرتا مگر اس کی اوٹ سے ایک پکار سنائی دیتی ہے۔ ہم تاریخ کے جس مرحلے میں سانس لے رہے ہیں وہ بھی تضاد سے آزاد ہو گیا ہے اس نے بھی موجود بین العالمی صورت حال کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اڑان کی جس سمت کو اس نے منتخب کر لیا ہے وہی اس کی یعنی حکمران و اعلیٰ طبقے کی خواہش ہے۔

اردو شعر و ادب میں حسیّت کی کیفیات، خواہش، ہوس اور ضرورت کے مابین واضح خط امتیاز نہیں قائم کر سکی ہے۔ ناول کی کردار پاروشنی نے اس خط امتیاز کی نشان دہی کی ہے۔ قدیم ثقافت کی فطرت نوازی (NATURALISM) میں جنس بھی فطرت ہی سے مربوط تھی یہی وجہ ہے کہ اسے خواہش کی بجائے زندگی کی نشو و نما کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا یعنی وہ ضرورت تھی۔

''کنگن بندھن ہیں جو بندہ آپو آپ ہنستا ہے اپنی من مرضی سے ایک کنگن ور چن ہے، دوسرا سمرو ہے تیسرا وہ چیزیں جو بدن مانگتا ہے، چوتھا اچھی فصل پانچواں ان چیزوں کی آس جن کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے پر جن کے لیے جی کرتا ہے۔

پر بندہ کون سا کنگن اتارے؟

اس اقتباس میں انسانی جدوجہد کا پورا تاریخی شعور دکھائی دیتا ہے جس کی آفاقیت انسانوں سے آزاد ہے۔ جنس اور معاش انسان کی ضرورتیں ہیں خواہشات نہیں ہیں۔ خواہشات وہ ہوتی ہیں جن کے بغیر گزارا ہو جاتا ہے ''بہاؤ'' کی ''فیمی نزم'' سراسر مثبت ہے جسے ہمارے موجودہ معاشرے کی پڑھی لکھی روشن خیال خواتین بھی تسلیم کرتے ہوئے ڈرتی ہیں۔

''بہاؤ'' ان فنی شرائط پر بھی پوری اُترتی ہے جن کو عموماً روایتی قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان پر بھی جنہیں دورِ جدید نے متعین کیا ہے۔ جدیدیت کے سائے جو خود لایعنیت۔ تشکیک اور اپنی ذات کی کال کوٹھری میں بند ہونے جیسے رجحانات کا مجموعہ ہیں ''بہاؤ'' پر نہیں پڑے ہیں۔ اردو ادب میں ناول دراصل مغرب سے آیا چناں چہ اسلوب و بیان اور فن کے تمام پیمانے بھی مغرب ہی سے آئے۔ ناول کی تنقید اردو نے نہیں بلکہ مغرب نے پیدا کی مگر ''بہاؤ'' کے مصنف نے اپنی سرزمین اور تاریخ کے بطون میں موجود داستانی بیانیہ فضا سے متن کو مربوط کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دورِ حاضر کے ''دستم ناول''

سے ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے سسٹم پیراڈگم (PARADIGM) ایک معاصر سائنسی علمیات (EPISTEMOLOGY) ہے جو لکھنے والوں اور قارئین کو ماحولیاتی، سیاسی، اقتصادی، ٹیکنیکی اور دوسرے اجزا کو جو پورے سسٹم کو ساخت کرتے ہیں سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔(ٹام لی کلیر TOM LE CLAIR دی آرٹ آف ایکسیس الینوئس یونی ورسٹی پریس شکاگو ۱۹۸۹ء)

ہزاروں برس پرانی بستی کے بارے میں جو ناول کا موضوع ہے اب تک کی مستند تحقیقات نے جو حقائق فراہم کیے یعنی ان کی زبان وثقافت، دیومالا، سماج، اقتصادی وکاروباری علوم ومشاغل، منڈی تجارت، ہنرکاری کے پیشے، تعمیرات، زراعت عقائد ورسوم آرٹ، برتن سازی، سنگ تراشی، مختلف آلات ووسائل پیداوار وغیرہ۔''بہاؤ'' کی کہانی میں سمٹ آئے ہیں گویا ناول خود ایک فنی اور تخلیقی تاریخ بن گئی ہے۔اس سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ ناول نویس نے اپنے موضوع کو صرف سوچا ہی نہیں ہے بلکہ اسے دریافت کیا ہے''بہاؤ'' جیسا ناول مستند تحقیقات ومعلومات سے بھرپور مطالعہ کیے بغیر لکھا نہیں جا سکتا تھا ''بہاؤ'' یقیناً تاریخ واقتصادیات اور ثقافت وسماجیات کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ تخلیقی ادب ہے اور اس ادبی تخلیقی فضا کی جمالیات میں تاریخ وثقافت اور اقتصادیات وسماجیات بطور مواد تحلیل ہوئے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کا یہ بیانیہ بتاتا ہے کہ ادبی ہمہ جہت آفاقیت اور صلاحیت کو یہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ وہ مشاہدات وتجربات اور علوم کے شعبوں کو بھی اپنی کائنات میں ضم کر لیتا ہے بشرطے کہ تخلیق کار کو اپنے فنی وجمالیاتی اور تخلیقی مٹی میں ان کو گوندھنے کا گُر آتا ہو وہ نعرے کو بھی ادب بنا دیتے ہیں۔

یہ آنسوؤں کی دعا بھوک کی مناجاتیں
یہ کھیتیوں کے سلگتے سہاگ کی راتیں
(شورعلیگ)

معروف نقاد کارلا کاپتی (CARLA CAPPETT) نے اپنی کتاب ''رائٹنگ شکاگو موڈرنزم ایتھنو گرافی اینڈ دی ناول'' (کولمبیا یونیورسٹی پریس ۱۹۹۴ء) میں لکھا ہے کہ نئی تنقید اور جدیدیت تنگ نظری اور تعصّبات کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ ضد ہیں کہ سماجی وسیاسی اور تاریخی شعور کی ترجمانی کرنے والا ادب سطحی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس قبیل کے ناولوں کو بھی انہوں نے نظر انداز کیا ہے۔ باوجود اس اختلاف کے اسی قبیل کے ناول پڑھے جاتے ہیں اور مغربی تنقید کا موضوع بھی ہیں۔مغرب میں ان کی شرح فروخت لاکھوں تک پہنچتی ہے۔''بہاؤ'' جیسا ناول اگر مغرب میں شائع ہوتا تو وکرم سیٹھی کے ناول ''اے سوٹ ایبل بوائے'' کی طرح پانچ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہوتا۔

''بہاؤ'' میں ہمیں معاشرے کا وہ پس ماندہ طبقہ دکھائی دیتا ہے جو اپنی محنت کے ذریعہ دوسروں کے لیے اشیا اور مصنوعات تخلیق کرتا ہے مگر اپنی محنت سے بنائی ہوئی اشیا کا وہ مالک نہیں ہوتا ہے جو اجنبیت اور بے گانگی کے کرب کو جنم دیتا ہے۔

''اور یہ بستیاں کیسے بن جاتی ہیں۔''

انہیں ہم بڑا بناتے ہیں۔چھوٹی بستیوں والے۔ہم نے گھاگھرا کے کنارے پر جو کچھ بنایا انہوں نے اس کی سُن گُن پا کر یہی کچھ بڑا کر کے بنا دیا۔یہ چوکور مہریں وہ کہاں بناتے تھے ادھر گھاگھرا کی بستیوں کے میرے جیسے وہاں گئے تو ان کو سکھایا۔یہ برتن اور کھیتی کے ڈھنگ ادھر سے گئے۔

''میرے لیے تو رُتیں ساری کی ساری پسینے کی رُتیں تھیں۔''

''کسی نے آج تک یہ نہ پوچھا کہ ان اینٹوں کو بناتا کون تھا اور انہیں پکاتا کون تھا سب نے موئین جو کے گودام اور کنوئیں دیکھے اور ان کو نہ دیکھا جو شہر پرے سندھو کے کنارے چاردیواری کے اندر بھٹوں پر جنور بنے کام کرتے تھے اور گارے بناتے تھے اور اسے سانچے میں ڈھالتے تھے۔''

اس بیانیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم عہد کے پسماندہ لوگ جن کو پڑھے لکھے شرفا گنوار بھی کہتے ہیں بنیادی حقائق کا شعور رکھتے تھے۔اس کے اظہار کے لیے لوگوں کے پاس ان کی اپنی زبان اور ان کا اپنا علامتی نظام بھی تھا۔

ناول نگار کے کمال ہنر کا سب سے زیادہ قابل ذکر پہلو اس بیانیہ زبان کی دریافت اور بنت ہے جو ہزاروں سال پہلے ان بستیوں میں رائج تھی۔ یہ برصغیر کی اس زبان کا مستند نمونہ بھی ہے جو کبھی رابطے کی زبان (VIA MEDIA) ہوا کرتی تھی۔اس کے نمایاں آثار وعلائم پورے برصغیر کی عام بول چال کی زبان میں ابھی تک پائے جاتے ہیں۔اس زبان میں دراوڑی زبان کا وہ رنگ وآہنگ ہے جو اردو سمیت برصغیر کی تمام علاقائی زبانوں کا سرچشمہ ہے۔ اس زبان کو مٹا کر انڈو یورپین آریائی نسل نے اپنی سنسکرت مسلط کر دی مگر وہ سنسکرت کو دراوڑی لفظوں کے تال میل اور ثقافتی رنگ سے بچا نہیں پائے۔ ''بہاؤ'' کی زبان تقابلی لسانیات کا موضوع بن سکتی ہے۔وہ عین الحق فرید کوٹی اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے لسانی نظریے کو بھی سند فراہم کرتی ہے۔

''تمہارے ساتھ سمجھ بوجھ والے بھی اترے ہیں جو اس زمین کی ندیوں پہاڑوں اور دیوی دیوتاؤں کے نام بدلتے ہیں یہاں کی بولیوں کو ناسمجھ کی بولیاں کہتے ہیں پر انہی کو اپنی بولی میں گھول کر نئی بولی بناتے ہیں۔''

طبقاتی نظام میں اعلیٰ وحکمراں طبقہ زبان وکلچر کی اجتماعیت کو ہمیشہ دودھاروں میں تقسیم کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایک اعلیٰ زبان اور ثقافت کی سطح پیدا ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ یہ طبقہ اپنے تمام مفادات عزائم اور مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔آریاؤں نے دراوڑی زبان کو ختم کر کے اجتماعی زبان وثقافت کی ملک گیر طاقت کو توڑ پھوڑ ڈالا اور لسانی قلم رو میں اتھل پتھل پیدا ہو گئی۔ ''بہاؤ'' رائج ادبی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جو اقتدار مرکز طاقت کی دین ہے بلکہ اس محاورے اور بیانیہ میں لکھی گئی ہے۔جو کبھی عوام میں رابطے کی ملک گیر زبان تھی۔اردو کا یہ اجتماعی روپ جو تاریخ کے زمانوں سے گذرتے ہوئے ہم

نے کھو دیا تھا ''بہاؤ'' میں یک جا ہو گیا ہے۔ میرامن کی باغ و بہار کے بعد یہ
دوسری ناول ہے جو گلی کوچوں اور بازاروں میں بولی جانے والی اس زبان میں
لکھی گئی ہے جو ہزاروں برس پہلے برصغیر میں رائج تھی۔ ناول نگار نے اس زبان
کو اس کمہار کی طرح بنایا ہے جو کچی مٹی سے برتن بناتا ہے۔ یہ ان بستیوں کے
محنت کشوں کی زبان ہے جس کی بُنت میں کتنے دراڑوی لفظ موجود ہیں جو ہمیں
پراکرتوں، اردو، پنجابی، سندھی، ہندکو اور سرائیکی زبانوں میں اب بھی ملتے ہیں۔
ان میں کتنے ہی دراوڑی لفظ ہیں جو ابھی تک اپنے ان ہی معنوں میں بولے جا
رہے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے ''مہابیانیہ'' کی ترکیب میں لفظ ''مہا'' استعمال
کیا ہے جو دراوڑی کا ہے۔ ان دنوں اعلیٰ سیاست میں ایک لفظ ''ٹرائکا'' بہت
مقبول ہے۔ یہ لفظ موئن جودارو اور ہڑپا والے استعمال کرتے تھے۔ (ایس اے
راؤ۔ ڈان اینڈ ڈیولوشن آف انڈس سویلائیزیشن۔ ادیتا پرکاش دہلی ۱۹۹۱ اور
والٹر فیر سروس (W.FAIRSEVIS) ہڑپن سویلائیزیشن اینڈ اٹس اسکرپٹ
دہلی ۱۹۹۱ء)

''بہاؤ'' میں بہت سے لفظ اور فقرے ہیں جو کبھی اردو والے گلی
کوچوں بازاروں اور گھروں میں بولتے تھے۔ اردو کے اس ادبی لسانی سرمائے کا
ضائع ہو جانا اور تذکرہ نویسوں اور ادبی مورخوں کا اس کو نظر انداز کر دینا بہت بڑا
قومی و ثقافتی سانحہ ہے۔ ''بہاؤ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ
ہمارے اجتماعی لاشعور کو کھول رہی ہے۔ زبان بجائے خود علم کا ایک شعبہ ہے جس
نے بیسویں صدی میں سائنس کی بنیاد پر اپنا ادارہ قائم کیا ہے چنانچہ اسے مراعات
یافتہ طبقے کی اقلیت اور اس کے معاون متوسط طبقے کے حوالوں سے سمجھا نہیں جا
سکتا ہے حاضر صدی کے تمام شہرہ آفاق فلسفیوں اور لسانی ماہروں نے مثلاً
سوسیئر۔ فوکالٹ، وٹگنسٹائن، رسل، وہائیٹ ہیڈ، لیوی اسٹراس، سارتر،
اسمارلو پونٹی وغیرہ نے زبانوں کی نشو ونما کا ماخذ عوام کو قرار دیا ہے۔

''بہاؤ'' کا ایک ایسے دور میں شائع ہونا جب کہ خود ہمارا معاشرہ
تباہی اور زوال کی زد پر ہے نیک فال ہے۔ لفظ ''بہاؤ'' بھی وقت کا اشاریہ ہے۔
جو قومیں اس کے تیور بھانپ لیتی ہیں اور اپنے دفاع کی تدبیر کرتی ہیں وہ ترقی
پذیر مستقبل کی طرف سفر کرتی ہیں ورنہ بہ صورت دیگر اسی طرح تباہ ہو جاتی
ہیں جس طرح گھاگھرا کی بیٹی پاروشنی مر گئی جو اس وقت ہمارے عوام کی اکثریت
کی علامت ہے۔ بستیاں کیوں مر جاتی ہیں ان اسباب کی بلاواسطہ نشاندہی
''بہاؤ'' کا کردار کرتا ہے۔

''بستیاں باہر سے نہیں اندر سے مردہ ہوتی ہیں۔۔۔ باہر والے تو
اتنے برسوں سے چلے آ رہے ہیں اگر موئن جو کو انہوں نے ختم کرنا ہوتا تو کر چکے
ہوتے'' تو پھر بستیاں کیسے مردہ ہوتی ہیں۔۔۔ اندر ہی اندر بوڑھے مجھ جیسے
بھوکے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اور عورتیں ویسی جو میرے ایسوں کو جنم دیتی
ہیں تو یہ سب کڑھتے ہیں کہ ہم کیوں ایسے ہیں اور اپنے اندر سے پوچھتے رہتے
ہیں کہ ہمیں ہزار برس کی قید کیوں۔ ہم میں اور موئن جو کی گلیوں میں دوڑنے
والے گڈ بیلوں میں فرق کیوں ہے کیوں وہ پیٹ بھر کر چارہ کھاتے ہیں اور ہم
نہیں کھاتے ہیں۔۔۔ ایک بستی باہر کی ہے موئن جو کی اور دوسری بھٹے کے اندر
کی ہے ایک میں اونچ بہت ہے اور دوسری میں نیچ بہت ہے۔''
تو ورچن بستیاں باہر والے مردہ نہیں کرتے۔۔۔ کرتے ہیں پر
ساری کی ساری نہیں کرتے ہیں۔ یہ ہم خود ہوتے ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کو جنور
بنا کر رکھنے والے۔

ہزاروں سال پہلے یہ عوام جو بھی سوچ رہے تھے آج ہمارے عوام
بھی وہی کچھ سوچ رہے ہیں۔ ہڑپا اپنے دور میں ملک کا اسلام آباد تھا۔ ان کے
یہاں سات ہزار سال پہلے وہ دنیائیں آباد تھیں ایک بستی کے باہر کی اور دوسری
بھٹے کے اندر کی۔ ہمارے یہاں بھی دیہاتوں اور بڑے شہروں کے غریب عوام
کی آبادیاں اور اونچے طبقے کی بستیاں ایک دوسرے سے بہت دور آباد ہیں۔
اسلام آباد آج کا ہڑپا ہے موئن جو لاہور ہے اور کراچی حدود سے باہر واقع کالی
بنگن بنا دیا گیا ہے۔

''بہاؤ'' میں طبقاتی کشمکش کا شعور ہے حکمراں اقلیتی طبقے کے ظلم کی
دھندلی تصویریں بھی نظر آ جاتی ہیں تاہم ناول نگار نے داستان کسی نظریاتی پس
منظر میں نہیں لکھی ہے۔ ''بہاؤ'' کا بیانیہ ایک صحت مند جنسی حسیت کا سایہ بھی
فراہم کرتا ہے مگر چونکہ فیمنسٹ مکتبہ فکر کی مختلف شاخوں میں کسی کی فکر ہماری قلمرو
میں موجود نہیں ہے اس لیے یہ حوالہ زیادہ کارگر نہیں ہوگا۔ پرانے زرعی معاشروں
میں جنس کی بنیاد پر من و تو کا تصور نہیں تھا اور محنت کشوں کے مابین سانجھا سسٹم رائج
تھا جہاں شریک حیات برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے کی محنت بانٹتے تھے یہی وجہ
ہے کہ جنسی معمولات اور رومانی مشاغل میں آزادی اور خود انتخابی کا رجحان حاوی
تھا مگر اس آزادی اور انتخاب (CHOICE) میں پراگندگی۔ فحاشی اور جنسی
تجارت کا وہ پہلو نہیں تھا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے کلچر کا ناگزیر حصہ ہوتا ہے
اور اس کے ادارے جدید اور ترقی یافتہ ہونے کی دیومالا کے توسط سے اس کلچر کے
لیے جواز فراہم کرتے ہیں۔ پاروشنی، سمرو اور ورچن کے کرداروں میں جنسیت کا
جو پہلو نمایاں ہوا ہے وہ فنی و جمالیاتی تناظر سے مربوط ہے۔ وہ فطرت سے ہم
آہنگ ہے اور اپنا ایک اخلاقی نظام خود بناتا ہے۔

''پاروشنی کے چہرے پر ایک سیاہی پھیلنے لگی۔ دھروا کچھ چونکا اور
مانا کے کسی جانوں کی طرح یقین کے ساتھ بولا تو لنگ پر تیل ڈال۔ دودھ لگا۔
اپنے ہاتھوں سے اور جو پھول مل جائیں تو وہ اس پر رکھ''

''اس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر کسا ہوا لڑا ڈھیلا کر
کے کھول دیا۔ لڑے کی پکڑ سے چھوٹنے پر اس کی چھاتیاں پل دو پل کے لیے
ایسی تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کی پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھ جائے۔''

اور سمرو وہ بھی ورچن تھا اور ورچن وہ بھی سمرو تھا اور دونوں کے

ناموں سے وہ گیلی ہوتی تھی۔

آرٹ۔فن دیومالا اور عقائد کی قدامت و معنویت پر تنقید ہو سکتی ہے مگر ان کی جمالیاتی و ثقافتی اجتماعیت تاریخ کا حصہ ہوتی ہے جو ایک سے دوسرے عہد کو منتقل ہوتی رہتی ہے اور قومیت کی پہچان کا معروض بن جاتی ہے۔ اس کے لیے یہ خیال ظاہر کرنا جیسا کہ ایک حیدر آبادی اردو شاعر سکندر علی وجد نے کیا ہے:

تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
ذہن دیوالئے پن کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے

''بہاؤ'' کے بیانیہ اسلوب میں بڑی طاقت ہے اس کی پسماندہ سادگی میں اتنی صلاحیت ہے کہ بہت سی حقیقتیں جو ہمارے آپ کے تجربوں میں آتی رہتی ہیں صاف محسوس کی جا سکتی ہیں۔ یہ ایسی سچائیاں ہیں جن کے اظہار کے لیے فلسفیوں اور جدیدیت پسندوں کو بڑی پیچ دار اور مبہم زبان بنانا پڑتی ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ:

''کوئی بھی ڈھنگ جینے کا کوئی بھی ڈھنگ جب ٹوٹے تو کہیں نہ کہیں کچھ ہوتا ہے''

کچھ ہوتا ہے میں دلیل بھی موجود ہے اور معنی بھی جو پڑھنے والے اپنے تجربوں کی بنا پر جان لیتے ہیں۔ادبی متن کا کام تو اس جانکاری کے لیے فضا اور تحریک مہیا کرنا ہوتا ہے۔

''ہم نے وہ ڈھنگ خود جو بنایا ہوتا ہے، اسے لیے اس توڑ نہیں سکتے۔اور اس کے ٹوٹنے سے ہم خود ٹوٹ جاتے ہیں۔''

دورِ حاضر بعد صنعتی اور کثر الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کی زد پر ہے جس نے جینے کے ہر ڈھنگ کا خاتمہ کر دیا ہے تمام انسانوں کے اخلاقی اور ثقافتی رشتے محض کاروباری اور اقتصادی ہو گئے ہیں۔''بہاؤ'' کا کردار ''کہیں نہ کہیں کچھ ہوتا ہے'' جیسے فقرے کی وساطت سے اسی حقیقت کو نشان زد کرتا ہے اور اس مقام پر آ کر ناول اینٹی تھیسس کے نقطۂ آخر پر ٹھہر جاتا ہے۔

قسم (CATEGORY) کے حوالے سے ''بہاؤ'' قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' سے ربط رکھتا ہے۔''آگ کا دریا'' میں تاریخ کے ابتدائی دور کا جو خلا باقی رہ گیا تھا تارڑ نے اس کو پورا کر دیا ہے۔اب اردو ادب کے کشکول میں دو ایسے ناول ہیں جو برصغیر کی تہذیبی تاریخ کا مکمل بیانیہ پیش کرتے ہیں۔

بڑی یا اعلیٰ اور تاریخ میں زندہ رہنے والی تخلیق کا تعین کرنا بہت مشکل کام ہے۔اردو کی ادبی دنیا میں ۱۹۶۰ء کے بعد اس تعین کے لیے جتنے بھی مستند پیمانے تھے ختم ہو چکے ہیں۔اس جگہ جو پیمانے رائج ہیں ان میں پی آر۔سماجی حیثیت جس کا تعین جائداد اور دولت سے ہوتا ہے۔کون کس عہدے پر فائز ہے۔ بڑے اخبارات اسے شائع کرتے ہیں یا نہیں۔سرکاری اداروں سے انعامات اور اعزازات کسے ملتے ہیں۔سرکاری و نیم سرکاری علمی مباحث کی تقریبوں میں کن لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔اس صورت حالات میں اگر پوچھا جائے کہ ان تین چار سالوں میں کون سے اچھے ناول شائع ہوئے ہیں جن کو شاہکار کا درجہ دیا جا سکتا ہے تو کوئی بھی انتظار حسین کے ناول ''آگے سمندر ہے'' اور مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''بہاؤ'' کا نام نہیں لے گا جو کہ ''بہاؤ'' کے شاہکار ہونے پر دلیل ہے۔

''بہاؤ'' نے ماضی کی قدر و قیمت کا تنقیدی تناظر میں از سر نو تعین کیا ہے۔تاریخ کے ان حقائق کو جمع کیا ہے جسے نوآبادیاتی اور نونوآبادیاتی سامراجیت مسخ کر دیتی ہے۔نوآبادیاتی اور نونوآبادیاتی سامراجیت کے تجزیہ نگار امل کار کیبرال (AMILCAR CABRAL) جنہوں نے اس سسٹم کو توڑ کر سامراجیت کے رویوں اور عزائم کی جزئیات کو منکشف کیا ہے لکھتے ہیں کہ سامراجیت خواہ اس کی قسم کوئی بھی ہو اپنی گرفت اور اپنے تسلط کو یقینی بنانے کے لیے مقامی زبانوں، ثقافتوں اور روایات و تاریخ کو اپنے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔

اپنی تھیسس سے اینٹی تھیسس تک ''بہاؤ'' ایک منظر اور ایسی فضا میں حرکت کرتا ہے جن کو نوآبادیاتی اور نونوآبادیاتی سامراجیت کے نمائندہ اسالیب بیان ٹیکنیک اور رجحانات نے کسی بھی سمت سے مس نہیں کیا ہے۔''بہاؤ'' کا متن ناموجود کو موجود کے ساتھ مربوط کر کے ایک آزاد و خود مختار مقامی و قومی کلچر کی نشان وہی کرتا ہے جسے بجا طور پر قومی تمثیل NATIONAL ALLEGORY کہہ سکتے ہیں۔کیا سسٹم ناول اور قومی تمثیل کی سطح تک پہنچ جانے کے بعد بھی اہلِ نقد و نظر بہاؤ کو ادبی شاہکار نہیں کہیں گے؟

''ناولوں کی گھن گرج''

کبھی کبھی ہمیں یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ اپنے مستنصر حسین تارڑ سفر ناموں میں جس قدر شوخ اور چونچال نظر آنے لگے ہیں کبھی اگر انہوں نے مزاح کا قصد کر لیا تو ہمارا رخ کس جانب ہوگا؟ پھر اُن کے ناولوں کی گھن گرج کانوں میں پڑتی ہے تو سانس کے آنے جانے کا سفر دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ تارڑ صاحب تو شاید مزاح کے باب میں بھی کچھ نہ کچھ دال دلیہ کر ہی لیں مگر ناول کے باب میں کچھ کرنا تو کجا سوچ کر ہی ہمارا سر چکرانے لگتا ہے۔ تو میاں مستنصر حسین تارڑ ہم آپ کی کامیابی کے لیے خلوص دل سے اُس وقت تک دعا گو رہیں گے جب تک آپ ہماری آکسیجن پر پاؤں نہ دھریں گے وگرنہ پیٹ سے بڑھ کر بھی کوئی چیز انسان کو عزیز ہو سکتی ہے بھلا! سو میاں جہاں رہو خوش رہو اور ہماری خوشی پر لات مارنے کی قطعی کوشش نہ کرو۔

سید ضمیر جعفری

''فریموں کے اندر لکھا گیا ناول''

خالد فتح محمد

(گوجرانوالہ)

ناول طویل نثری بیانیہ ہے جس میں ناول نگار کرداروں اور واقعات کے ذریعے کسی تسلسل سے ایک کہانی کو بیان کرتا ہے۔فن کی اصناف میں ناول کو زندگی کا صحیح عکاس سمجھتا جاتا ہے اسی لیے بعض اوقات یہ زندگی سے بڑا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات شعوری کوشش کی جاتی ہے کہ یہ زندگی سے بڑا ہو جائے۔''آگ کا دریا'' کے زندگی سے بڑا ہونے میں گوتم نیلمبر ایک رکاوٹ ہے اور ''اداس نسلیں'' بھی بڑا ہو جاتا اگر Essentials اور Non Essentials کے فرق کو سمجھ لیا جاتا اور ''خس و خاشاک زمانے'' کے بعض کرداروں کو زندگی سے بڑا نہ دکھایا جاتا تو یہ زندگی سے بڑا ہو سکتا تھا۔اگر ادبی ''وزن'' کو دیکھا جائے تو ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغات''، ''باگھ''، اور ''بہاؤ''، ضخیم ناولوں سے ''بھاری'' ہیں۔ہمارے پارکھوں نے خود کو ضخیم ناولوں کے صفحات میں اپنی تمام تر تجزیاتی صلاحیتوں کے ساتھ ایسے فن کر دیا ہے کہ کم ضخامت والے ناول اُن کے نزدیک اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں اور یا وہ خائف ہیں کہ ایسا کرنے سے اُن کا مقام خطرے میں پڑ جائے گا۔سچ تو یہ ہے کہ ان ناولوں کو جدید ادبی منظر نامے میں ری وزٹ کیے جانے کی ضرورت ہے۔''ایک چادر میلی سی'' اور ''لندن کی ایک رات'' کم ضخامت کے ہونے کے باوجود اگر زندگی سے بڑے نہیں تو زندگی کو مس ضرور کر رہے ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ اردو ضخیم ناولوں کی متحمل نہیں ہو سکتی؟ یا ہمارے ناول نگاروں کے پاس زندگی کا اتنا تجربہ نہیں کہ وہ ضخیم ناول کو ضروری توازن بہم پہنچا سکیں؟ اور یا پھر ہمارا معاشرہ ناول نگار کو ایسا پلیٹ فارم مہیا نہیں کر پا رہا جو ضخیم ناول کو زندگی کا عکاس بنا سکے؟

مستنصر حسین تارڑ بسیار نویس ہے اور بسیار نویس ہونا ایک ادبی صفت ہے، دراصل بسیار نویسی ہی ایک لکھاری کی تخلیقی قوت کی نشان دہی کرتی ہے۔زندگی میں ایک ناول یا افسانوں کا ایک مجموعہ تحریر کر دینا دراصل مصنف کے فکری دیوالیہ پن کو ظاہر کرتا ہے: ایسے مصنف جتنی بھی معرکتہ الآرا تخلیق کر جائیں وہ بسیار نویسوں کے تخلیقی وفور کے آگے بہہ جاتے ہیں۔''اے غزالِ شب'' تارڑ کی تخلیقات میں تازہ ترین اضافہ ہے جس کا آغاز ایک فینٹسی لگتا ہے۔جدید حقیقت نگاری میں اسرار، فینٹسی اور ہولوسی نیشن فکشن کا اہم جزو ہو گئے ہیں اور اگر ایسا نا ہوا ہوتا تو فن پارہ ایک خبر کی سطح سے بلند نا ہو پاتا۔علامت نگاری کو جدید فکشن کے ان تین اجزا کے ساتھ زیرِ بحث لانا علامت کی اہمیت کو کم کرنا ہے کیوں کہ فکشن پارہ اسرار، فینٹسی یا ہولوسی نیشن کے بغیر تو مکمل ہو سکتا ہے، علامت کے بغیر نہیں۔''اے غزالِ شب'' میں پاکستان کے چند نظریاتی نوجوان اپنے آدرشوں کے تعاقب میں روس، ہنگری اور مشرقی جرمنی میں مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔یہ بظاہر ایک فینٹسی ہی لگے گا کیوں کہ ایسا کم کم ہوتا ہے کہ کوئی معاشی مفادات کو ترک یا نظر انداز کر کے اپنی زندگی کو آدرشوں کے حصول کے لیے وقف کر دے۔وہ لوگ اُن ممالک میں پچھلی صدی کی پچاسویں اور ساٹھویں دہائی کے آغاز میں گئے تھے۔سمرسٹ موہم نے دنیا کے اُن تمام ممالک کو اپنی کہانی کا لوکیل بنایا وہ جہاں جہاں گیا، خواہ ملایا ہو یا کوئی اور دور دراز کا خطہ، وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کوئی ایسا شخص یا علاقہ نہیں جس سے اُس کی شناسائی ہے اور اُس نے اُس کے متعلق نہیں لکھا۔''دنیا نوردی'' یقیناً تخلیقی اہلیت کو نکھار دے کر تجربے کی وسعت اور علم کی گہرائی پر منتج ہوتی ہے اور تارڑ نے اپنی سیاحی کو اپنے فکشن میں ایسے سمویا ہے کہ اُس کا سفرنامے میں سے فکشن کو یا فکشن میں سے سفر نامے کو الگ کرنا ممکن نہیں''اے غزالِ شب'' میں تارڑ جہاں سویت یونین کے بعد کے روس اور مشرقی یورپ کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی منظر نامے کو قاری کے سامنے رکھ رہا ہے اور اُن کے اندر کردار اپنی پیچیدہ زندگیاں کر رہے ہیں وہاں اُن کے گرد و پیش سے کبھی بے خبر نہیں ہوا اور قاری کو وہ تمام مقامات دکھا رہا ہے جہاں کہانی کھل رہی ہے۔یہ نوجوان جب اُن ممالک میں گئے تو سوویت روس ایسے دور سے گزر رہا تھا جس میں اُس کے قائدین نے غیر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی بنیادوں کو معاشی طاقت سے مضبوط کرنے کے بجائے وسعت پسندی سے آغاز میں ہی کھوکھلا کرنا شروع کر دیا جو اختتام کا آغاز تھا۔یہ نوجوان اپنے نظریے کے مسمار ہونے سے زیادہ سوویت روس کے ناکام ہونے سے مایوس ہوئے۔سوویت روس کے ٹکڑے ہونا اُن کے نظریے کی شکست تھی جو اُنہیں بار بار شک میں مبتلا کر دیتا کہ کیا وہ اپنے آدرش کے انتخاب میں غلط تو نہیں تھے؟ اور ایسے موقعوں پر جیسے ہوتا ہے، ویسے ہی ہوتا: وہ اپنے شہروں کو یاد کرتے ہوئے وہاں جانے کا سوچنے لگتے۔

اے حمید ہر نئے فکشن نگار کو ایک وقت تک اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔انہوں نے سیاحی کو اپنے فکشن کا حصہ بنا کر اُس وقت کے فکشن کو نئی وسعت اور گہرائی دی۔وہ سیلون (سری لنکا) اور برما جا چکے تھے، انہوں نے اپنی اس سیاحت کو اپنے فکشن میں گوندھ کر بعد میں آنے والوں کے لیے ایک نئی راہ روشن کی۔دوسرا انہوں نے لاہور کے گلی کوچوں اور باغوں کو اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔بعض اوقات لوکیل کو اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا، ''بستی'' ایک مثال ہے، ''غدار'' اور ''ایک چادر میلی سی'' کا لوکیل سیال کوٹ کا گرد و نواح ہے اور یا پھر بلونت سنگھ نے لالہ موسیٰ اور پبی کی پہاڑیوں کے درمیان میں اپنے کرداروں کے ذریعے گہرے نقوش چھوڑے۔لاہور شروع سے ثقافتی اور تہذیبی مرکز تھا اور اس کا فکشن پر اثر انداز ہونا لازمی تھا لیکن اے حمید تنگ و تاریک گلیوں میں قاری کی

انگلی تھامے ایسے لاہور کا نظارہ کرواتے رہے جس نے وقت کے ہاتھوں مار کھا جانا تھی اور تارڑ نے انہیں گلیوں کو اپنے کرداروں کے ذریعے زندہ کر دیا جب وہ سرخ شیشوں والے گھر میں رہے جہاں رات کو موم بتیاں جلتی تھیں اور دن کو شیشوں میں سے سرخ رنگ چھلکتا تھا جو کائنات کا رنگ ہے۔لوکیل فکشن کی اثر انگیزی میں ایک اہم عنصر ہوتا ہے۔فکشن نگار جب کسی خیالی لوکیل پر اپنی کہانی تعمیر کرتا ہے تو اس نے کسی مصلحت کے تحت اصل لوکیل پر خیالی لوکیل کو مسلط کیا ہوتا ہے۔سٹیفن کرین نے فرضی لوکیل تعمیر کر کے the red badge of courage لکھا جو ایک فرضی کہانی ہونے کے باوجود حقیقی تھی۔تارڑ لوکیل کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔''خس و خاشاک زمانے'' میں اُس نے اپنے لوکیل کو بھی ایک طرح سے کردار بنا دیا ہے اور شرقی وغربی گکھڑ اور اردگرد کے دیہات ناول کے پُر تاثیر ہونے میں اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ کہانی بذاتِ خود ایسے ہی ''غدار'' میں قلعہ سوبھا سنگھ کے پاس چھوٹا سا لالہ نام کا ایک گاؤں کہانی کا کردار ہے۔''اے غزالِ شب'' میں تارڑ نے اپنے لوکیلوں کو بہت اہمیت دی ہے۔اُس نے اُنہیں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہوئے قاری تک پہنچانے کے ساتھ شفیق الرحمٰن کی آنکھ کی بینائی سے بھی کام لیا ہے جس نے بیانیہ عمل میں جمالیاتی قدر کا اضافہ کیا ہے۔وہ شفیق الرحمٰن کا ذکر ایک گداز اور کسک کے ساتھ کرتا ہے۔ریڈ سکوئیر، کریملن، برچ کے درخت، ڈینیوب، دیوارِ برلن، فصیل کے اندر کا لاہور، سرخ رنگ کے شیشے والا کمرہ جہاں موم بتیاں جلتی تھیں، دریائے راوی، کوارٹر جہاں سانپ شہتیر کے اندر رہتا تھا (یہ الگ بات کہ پاؤں نا ہونے کی وجہ سے سانپ دیوار پر رینگ کے چڑھ نہیں سکتا) اور چوہا، بورے والا میں گنواں اور اکوں کی مائی بوڑھیاں، شوٹالے کے کھیت اور فردوس مارکیٹ کے پیچھے غریب کالونی نے کہانی کے تاثر اور کرداروں کی تازگی اور نئے پن کو برقرار رکھا ہے۔''بستی'' کے کردار کسی بھی لوکیل میں اُتنے غیر موثر ہوتے جتنے کہ ہیں لیکن ''اے غزالِ شب'' کے کرداروں کو اس کہانی سے نکال کر کسی اور لوکیل کا حصہ بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ بے رنگ ہو کر رہ جائیں گے کیوں کہ ان میں آفاقیت ہونے کے ساتھ ناول میں اپنی ذمے داری نبھانی ہے، وہ original ہیں اُنہیں مصلحت کے تحت تعمیر نہیں کیا گیا۔اے حمید کی طرح تارڑ کو اپنے لوکیل پر عبور ہوتا ہے۔اُسے مکان اور مکینوں کے رشتے کا علم ہے اور وہ دونوں کو ایک دوسرے کا حصہ بنا کے رکھتا ہے۔

ایک طویل عرصہ اپنے ملک سے باہر رہنے والے لوگ اپنے نئے ملک کا حصہ بن جاتے ہیں کیوں کہ نیا ملک اُن کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے والی کان ہوتی ہے۔''اے غزالِ شب'' کے کردار سویت روس کی ناکامی کے بعد اُن ممالک کا حصہ نہیں رہے تھے لیکن اُن کے خواب انہیں اُن ملکوں کے ساتھ جوڑے ہوئے تھے۔خواب انسان کو زندہ رکھتے ہیں، ایک ٹوٹتا ہے تو نیا بن جاتا ہے۔ان لوگوں نے اپنی زندگیاں تو وہاں بنالی تھیں لیکن وہ اپنے اندر سے خاص کر سویت روس کے ٹوٹنے کے بعد آبائی شہروں کو اپنے زندہ پا رہے تھے اور وہ اُس عمر کو پہنچ چکے تھے جہاں ایک بار اپنے کوچے اور بازار دیکھنے کو دل کرتا ہے۔

فکشن کے تین اہم اور بنیادی جزو ہیں: پہلا لوکیل، دوسرا کردار اور تیسرا کہانی: ان کی ترتیب کوئی بھی ہو سکتی ہے۔کئی فکشن نگار کرداروں کے ذریعے کہانی چلاتے ہیں، کردار کہانی کا حصہ ہونے کے بجائے کہانی اپنے اندر لیے ہوتے ہیں: کہانی دراصل مفعول ہو کر کرداروں کی تابع ہو جاتی ہے۔جہاں کردار کہانی کا حصہ ہوتے ہیں وہاں فکشن نگار قدرے سہولت میں ہوتا ہے اور کہانی کو کھولتے ہوئے اُس پر کردار اپنی پابندی عائد نہیں کرتے کہ وہ کہانی کے پابند ہوتے ہیں۔ان دونوں حالتوں میں لوکیل کی اہمیت ایک مستقل Factor ہے۔

''اے غزالِ شب'' کرداروں کی کہانی ہے جو کہانی کو اپنی مرضی کے مطابق کھولتے ہیں، وہ تارڑ کے تابع نہیں۔اگر وہ تارڑ کے تابع ہوتے تو وہ تارڑ کی کہانی میں ہوتے، نا کہ کہانی اُن سے ہوتی۔''اے غزالِ شب'' میں اگر دیکھا جائے تو کوئی کہانی نہیں اور اگر کرداروں کی محرومی، اکلاپے، تنہائی، اداسی، مایوسی اور idiosyncracies کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ازل سے جاری اُس کہانی کو لیے آگے چل رہے ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کے نظریوں پر مبنی ہوتی ہے۔انسان کبھی نظریے کے بغیر زندگی نہیں کر سکتا۔اُسے اس کائنات میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے ایک نظریے کی ضرورت ہوتی ہے، یا اگر یہ کہا جائے کہ اُسے نظریے کی نفسیاتی بھوک ہے تو غلط نہ ہوگا۔ناول کے کردار نظریاتی لوگ ہیں اور سویت روس کے ٹوٹنے کے بعد اُن کی زندگی شوٹالے کے اس کھیت کی طرح ہو جاتی ہے جو پھول آنے سے پہلے پانی کے بغیر سوکھ جائے۔انہوں نے اپنی زندگی ایک نظریے کے تعاقب میں گزاری تھی اور اب زندہ رہنے کے لیے انہیں نظریہ ہی چاہیے چناں چہ وہ طالبان کا ساتھ دینے کا سوچتے ہیں۔اس سے پہلے اُن کی زندگی کا نظریہ دائیں بازو کو ختم کرنا ہوتا ہے اور وہ جنہیں نظریے کی بالادستی پر یقین تھا، اب کسی نظریے کے بھوکے تھے! یہ تارڑ کا انسان کی نظریاتی بھوک کی طرف ایک اشارہ ہے اور نظریہ نا رکھنے والے گنتی کے چند لوگوں پر طنز بھی ہے۔''اے غزالِ شب'' میں کہانی کرداروں کے اندر کسی گہرائی میں چھپی ہوئی ہے، وہ سمندر میں زیرِ آب چلنے والی روؤں کی طرح ہیں جو نظر آئے بغیر سمندروں کو ملاتی ہیں۔ اُن روؤں کی طرح کہانی اوپر سے ساکن نظر آتی ہے اور قاری کرداروں کی فکری تشنگی کے بارے میں پڑھے جا رہا ہے جب کہ کنہ میں ایک بھونچال برپا ہوتا ہے۔کردار اتنے شکست خوردہ ہوتے ہیں یا شکست کے اتنے عادی ہو گئے ہوتے ہیں کہ خود کو بھی شکست دینا چاہتے ہیں، وہ قطعاً اپنی بربادی نہیں چاہتے لیکن اس شکست میں امیر ہو کے وہ سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دینا چاہتے ہیں۔یہ تارڑ کے تخلیقی جوہر کی انتہا ہے۔یہ ایک پھیلی ہوئی اور گنجل دار کہانی ہے، جو مرحلہ وار چلی ہے اور جس کے ہر مرحلے میں تارڑ نے قاری کو اپنے کرداروں کے حوالے سے کہانی کو کوئی موڑ دیے بغیر دلچسپ اور معنی خیز رکھا ہے۔سوائے ہندوستانی کروڑ پتی کے کوئی کردار بیگانہ، اجنبی یا کہانی سے باہر نہیں لگتا۔

عزیز احمد کے ہاں ''آگ'' کے علاوہ حیدرآباد (دکن) کی تہذیب کو ہی کسی نا کسی طرح موضوع بنایا گیا ہے، قرۃ العین حیدر نے وسط ہند کی پرانی اور نئی وجود پانے والی معاشرتی حد بندیوں پر اپنے ناول تخلیق کیے ہیں، کشمیر کرشن چندر کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور بلونت سنگھ نے پنجاب کے اُن لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو اخروٹ کی طرح اندر سے نرم نہیں ہوتے۔ ہر فکشن نگار کا اپنا ایک میدان ہوتا ہے جس میں کھیلتے ہوئے وہ اپنے آپ کو پُر اعتماد سمجھتا ہے یا اُسے با اعتماد رہنے کے لیے ایک شناسا ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فکشن ہمیشہ شناسا ماحول کے اندر رہتے ہوئے ہی لکھنا چاہیے کیوں کہ اس سے غلطی کے امکان کم ہو جاتے ہیں اور یا پھر ایسا فکشن پارہ حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے۔ ناشناسا ماحول میں لکھا جانے والا فکشن، فکشن نگار کو جگہ بدلتی ہوئی ریت کے بیچ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ناول نگار کا قلم اُس کا لینز ہوتا ہے جو ہر تصویر کو نیا زاویہ دیتا ہے۔ ''دھنی بخش کے بیٹے'' میں اندرون سندھ کا ماحول نامکمل ہونے یا ایک تشنگی کا احساس دلاتا ہے جب کہ ''انسان، اے انسان'' کے ایک مختلف ماحول میں تشنگی، تکمیل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نا آشنا ماحول کا فن پارہ اُس فرضی قصے کی طرح ہوتا ہے جسے داستان گو سوچے بغیر بیان کیے جاتا ہے اور جو سامع پر جلد ہی بوجھ بننا شروع ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا۔ ایک محدود شناسا ماحول کے اندر رہتے ہوئے لکھنا فکشن نگار کا ضعف ہے۔ فکشن نگار تو کاک پٹ میں بیٹھے اُس پائلٹ کی طرح ہوتا ہے جس کی نظر سامنے میل ہا میل پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تارڑ بھی اُس پائلٹ کی طرح ہے جس کی نظر میلوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

''اے غزالِ شب'' کا کینوس وسیع ہے اور وسیع کینوس پر تصویر بناتے ہوئے کچھ حصے ایسے بھی ہوتے ہیں جو توجہ طلب رہ جاتے ہیں یا ہر حصے کو ایک ہی جتنی اہمیت دینا ممکن نہیں ہوتا اور یا پھر مصور اپنے ہی کینوس کی وسعت سے خائف ہو کر ترجیحات پر کام کرتا ہے، تارڑ نے اپنے وسیع کینوس پر ہر تصویر اور رنگ واضح رکھا ہے۔ یہ ناول بیک وقت دو براعظموں پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ ایک بین الاقوامی سرد جنگ کو سامنے لا رہا ہے، جس میں اُس کے کردار نادانستہ طور پر، اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اُس جنگ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ جنگ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان میں لڑی جا رہی ہے جس میں اشتراکیت کے سپاہی بددل ہو کر سرمایہ دار بن جاتے ہیں لیکن اُن کے اندر کا اشتراکی ابھی تک زندہ ہے۔ وہ دولت کے انباروں پر اُس مرغ کی طرح اکڑ اکڑ کر کھڑے جائزہ لے رہے ہیں جو ایک روہڑی کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہو۔ اس کہانی کو متعدد لوگ اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہیں جن میں ایک جسموں کا کاروبار کرنے والا پاکستانی مکار دلال ہے جس کی برآمد کی ہوئی جنس پاکستان آ کر ایک پاکستانی انقلابی کی اُس جوانی کا سواگت کرتی ہے جسے وہ بوڑھا ہونے کے بعد وقت کے ماسکو کی برفوں میں کہیں دفن کر آیا تھا۔ کہانی کے ان کرداروں میں کے جی بی کے بدنامِ زمانہ آئی ون دی ٹیریبل کا لاہور سے آنے والا، ایک انقلابی شاعر کا بیٹا ہے جو اُس کا داماد بننے کے بعد اُس کے پلاسٹک کے پاخانوں کا نگران بن جاتا ہے۔ ان لوگوں نے وہاں مقامی عورتوں سے شادیاں کر لی ہیں اور اُن کے بچے بھی ہیں اور روس میں رہنے والے ایک طرح سے نا آسودہ ازدواجی زندگیاں گزار رہے ہیں کہ ماسکو کی عورتیں اور وہاں پیدا ہونے والے بچے اپنے خاوندوں اور باپوں کی idiocyncries سے ناواقف تھے۔ وہ جب پاکستان آتے ہیں تو بیویوں اور بچوں کو اُن کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ تارڑ جدید فکشن کے تقاضے سمجھتا ہے اور کئی ہم عصروں کی طرح جذبات نگاری اُس کا forte نہیں ہے۔ جذبات نگاری دراصل ایک فن پارے کو عام مقبولیت کی سطح پر لے آتی ہے جو اُس کی موت کا آغاز ہوتا ہے۔ ''اے غزالِ شب'' کا ماحول بوجھل، گھٹا گھٹا اور اُداس ہے۔ یہ لوگ اپنی شناخت کو پہچاننے اور قائم رکھنے کی جنگ میں مبتلا ہیں۔ وہاں اُن کے بیوی بچے ہیں جو زندگی کا اہم حصہ اُن کے ساتھ گزارنے کے باوجود اُنہیں اپنا نہیں سکے اور جب یہ پاکستان آتے ہیں تو انہیں ان کی کمی اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے، یہ ایک ایسا انسانی جذبہ ہے، جس کا تجربہ اس عمل میں سے گزر کر ہی کیا جا سکتا ہے اور فکشن نگار ایسی تمام کیفیات اپنے اوپر طاری کر کے لکھتا ہے۔ جب یہ لوگ پاکستان میں اپنے ماضی کو کھوج کر اس میں عارضی طور پر چند سانس لینا چاہتے تھے، وہاں وہ لوگ اُن کی محبت میں بے چین انہیں اپنے سے کبھی جدا نا کرنے کا سوچ رہے تھے۔ تارڑ نے یہ پھسلن والی کیفیت کمال ہنرمندی سے نبھائی ہے۔ عارف نقوی اس ہنرمندی کی ایک اور مثال ہے جو اپنی اداکاری سے آڈیشن لینے والوں کو دھوکہ دینے کی اداکاری میں اپنے ساتھ بھی اُس وقت تک اداکاری کرتا جاتا ہے جب تک اپنی آخری سانس نہیں لے لیتا، یہ بھی شاید ایک اداکاری ہی تھی اور عین ممکن ہے وہ اب بھی زندہ ہو۔ ''اے غزالِ شب'' میں تارڑ نے فلیش بیک کو جدید طریقے سے استعمال کیا ہے، ایک کردار خود بخود کہیں راوی اور کہیں صیغہ غائب بن جاتا ہے۔ یہ تکنیک نئی تو نہیں، اِسے وکی کولنز انیسویں صدی میں Woman in white میں برت چکا ہے لیکن تارڑ نے اپنے ناول کو direct اور in direct تکنیک سے بھی کھولا ہے۔ کیتھرائن روس میں شبنم والے کھیتوں کی ٹھنڈک سے اپنے بدن میں آگ بھڑکاتی ہوئی، سرجی کو سیراب نا کر سکی تھی لیکن بورے والے کے گردونواح میں ظہیر کی، اپنے باپ کے ایک انقلابی دوست کے بیٹے کے ساتھ جو انقلاب کے نعروں کے بیچ میں کہیں جاگیردار بن گیا تھا، ملاقات کپاس کی گانٹھوں کے پاس پڑی چارپائی پر اُسی کیتھرائن سے ہوتی ہے جو سرجی کو سیراب نہ کر سکی تھی اور جسے پاکستانی دلال نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی خدمت کے لیے روس سے برآمد کیا تھا۔ فکشن کے ایسے اتفاقات اُس کے مقبول عام ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بشرطیکہ فکشن نگار ان اتفاقات کو جتنا قدرتی بنانا ممکن ہو بنا سکے! کیتھرائن، سرجی اور ظہیر تارڑ کی اُس تکون کا حصہ ہیں جو بظاہر ایک اتفاق نظر آتی ہے لیکن یہ ایک ایسی قوم کا المیہ ہے جو چند برس پہلے شطرنج کے عالمی کھیل میں اپنی چالیں خود طے کرتی تھی جب کہ

اب اپنی عورتوں کو برآمد کرنے پر مجبور ہے۔

فلم اور فکشن ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے، دونوں کا بنیادی مقصد کہانی بیان کرنا ہوتا ہے، صرف ذریعے کا فرق ہے۔ فلم کیمرے اور فکشن قلم کے ذریعے اپنی کہانی بیان کرتے ہیں۔ راج کپور پچھلی صدی کا ایک اہم فلم ساز اور ہدایت کار ہوا ہے۔ اُس نے اپنے کیریئر کے آخری حصے کے فلموں میں کہانیوں کو فریموں کے ذریعے پیش کیا۔ بڑے بڑے فریم تھے جن میں کہانی بظاہر ٹھہری ہوئی لیکن متحرک ہوتی تھی۔ چناں چہ ایک فریم سے دوسرے فریم کے درمیان میں کہانی ساکن ہوتی تھی اور پھر نئے فریم کے اندر حرکت میں آ جاتی تھی۔ اس تکنیک کی کامیابی صرف ایڈیٹنگ پر ہے اور بعض اوقات راج کپور کی ایڈیٹنگ کمزور ہوتی تھی جو فلم کے مجموعی تاثر پر اثر انداز ہوتی۔ ''اے غزالِ شب'' فریموں کے اندر لکھا گیا ناول ہے۔ راج کپور نے ''میرا نام جوکر'' کے فریموں کو زندگی سے بڑا بنانے کی کوشش کی لیکن تارڑ نے اپنے فریموں کا سائز اُتنا ہی رکھا جتنا اُس وقت کہانی کی ضرورت تھی۔ ظہیر اگر اکوں کی مائی بوڑھیوں کے پیچھے بھاگتا ہے تو یہ ایک ایسے فریم کے اندر ہو رہا ہے جس میں حال کے ساتھ ساتھ فلیش بیک بھی ہے اور جہاں یہ فریم اپنے آپ کو گھسیٹنے کی کیفیت میں آتا لگتا ہے، تارڑ نیا فریم کھول دیتا ہے۔ ''اے غزالِ شب'' کی کہانی برونی اتفاقات کے بجائے فریموں کے اندر چلتی ہے۔ ایک فریم کے اندر رہتے ہوئے تارڑ کی ہنروری شک کے سائے تلے آتے محسوس ہوتی ہے تو دوسرے فریم میں جاتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ شک نہیں، اُس وقت کہانی کی ڈیویلپمنٹ کا حصہ تھا۔ کہانی کا آخری فریم جہاں عارف نقوی اپنا آڈیشن دیتا ہے ایک مقام پر کمزور ایڈیٹنگ کا شکار ہونے لگتا ہے لیکن فریم کے اندر کہانی آہستہ آہستہ، اپنے انجام کی طرف تیزی سے جا رہی ہوتی ہے، جو بادی النظر میں، رینگتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ایک اور مثال بورے والا کے ایک جاگیردار کے فارم کی ہے جہاں دو روسی لڑکیاں لائی جاتی ہیں جن کو بھیجنے والا ایک مکروہ صورت والا پاکستانی دلال ہے جو پہلے کسی فریم میں متعارف ہوا تھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس فریم میں وہ in directly کیتھرائن کے ذریعے متحرک ہوتا ہے جو شوٹالے کے شبنم سے بھرے کھیتوں کی ٹھنڈک سے اپنے بدن کو آگ بداماں کرتی ہے اور اسی آگ کی بدولت ظہیر کے بوڑھے اور ڈھیلے جسم میں آہستہ آہستہ اپنی آگ داخل کر دیتی ہے۔

''اے غزالِ شب'' میں ڈینیوب کی روانی ہے۔ ڈینیوب کا بہاؤ کسی طغیانی کے بغیر مسلسل ہے لیکن ناول میں کئی طغیانیاں ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ بہائے پھرتی ہیں۔ ڈینیوب کے کنارے سے آنے والی نیم پاکستانی اور نیم خانہ بدوش لڑکی جو لاہور میں اپنے باپ کے گھر کی تلاش میں آتی ہے، اس کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک کوئی نئی بات تو نہیں لیکن تارڑ نے اُسے کسی بھی وقت اخلاقیات کی نذر کرتے ہوئے مصلح بننے کی کوشش نہیں کی، جہاں بھی فکشن نگار اپنے اندر ایک اصلاحی پہلو لے آئے، بطور فکشن نگار اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تارڑ ایک بیباک حقیقت نگار ہے جس کے ہاں انسانی رشتوں کی ایک کبھی ختم نا ہونے والی زنجیر ملتی ہے جو سرحدوں کی پابند نہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں بین الاقوامی فکشن ایک لمبی جست لگا کر ایسے علاقوں میں داخل ہو گیا ہے جس میں ہمارے نقادوں نے اپنے فکشن نگاروں کے داخلے کو ناممکن بنا دیا ہے جو فکشن کے اگلی سمت کے سفر میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر اردو ناول کو زندہ رکھنا ہے تو ناول نگاروں اور نقادوں کو جدید ناول کے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا!

۱۷۔نومبر ۱۹۸۰ء

جناب خانہ بدوش صاحب، السلام علیکم۔

آپ کے ''محترم ضمیر'' کی بجائے یہ نامحترم جواب دے رہا ہے۔ دراصل وہ پہلا مطبوعہ خط، چند غیر مطبوعہ باتوں کے ساتھ میرے قلم سے ہی براہ راست چیمبرلین روڈ پر جانا چاہیے تھا مگر دفتر میں بہت سی کارروائیاں بے سوچے سمجھے مشینی سے انداز ہو جاتی ہیں۔ بہرحال مزاج شریف، ''خانہ بدوش'' میں کب سے مگن ہیں؟ ہم تو سمجھے آپ کو ٹی وی ڈراموں ہی سے فرصت نہ ملی ہوگی (اگلے روز ایک لڑکی کا خط آیا۔ دوستی کا دعویٰ ہم سے تھا لیکن ایک جملہ یہ تھا: آج دی شام'' میں تارڑ بہت پیارا لگتا ہے۔ میں اسی کی وجہ سے پروگرام دیکھتی ہوں۔ میں نے اسے آپ کا پتہ لکھ دیا ہے۔ اگر ثواب کا موقع ملے تو آدھا ہمارے نام لکھیے گا۔)

ہاں تو ''خانہ بدوش'' کس منزل میں ہے اور کتنا سفر باقی ہے؟ میری ''بزمِ آرائیاں'' آج کل شائع ہونے والی ہے۔ ''اردو پنچ'' کے لیے آپ کا خوش پارہ چاہیے۔ تاریخ کی ایسی شدید قید نہیں۔ ۳۱۔نومبر تک بھیج دیں۔ یہ ''خانہ بدوش'' کا باب ہو یا خانہ نشیں کا ہمیں اس میں مزاح نگار مستنصر نظر آنا چاہیے۔ جیسا کہ میں نے ''بزم آرائیاں'' میں اشارہ کیا ہے۔ مستنصر مزاح نگار بھی ہے اور بہت کچھ اور بھی لیکن اردو پنچ کو ہم حتی الوسع طنز و مزاح (طنز کم، مزاح زیادہ) تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سو اگر ''خانہ بدوش'' ہی سے کچھ دینا ہے تو براہ کرم وہ باب منتخب کریں جو باقیوں سے زیادہ گدگداتا ہو۔

محمد خاں (کرنل)

''نگری نگری گھومنے والا مسافر''

ڈاکٹر سفیر اعوان
(اسلام آباد)

مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے پاکستانی مصنف ہیں جو میڈیا اور اکیڈیمیا میں یکساں شہرت رکھتے ہیں۔ نگری نگری گھومنے والے سفر نامہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، ٹی وی میزبان اور ایک کالم نگار کی حیثیت سے ان کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ تاہم علمی حلقوں (Academia) کے لیے ان کے ناول ہی ان کے ڈھیر سارے تخلیقی کام کا سب سے بڑا مظہر ہیں۔ ان کے تخلیقی سفر کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں انہوں نے ایسے ناول لکھے جو ان کے لیے عوامی مقبولیت کا باعث بنے کیونکہ ان میں انہوں نے نسبتاً نوجوان قارئین کے احساسات اور خواہشات کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں میں ''پیار کا پہلا شہر''، ''جپسی'' اور ''پکھیرو'' اہم ناول ہیں۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو ناول تنقیدی و تحقیقی حلقوں میں ان کی پذیرائی کا باعث بنے وہ ان کی تخلیقی زندگی کے دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ''بہاؤ'' (1993ء) ''راکھ'' (1997ء) اور ''قربت مرگ میں محبت'' (2001ء) شامل ہیں، جو تارڑ کے اپنے بقول ایک طرح کی سہ المیہ (Trilogy) ہیں۔ میری رائے میں جو کردار ان ناولوں کو ایک Trilogy میں پروتا ہے وہ روشنی ہے۔ زندگی کی قوت تخلیق (Life Force) کی علامت پاروشنی دھرتی ماتا (Mother Earth) کی مانند ہے۔ جو زمان و مکاں کی وسعتوں پر محیط ہستی کے ابدی بہاؤ کی مظہر ہے۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ یہی کردار مستنصر کے نئے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' (2010ء) میں بھی جلوہ گر ہوا ہے۔

ناول کے اہم موضوعات اور مباحث:

740 صفحات پر محیط اور باریک لکھائی میں چھپے ہوئے اس ناول میں مصنف نے بے شمار تاریخی اور معاصر حالات و واقعات کو فکشن کے پیرائے میں سمویا ہے۔ ان میں سے کچھ تو محض صحافتی نوعیت کے حامل ہیں تاہم تارڑ کا اسلوب اور زبان ان کو بھی ادبِ عالیہ میں ڈھال دیتا ہے۔

قبل از تقسیم کے ہندوستان اور بعد از آزادی کے پاکستان سے لیے گئے سیاسی حوالوں کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی نوعیت کے کئی ایک موضوعات کو بھی تارڑ نے پیچیدہ کہانی کاری کی بُنت کا حصہ بنا دیا ہے۔ ان میں سے کچھ موضوعات یہ ہیں:

سیاسی سازشوں کی بدولت پاکستانی معاشرت اور ریاست کی بدحالی، فوجی حکومتوں اور مُلاؤں کا گٹھ جوڑ، جلاوطنی اور پردیس میں اجنبیت کا احساس، بدیسی بیزاری (Xenophobia)، امریکی ذرائع ابلاغ کے بعد از 9/11 بازاری کردار پر تنقید، تہذیبوں کا ٹکراؤ، مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کی شادیوں میں ''غیرت'' کا تکلیف دہ کردار، شدت پسندی کے اثرات اور امریکی فوجی مہم جوئی کی بدولت بنیاد پرستوں کی ایک نئی کھیپ کی افزائش، ثقافتی نسبتیت (Relativism) مذہبی تکثیریت (Pluralism)، مغربی طرز کی ہم جنس پرستی اور اس کا تقابل پاک و ہند کی مرد محبوب پرستی کی روایت، ڈنمارک کے ایک آرٹسٹ کے توہین آمیز خاکوں پر پُرتشدد مظاہرے وغیرہ۔

بلاشبہ ان میں سے کچھ موضوعات بالخصوص سماجی و سیاسی محرکات، تارڑ کی پچھلی تخلیقات میں بھی شامل رہے ہیں۔ ان سب موضوعات پر سیر حاصل بحث اس مختصر مقالے میں ناممکن ہے۔ تاہم چند اہم موضوعات پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالنے کے بعد ناول کے فنی محاسن کا مابعد الجدیدی تنقید کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۔ قبل از تقسیم کے پنجاب کے صدیوں پرانا برداری ازم جس میں جاٹوں کے مختلف قبائل مذہبی اختلافات کے باوجود (ان قبائل میں سے اکثر اسلام قبول کر چکے ہیں) مشترکہ تاریخی ورثے اور دھرتی سے پھوٹنے والی سانجھی ثقافتی اقدار کی بدولت باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں۔

۲۔ برطانوی سامراجی دور اور امرت سر (باجلیاں والا باغ) کی خونریزی کے مختصر حوالے۔

۳۔ پنجاب میں سکھ اور مسلمان جاٹوں پر تقسیم کے اثرات۔ ناول نگار نے اس واقعے کو مختلف آپ بیتیوں کی مدد سے پیش کر کے تقسیم کی اس قیمت پر روشنی ڈالی جو اس دھرتی کو انسانی جانوں کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ 1947ء کے فسادات ہندوؤں، مسلمانوں یا محض سکھوں کا المیہ نہیں تھا بلکہ یہ انسانی المیہ تھا۔

۴۔ مشرقی پاکستان میں جنگ جو بنگلہ دیش کی تخلیق پر منتج ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر مصنف نے ایک سپاہی فتح محمد کی آپ بیتی سے اس دوسری تقسیم کے المیہ کو اجاگر کیا۔ فتح محمد پلٹن گراؤنڈ ڈھاکہ میں پاکستانی فوج کی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ تارڑ نے جنگی تقریب میں جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لمحات کو بیان کرنے کے لیے شعور کی رو (Stream of Consciousness) اور Flashback تکنیک سے کام لیا ہے۔ اس سے پہلے ''راکھ'' میں تارڑ نے مردان کے کردار کے ذریعے مکتی باہنی اور پاک فوج کی طرف سے نسل کشی کے عمل کو اجاگر کیا تھا۔ زیرِ مطالعہ ناول میں وہ ایک مرتبہ پھر تشدد، انتظامی نااہلی، جرنیلوں میں بنگالیوں کے خلاف نسل پرستانہ نفرت اور رشوت ستانی جیسے ان عوامل کی طرف لوٹ آئے جو پاکستان ٹوٹنے کا موجب بنے۔ شدید طنز میں گندھی سیاسی Sbutext کتاب میں نمایاں ہے۔ مثال کے

طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

''جب مردہ پرندے چھتوں پر گر رہے تھے تو دارالسلطنت کی رات میں خمار سے حواس باختہ ایک شخص برہنہ حالت میں بھاگتا چلا جا رہا تھا اور اُس کے جلو میں صدارتی محافظوں کی درجنوں جیپیں ہوٹر بجاتی اس کی حفاظت کے لیے چلی آتی ہیں اور اُن جیپوں میں اس شخص کہ جسے ایک مذہبی جماعت نے غازی قرار دیا تھا چند سوٹ ہیں تا کہ وہ اپنے تن کو ان سے ڈھک سکے۔۔۔وہ بمشکل اُن کے قابو میں آتا ہے اور نعرہ لگاتا ہے۔۔۔جنگ جاری رہے گی۔۔۔ وہ بے چارہ محض ایک بہانہ تھا۔۔۔سارے جرم اس کے کھاتے میں ڈال دیے گئے اور پوری قوم بری الذمہ ہوگئی۔۔۔جب کہ قوم کا ہر فرد اس جرم میں نہ صرف شریک تھا بلکہ فخر کرتا تھا کہ۔۔۔تھینک گاڈ۔۔۔پاکستان بچ گیا ہے۔۔۔اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔۔۔''

۵۔ 1971ء کے بعد کا پاکستان، بھٹو حکومت اور مذہبی جماعتوں کے مابین تناؤ کی بدولت سیاسی عدم استحکام جو جنرل ضیاء کے مارشل لاء بھٹو کی پھانسی اور ضیاء کی طرف سے اسلام کو مزید اسلامیانے کی کوشش پر منتج ہوا۔ پاکستان کی پیچیدہ سماجی و سیاسی تاریخ کو تلاشتے اور ادبیاتے ہوئے تارڑ کے قلم نے جنرل ضیاء کو شدید طنزیہ لہجے میں کچھ یوں پیش کیا:

''یہ اس کے ابتدائی دور کے قصے اور پھر وہ مستحکم ہو گیا۔۔۔ افغانستان کی جنگ نے اُس کی مونچھوں، مردہ مینڈک آنکھوں اور بتیسی کے نصیب جگا دیے جی ہاں اُس دوران اس کے بقیہ دانت بھی جھڑ چکے تھے اور اس نے ایک نہایت مہنگی امریکی بتیسی لگوائی تھی جو اس کی مسکراہٹ کو بقول اس کے دین دار حواریوں کے مونالیزا کے ہم پلہ کرتی تھی۔۔۔اس مسکراہٹ کے زعم میں جب وہ ہندوستان گیا اور سفارتی آداب کے تحت اُس سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے اعزاز میں جو سٹیٹ ڈنر ہو رہا تھا تو کیا آپ اُس میں کسی من پسند شخصیت کو مدعو کرنا چاہتے ہیں تو اس نے ہیما مالینی سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔۔۔''

۶۔ زیرِ مطالعہ ناول میں فوجی حکومت کے ظلم کو للکارنے والے دو کرداروں کو شدید سیاسی جبر اور حکومتی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امیر بخش کے دو بیٹوں انعام اللہ اور روشن (ایک مصنف اور دوسرا صحافی) کو فوجی حکومت نے گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا۔ روشن پر ایک فوج عدالت میں مقدمہ چلایا گیا کیونکہ اس نے اسلام کے نام پر ہونے والی پانچ سالہ صدارت کا جواز بننے والے بوگس ریفرنڈم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اپنی ایک سیاسی تحریر میں انعام اللہ نے اس حقیقت سے پردہ فاش کیا کہ تدفین سے پہلے جیل حکام نے بھٹو کی میت کا معائنہ یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ بطور مسلمان آیا ان کا ختنہ ہوا تھا یا نہیں۔ انعام اللہ نے (ناول میں ماورائے فکشن مداخلت کی تکنیک کے تحت) تجویز کیا کہ اس طرح کا معائنہ نہایت مناسب اور اسے ملک میں لازمی قرار دے دیا جائے کیونکہ پاکستان کو ایک عظیم اسلامی ریاست بننا ہے۔ جس بات نے فوجی حکومت کے غضب کو دعوت دی وہ انعام اللہ کی یہ تجویز تھی کہ اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے مردہ مینڈک کی سی آنکھوں والے کا بھی معائنہ کیا جائے۔ یوں اُسے لاہور کے شاہی قلعہ کے بدنام زمانہ زندانوں میں تنہا تشدد جھیلنا پڑا۔ بعد میں اسے لاہور کے موچی دروازے پر سرِعام کوڑے مارے گئے۔ ضیاء کے بعد کے دور پر تارڑ یوں قلم اٹھاتے ہیں:

''اگرچہ وہ کب کا آسمانوں سے آسمانوں پر اٹھا لیا گیا تھا۔۔۔ فیصل مسجد کے پہلو میں زبردستی دفن شدہ اُس کی بتیسی کی پوجا کرنے والے لوگ اب نہایت قلیل ہو گئے تھے۔۔۔لیکن اس کے باوجود اس ملک پر اُس کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔۔۔اور ان سے فرار ممکن نہ تھا۔۔۔اُس نے فوج، بیوروکریسی، سیاست اور مدرسوں میں جو بوٹے لگائے تھے وہ ماشاءاللہ سے اب تناور شجر بنتے جا رہے تھے اور ان کا ہر پتہ زہر اُگلتا جان لیوا ہو رہا تھا۔۔۔وہ اب بھی آسمانوں سے راج کرتا تھا اور اُس کا سایہ ایک بے مثل سرزمین کو سیاہ کرتا تھا۔۔۔''

پاکستان پر چھائے ہوئے ان سائیوں کے گہرائیوں کا صحیح اندازہ نہ کرتے ہوئے انعام اللہ اپنا ایک ناول ''ایک حرامی کی خودنوشت'' شائع کرتا ہے۔

ابتدائی بین الاقوامی توجہ کے بعد ناول اور ناول نگار کو ضیاء دور کی باقیات اور انتہا پسندوں کی جانب سے گستاخ و کافر قرار دے دیا جاتا ہے۔ امیر بخش، انعام اللہ کو تارک وطن ہو جانے پر قائل کرتا ہے۔ ضیاء دور کے سماجی ثقافتی ظلم و استبداد نے مصنفین اور دانشوروں سمیت کئی لوگوں کو ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ اس طرح تارڑ اپنی کہانی کو نئی جگہوں یعنی امریکہ اور کینیڈا میں لاتے ہیں۔ امریکہ میں ان کا مرکزی کردار انعام اللہ آبستا ہے۔ جبکہ کینیڈا میں اکبر جہاں، اس طرح تارڑ اپنے مرکزی کرداروں کو نیویارک اور واشنگٹن میں 9/11 میں ہونے والے حملوں کے بعد رونما ہونے والے عالمی منظرنامے کے پیش منظر میں لے آتے ہیں۔ انعام اللہ امریکہ میں مقیم ہو کر 9/11 کا عینی شاہد بنتا ہے۔ جہاں وہ ایک نئی طرح کی انتہا پسندی کو ابھرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ امریکہ میں Islamophobia شدید ہوتا چلا جاتا ہے اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع ہوتی ہے۔

۷۔ افغانستان اور عراق پر امریکی حملوں کو مرکزِ توجہ بناتے ہوئے تارڑ نے Tangential Narrative کا انداز اپنایا ہے۔

انعام اللہ ٹی وی پر افغانستان اور عراق میں امریکی بمباری کو دیکھتا ہے۔ تاہم دو دو ہزار پاؤنڈ کے بموں کا نشانہ بننے والے بے یار و مددگار اہل بغداد کے بجائے تارڑ نے بموں کی دہشت ناک آواز سے مرنے والے بچوں اور چڑیوں کی بات کی ہے۔ رات کے اندھیرے میں اُڑ کر جان نہ بچاسکنے والی

ہزاروں چڑیاں فضائی بمباری کی آواز سے مر کر درختوں کے نیچے آ گرتی ہیں اور اس کو محض Collateral Damage قرار دیا جاتا ہے۔ تارڑ ماضی کی کئی استعماری طاقتوں کی طرف سے بغداد کو تاراج کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ اُموی، عباسی، منگول، ترک، برطانوی اور اب امریکی سامراج۔

۸۔ ناول میں دوسری علمی و ادبی تصانیف کے Intertextual حوالے بھی ملتے ہیں۔ 9/11 کے سانحہ کی فکر انگیز جھلکیوں میں سے ایک image ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی ٹاور سے گرتے ہوئے ایک شخص کی تصویر تھی۔ جڑواں ٹاوروں کے انہدام سے پہلے اوپر والی منزلوں پر پھنسے کم و بیش دو سو لوگوں نے کود کر جان دے دی تھی۔ ان میں سے ایک کی تصویر ایسوسی ایٹڈ پریس کے فوٹو گرافر رچرڈ ڈریو (Richard Drew) نے بنائی جسے ڈان ڈی للو (Don De Lillo) کے ناول ''فالنگ مین'' (Failling Man) نے امر کر دیا ہے۔ تارڑ نے گرتے ہوئے آدمی کی کہانی کو ڈرامائی انداز میں استعمال کیا۔ مرکزی کردار انعام اللہ کو حملوں کے وقت ایک ٹیکسی میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ وہ کچھ گڑیا نما جسموں کو جڑواں ٹاوروں سے چھلانگ لگاتا اور زمین کی طرف آتے دیکھتا ہے۔ اُسے احساس ہوتا ہے کہ ایک جسم ہوا میں تیرتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ اُس سے بچنے کے لیے گاڑی کو تیز کر لیتا ہے۔ مگر وہ اس کی ونڈ سکرین پر آ گرتا ہے۔ اس intertextual حوالے کے ذریعے تارڑ نے اپنے ناول کو 9/11 سے متعلق ابھرتے ہوئے ادب کا حصہ بنا دیا ہے۔ تاہم 9/11 کا صرف یہی ایک حوالہ نہیں۔ بلکہ 9/11 کے بعد کے خوف زدہ امریکی معاشرے کو بھی اجاگر کیا ہے جس میں مسلمان تنہا بھی ہو گئے اور نفرت کا نشانہ بھی بنے۔ اسی وجہ سے انعام اللہ امریکہ چھوڑ کر کینیڈا میں مقیم ہونے چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ شباہت سے ملتا ہے۔ اُسے امریکہ کے خلاف اس قدر غصہ ہے کہ وہ امریکہ میں کسی نمایاں عمارت کو دھماکے سے اڑانے کا منصوبہ بناتا ہے۔

کہانی کی ہیئت اور ادبی اسلوب

(narrative form and literary devices)

''خس و خاشاک زمانے'' کا بیانیہ طویل اور پیچیدہ ہے جس کی وجہ سے قاری کو خاصی توجہ سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ ''بہاؤ'' اور ''راکھ'' کی طرح یہاں بھی تارڑ نے پنجاب کی ثقافت اور تاریخ کو بہت بڑے پیمانے پر اجاگر کیا ہے۔ اس ناول کی کہانی کسی کلاسیکی داستان کی مانند یوں پھیلی ہوئی ہے کہ کئی ایک تانے بانے کہانی در کہانی پھیلتے اور جڑتے چلے جاتے ہیں۔ تارڑ نے یہ پیچیدہ جال بننے کے لیے کئی ایک ادبی طریقہ ہائے کار (literary devices) سے مدد لی ہے۔ جادوئی حقیقت پسندی (Megical Realism)، ماورائے فکشن عناصر (Metafication)، بین المتون حوالے (Intertextual References) کئی ایک تاریخی مطابقتیں (allusions)، غیر حقیقی عناصر اور شعور کی رو (Stream of consciousness) کے استعمال سے ناول نگار نے اندھیروں اجالوں کی ایک ایسی دنیا بسا ڈالی جو انسانی رشتوں کے خلوص اور محبت سے سجی ہوئی ہے۔ کہانی وسطی پنجاب کے دو گاؤں، محلہ مغربی اور کوٹ ستارہ سے شروع ہو کر لاہور کی طرف بڑھتی ہے۔ تقسیم کے تشدد اور آزادی کے بعد کی مایوسیوں کی داستان رقم کرنے کے بعد یہ امریکہ اور کینیڈا منتقل ہو جاتی ہے۔ تا کہ 9/11 کے بعد کی دنیا پر چند اہم سوالات اٹھائے جا سکیں۔

اس کا پلاٹ اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا ''راکھ'' کا ہے، جس کے بارے میں ایک مبصر کی رائے ہے کہ ''اس ناول کا بیانیہ سادہ خط مستقیم پر حرکت کرنے کے بجائے دائروں میں حرکت پذیر ہے۔ ایسے دائرے جو حجم اور معانی کے اعتبار سے پھیلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ مصنف اس مقصد کے لیے کسی اور دائرے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی دائروی خط کہانی کی بنیادی حقیقت ہے جسے مصنف ایک ماہر مداری کی طرح یوں گھماتا جاتا ہے کہ کوئی بھی دائرہ اپنی مقررہ جگہ سے باہر نہیں جا پاتا۔''

بیسوی صدی کے آغاز سے مقبول جدیدیت پسندی نے کئی نئے رجحانات اور تخلیقی اسالیب کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک اس طرح کا پیچیدہ پلاٹ بھی ہے۔ ایک ثقافتی تحریک کے طور پر جدیدیت اشیا، عوامل اور رجحانات کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔ ادبی جدیدیت میں وقت سے متعلق میکانکی نظریہ سے اجتناب کرنے پر زور دیا گیا ہے اور وقت کو ایک غیر مسلسل، غیر تاریخ وار اور غیر مستقل طور شے کے طور پر یوں لیا گیا ہے جیسے ہم شعور کی رو کی مدد سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ وقت جو کبھی تھمتا نہیں، ادوار میں آگے اور پیچھے کا سفر کرتا ہے اور یوں مختلف زمانوں کے واقعات کسی چوراہے پر آپس میں مدغم ہوتے ہیں۔ وقت کی حقیقت سے متعلق فلسفیانہ تبدیلی کے نتیجے میں خطی کہانی پر تشکیل، Contrapuntal کہانی کاری اور نتیجہ اخذ کیے بغیر کہانی کا اختتام اور منطق کے بجائے تصویری ربط پر اصرار ہے۔ تاہم تارڑ ادبی جدیدیت کی تمام خصوصیات بروئے کار نہیں لاتے۔ مثال کے طور پر واحد معتبر اور ہمہ بین راوی کو رد کرنے کے بجائے وہ ابھی تک مصنف کے ایک ہمہ جائی (omnipresent) نکتہ نظر پر انحصار کرتے ہیں۔ تاہم جمالیاتی اور تجربے کی ساخت میں روانی، ربط اور گہرائی کے اعتبار سے انہوں نے کئی ایک ایسے آلات کو برتا جو جدیدیت کے عکاس ہیں۔ ایک معنی خیز جملہ: ''چار مرغابیوں کا خوشی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں'' جسے تارڑ نے ''راکھ'' میں کم و بیش سترہ (17) اور 'قربت مرگ میں محبت' کی طرح خس و خاشاک زمانے میں بھی کئی بار استعمال کیا ہے۔ بخت جہاں کا بیٹا اکبر جہاں جو پاکستان سے ہجرت کر کے کینیڈا جاتا ہے ناول کے ایک منظر میں دنیا پور کی جھیل میں چار مرغابیوں کو دیکھتا ہے اور اپنے پردیسی پن کو مرغابیوں کی موسمی واپسی کے مترادف گردانتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے

کہ تارڑ کے اس طرح کے تکرار کی کیا معنویت ہے۔ بہت سارے جدید مصنفین کے ہاں تکرار کا یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً بیکٹ (Samuel Backett) کا ''Waiting for Godot'' ڈرامہ ''کچھ نہیں ہے کرنے کو'' (Nothing to be done) سے شروع ہوتا ہے۔ اور قارئین یا ناظرین کو زندگی کے بے معنی پن کی یاد دلانے کے لیے یہ الفاظ پورے ڈرامے میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

ماورائے فکشن عناصر (Metafiction):

ماورائے فکشن یا میٹا فکشن کی اصطلاح کئی ایک ایسی تکنیکوں کا مجموعہ ہے جنہیں مابعد الجدیدی ناول نگار استعمال کرتے ہیں۔ آسان الفاظ میں اس کا مفہوم یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی ناول نگار اپنے ناول میں ہی ایک اور ناول نگار اور اس کا لکھاری تخلیق کرے اور اس کے کام کو خود زیر بحث لائے۔ پیٹریشیہ وو (Patricia Wough) کے مطابق ''میٹا فکشن کی اصطلاح ایسے فکشن کے لیے استعمال ہوتی ہے جو شعوری طور پر منظم طریقے سے بطور ادب پارہ اپنی حیثیت کی طرف متوجہ کرتا ہے تا کہ ادب اور حقیقت کے تعلق پر بحث کی جا سکے۔'' میری تفہیم کے مطابق تارڑ نے میٹا فکشن کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ کہانی میں کھلم کھلا مخل ہو کر اور افسانوی و حقیقی پہلوؤں کے افسانوی پن کو منظر عام پر لا کر وہ اپنی تحقیق سے متعلق حدود اور ممکنات کو کھوج لگاتے ہیں۔ یہ کھوج یورپی اور امریکی مابعد جدیدی ادب میں بھی غالب عنصر کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جان بارتھ (John Barths) نے میٹا فکشن کی مختصر الفاظ میں یہ تعریف دی ہے ''ایسا ناول جو کسی دوسرے ناول کی تقلید و نقل ہو نہ کہ حقیقی دنیا کی۔''

افسانوی کرداروں، تاریخی شخصیات و واقعات کا ادغام، تخلیقی تکنیک پر بحث یا پیش لفظ جیسے غیر متنی (extratextual) عناصر کی منت میں شمولیت وغیرہ بھی ماورائے کہانی آلات ہیں۔ تارڑ نے ان سب آلات کو اپنے ایک کردار انعام اللہ کے ناولوں پر بحث میں برتا ہے۔ وہ انعام کے ناولوں ''ایک حرامی کی خود نوشت'' اور ''ٹیکسی ڈرائیور۔ ایک طوائف'' کا نہ صرف بار بار ذکر کرتے ہیں بلکہ اس کے تیسرے ناول ''چڑیاں مری پڑی ہیں'' (The Sparrows are Dead) کے چند صفحات ''خس و خاشاک زمانے'' کے صفحات ۶۵۸۔۶۶۱ پر شامل کرتے ہیں۔ بغداد کی تباہی اور امریکی قبضہ سے متعلق انعام اللہ کے اس نئے ناول پر تارڑ بحث کرتے ہیں۔ پہلے تارڑ اس کے چند صفحات کے اقتباس پیش کرتے ہیں اور پھر اس افسانوی ناول پر اپنی منصفانہ رائے (Authorial intervention) دیتے ہیں۔ اس ناول کے اقتباسات امریکہ کی طرف سے بغداد کے وسط میں امریکیوں کے لیے قائم کردہ ''گرین زون'' اور اُس سے باہر کی زندگی کے درمیان تضاد پر مبنی ہیں۔ یہ چار سالہ علی اور اس کی ماں کی کہانی ہے۔ اُن کا گھر فضائی بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔

گھر کا منظر ناول کے اندر اس ناول میں کچھ یوں ہے:

''باغیچے کے ایک کونے میں زیتون کا ایک تنہا قدرے خمیدہ لیکن گھنا پیڑ خود اپنی شاخوں کو نہ پہچان سکتا تھا کہ وہ بارود کے دھوئیں سے سیاہ ہونے لگی تھیں۔۔۔

علی زید کے چار برس کے بدن میں مکمل خاموشی تھی۔۔۔

جب سے وہ اپنی ماں زینب کی کوکھ سے باہر آیا تھا وہاں ازل سے ایک سناٹا تھا۔۔۔

اُس کے دونوں کان محض نمائشی تھے، ان کے پردوں کے پار کوئی آواز نہ جاتی تھی۔۔۔

تین صفحات پر مبنی اقتباسات دینے کے بعد تارڑ کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

''کیا یہ ایک نئے ناول کا آغاز ہو سکتا ہے۔۔۔؟ عزتِ نفس کے مجروح پن سے گھائل ہو چکے، کھولتے ہوئے دل والے مصنف کے نئے ناول کا آغاز ہو سکتا ہے۔۔۔؟

اگرچہ ایک ناول کا آغاز کہیں سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے انجام سے۔۔۔ کسی مرکزی کردار کو پیش آنے والے کسی جذباتی حادثے سے۔۔۔ کسی کردار کی موت سے۔۔۔ ناول کی کہانی کے عین درمیان میں سے فلیش بیک کی تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے جواب تک بیت چکا، اسے بیان کر کے اور پھر درمیان سے آخر تک تخلیق کا یہ سفر طے کیا جا سکتا تھا۔۔۔ لیکن اس نئے ناول میں قباحت یہ تھی کہ اسے انجام سے ہرگز شروع نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ ناول نگار کی صوابدید پر نہ تھا، اس کے اختیار سے باہر تھا۔''

یوں اصولِ تصنیف پر رائے دے کر اور قارئین سے براہ راست مخاطب ہو کر تارڑ کہانی کاری کی مروجہ روایات سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ کام metafiction کا استعمال کرنے والے تمام مصنفین کرتے ہیں۔ میٹا فکشن کی کئی ایک اور صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً بین المتون حوالوں کا استعمال کر کے کہانی کاری کے نظام کا معائنہ کرنا، نظریات اور تکنیک دونوں کے مختلف پہلوؤں کو شاملِ تصنیف کرنا، خیالی کہانی کاروں کے خاکے لکھنا اور کسی خیالی کردار کے تخلیقی کاموں کو پیش کرنا اور زیر بحث لانا۔ ان تمام حوالوں سے تارڑ کا کام میٹا فکشن پر مبنی ہے۔

طلسماتی/ پُرافسوں حقیقت پسندی (Magical Realism):

پُرافسوں حقیقت پسندی کا رجحان ام بعد الجدیدی ادب کا اہم خاصہ ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے لکھاریوں نے انیسویں صدی کے نام نہاد حقیقت پسندانہ طرزِ بیانیہ (Realist Narrative) اور جدیدی تحریک کے دوران مقبول انتہائی غیر حقیقی طرزِ بیانیہ کے درمیان ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرزِ بیانیہ میں مصنف حقیقی اور طلسماتی یا پُرافسوں واقعات

کے ادغام کے ذریعے قبل از جدید اور جدید بیانیے کی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کئی ایک مقامات پر تارڑ نے ایسے حقائق کے اظہار کے لیے جنہیں سادہ حقیقت پسندی سے بیان نہیں کیا جا سکتا، جادوئی حقیقت پسندی (Megical Realism) کا استعمال کیا۔ اس تکنیک کے استعمال کی ایک مثال وہ ہے جس میں تارڑ نے ایک وسیع میدان میں سانپوں کی ایک فصل اُگی ہوئی دکھائی ہے۔ امیر بخش نوکری کی تلاش میں لاہور کی جانب عازمِ سفر ہوتا ہے۔ وہ لاہور کے قرب و جوار میں واقع کالا شاہ کاکو کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔ سخت دھوپ اور وسیع بیابان کے درمیان اسے کوئی چمکدار چیز ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب وہ وسیع میدان میں پہنچتا ہے تو یہ دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے کہ وہاں ہزاروں سانپ دُم کے بل سیدھے کھڑے رقص کر رہے ہیں اور ہوا ایک پُر اسرار آواز سے گونجی ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد سانپوں کے ڈر سے راستہ بدلنے کے بجائے وہ ان کے عین بیچ و بیچ بلا خوف و خطر گزرتا ہے اور یوں میدان پار کر جاتا ہے۔ مصنف اس واقعہ کو امیر بخش کی جوانی کے دنوں کے ایک واقعہ سے جوڑتا ہے جس کے مطابق اس نے ایک بار بہت سارے سانپوں کو کنوئیں میں گرنے سے بچایا تھا۔ یہ منظر کشی اتنی صاف اور پُر زور ہے کہ قاری باآسانی چشمِ تصور سے دیکھ سکتا ہے۔ اگرچہ اس طرح کے افسانوی عناصر کے لیے حقیقت پسندانہ تخیل کی رضا مندانہ معطلی (Willing Suspension of Disbelief) بھی ضروری ہوتی ہے۔

تارڑ کی عالمیت پسندی (Cosmopolitanism) اور عالمی ادب کے ساتھ تعلق ان کے ناولوں میں سے کئی ایک بین المتون (Interextual) حوالوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جن میں وہ مغربی مصنفین، فلموں اور گانوں، اُردو شاعری اور پنجابی صُوفی شاعری، فنکاروں اور موسیقاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ تاہم یہ امر حیران کن ہے کہ تارڑ جیسے منجھے ہوئے لکھاری اور وسیع مطالعہ رکھنے والے مصنف نے ''خس و خاشاک زمانے'' میں دو حوالوں میں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ صفحہ 352 پر ایک غلطی شیکسپیئر کے ایک کردار ہیملٹ (Hamlet) کے حوالے سے ہے۔ اس ڈرامہ میں ہیملٹ ایک انسانی کھوپڑی ہاتھ میں پکڑ کر زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتا ہے۔ مگر تارڑ اس کھوپڑی کو شیکسپیئر کے ایک اور کردار میکبتھ (Macbeth) کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ہیملٹ کی معروف خود کلامی پر مبنی تقریر ''To be or not to be'' کو بھی میکبتھ سے منسوب کیا ہے۔ دوسری غلطی صفحہ 444 پر ہے۔ یہاں امریکہ جڑواں ٹاوروں کے گرتے ہوئے منظر کو بیان کرتے ہوئے تارڑ اس کا موازنہ آرسن ویلز (Orson Wells) کے ناول War of the Worlds سے کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ ناول ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. Wells) نے لکھا ہے۔ تاہم اتنے طویل ناول میں یہ غلطیاں معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔

تارڑ ''ہیرو'' اور تارڑ کی کردار نگاری:

مضبوط کہانی کاری اور مقامی ثقافت سے پیوستہ زندگی سے بھرپور محاورے کے علاوہ تارڑ کے پاس کردار نگاری کا کمالِ فن بھی ہے۔ ان کے کئی ایک کردار ایسے ہیں جو اُردو ادب کے اوراق پر زندگی پانے والے کسی بھی کردار سے بہتر ہیں۔ تارڑ اپنی ادبی تخلیقات کو مختلف رنگوں کے خاکے نہیں بناتے بلکہ Dickens کی روایت میں ایک مجسمہ ساز کی مانند ہر کردار کی چیدہ چیدہ تفصیلات پر کام کرتے ہیں اور انہیں آغاز تا انجام انتہائی توجہ سے نبھاتے ہیں۔ یوں ان کے کردار کہانی سے تو بتدریج غائب ہو جاتے ہیں مگر قاری کی یاد سے نہیں۔ یہی عرق ریزی زیرِ مطالعہ ناول کو انسانی نفسیات کی بھُول بھلیوں کا ایک مطالعہ بناتی ہے۔ بخت جہاں، سارو سانسی، شباہت، انعام اللہ اور چند دیگر کرداروں کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ تاہم موتی، مقدس بانو، دارو اور سوہنی جیسے کردار جو نسبتاً مختصر وقت کے لیے کہانی کا حصہ بنتے ہیں، کو بھی کما حقہٗ توجہ دی گئی ہے۔ ناول کے مختلف حصوں میں جب جب مصنف ان کا حوالہ دیتا ہے تو وہ زندہ انسانوں کی طرح قاری کے ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ میرے تجزیے کے مطابق ارنسٹ ہمنگوے (Emest Hemingway) کی طرح تارڑ اپنے آخری چند ناولوں میں ایک واحد مرکزی کردار پر کام کرتے رہے ہیں۔ یہ ہیرو کئی سالوں تک تارڑ کے دماغ اور فن میں ترقی اور نشوونما پاتے ہوئے مختلف شخصیتوں کا روپ بدلتا رہا۔ ''راکھ'' کے مشاہد کی رومانوی مثالیت پسندی (Idealism) اس ناول میں انعام اللہ کی آزاد خیال انسانیت پسندی (Liberal Humanism) اور سیاہ حقیقت پسندی (Dark Realism) میں ارتقاء پذیر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ تارڑ نے اپنے اس نئے ناول میں اپنے ہیرو کی مختلف خصوصیات کو کئی ایک ہیروز میں تقسیم کیا ہے۔ بخت جہاں، امیر بخش، سارو سانسی، روشن، انعام اللہ، اکبر جہاں اور دوسرے کردار ایک ہی ہیرو کے مختلف روپ ہیں۔ یہ سب ایسے آزاد خیال ثقافت پسند مسلمان ہیں جو اپنے ہی ملک میں محرومی اور سماجی بے اعتنائی کے شدید احساس کے ساتھ جی رہے ہیں اور ایک طرح سے بے مقصدیت کے کرب تلے دبے ہوئے ہیں۔ اپنے معاشرے کے دوسرے باسیوں کے برعکس یہ سب زندگی کا ایک بہتر اور ذمہ دارانہ ادراک رکھتے ہیں۔ وہ ''دل کی اچھائی'' کے فلسفے کو مانتے ہیں اور زندگی کی قدر کرتے ہیں لہٰذا وہ دل کے سخی ہیں۔ صوفی کی طرح دیالو ہیں اور ایک Existentialist کی طرح فقیرانہ زندگی گزارتے ہیں۔

تارڑ کے زیادہ تر کردار نظریاتی طور پر بعد از ضیاء پاکستانی معاشرے سے اجنبیت کا شکار ہیں۔ وہ دھرتی کی اس قدیمی ثقافت سے جڑے ہوئے ہیں جو اصلاً کثیر الثقافتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی آزادی پسندی مغربی ثقافتی اقدار سے بھی الگ تھلگ ہے۔ اسی لیے یہ امریکی کو بھی اپنا ''ثقافتی کعبہ'' نہیں سمجھتے۔ سارو سانسی جیسے انتہائی غیر روائتی کردار بھی ہیں جن کا

تعلق جیسی قبائل سے ہےاور جوہستی کے عارضی پن اور بے ثباتی کے علاوہ اور کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے۔اور اپنے ایک دن تا دوسرے دن کی زندگی میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ مُردار کو کھالینا بھی ان کے لیے کوئی عیب نہیں۔درحقیقت تارڑ کے کرداروں کی رنگا رنگ گیلری میں یہی وہ زندہ کردار ہے جو کہانی سے غائب ہو جانے کے بعد تادیر قاری کی یاد میں تازہ رہتا ہے۔سانسی کے کردار کی خصوصیات کی ایک جھلک،شباہت کے کردار میں نظر آتی ہے جوفطرتاً مضبوط جبلتوں کی مالک اور پاروشنی کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔چونکہ تارڑ کے کردار پاکستانی معاشرے اور ثقافت سے ماخوذ ہیں لہٰذا وہ ایک پریشانی میں مبتلا نظر آتے ہیں: وہ اپنے ملک،اس کی قدیمی تاریخ اور ثقافت سے محبت کرتے ہیں مگر اس کے حکمرانوں اور اس کے سرکاری نظریہ کو قبول نہیں کر سکتے۔

زبان،نظریہ اور سیاسی وابستگی:

میرے نزدیک زیرِ مطالعہ ناول کا سب سے نمایاں پہلو غالباً یہ ہے کہ اس میں پنجاب کی مقامی ثقافت کو مقامی محاورے کے استعمال سے محفوظ اور ملفوظ کر دیا گیا ہے۔اس ثقافت کی بنیادوں کو تارڑ اپنے تمام اہم ناولوں میں تلاشتے رہتے ہیں۔"بہاؤ" لکھنے سے پہلے تارڑ نے اچھی لسانی اور تاریخی تحقیق کی تھی۔اس قدیمی ثقافت کی ابتداء سے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ برصغیر میں آریاؤں کی آمد اور مقامی قومیتوں پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے کے دراوڑی (Dravidian) زمانے سے ہے۔ یہاں کے حیوانات و نباتات،موسموں تہواروں وغیرہ کے نام،روزمرہ استعمال کے برتنوں کے لیے اصطلاحات ایک ایسی زبان میں عیاں ہوتے ہیں جسے تنقیدی حلقے "معیاری اُردو" ماننے سے منکر ہیں۔اس حوالے سے آوسٹر ہیلڈ (Osterheld) کے "راکھ" کے بارے میں لکھے گئے الفاظ "خس و خاشاک زمانے" پر بھی صادق آتے ہیں۔

"پنجابیت کی ایک اہم صورت کہانی میں پنجابی الفاظ اور قدیم پنجابی شاعری سے اقتباسات کا بہ باکثرت استعمال ہے۔مکالموں میں پنجابی الفاظ انہیں ایک طرح کا اپنا پن عطا کرتے ہیں۔وہ کہانی کے بیان اور وضاحت میں بھی خوب جچتے ہیں۔پنجابی شاعری کے اقتباسات (خواجہ غلام فرید،میاں محمد بخش اور کئی ایک اور شاعروں کی) یا تو عاشقانہ معاملات کے سیاق و سباق میں دیئے جاتے ہیں اور یا پھر صوفیانہ فضا میں"

جس انداز میں تارڑ اردو زبان کو مقامی سانچوں میں ڈھالتے اور پنجابی رنگوں میں رنگ کر ثقافتی فضا پیدا کرتے ہیں اُن کے سماجی نظریہ کا واضح اظہار ہے۔ پاکستان کے اردو ادب کی تاریخ میں کئی ایک ایسے نام ہیں جنہوں نے اپنی سیاسی وسماجی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔مثلاً شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"،عبداللہ حسین کا "نادار لوگ" تارڑ کا "راکھ" وغیرہ اسی طرح کی وابستگی کا اظہاریے ہیں۔ پاکستان کے بعد از نو آبادیاتی مسائل بے شمار ہیں: لالچ، کرپشن،فوجی حکومتیں،سیاسی عدم استحکام،غریبوں کا استحصال اور غریب اور امیر

کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، پاکستان ناولوں کے وسیع مجموعے نے پاکستان کے جڑے خواب کے خیالی پن کی اصلیت کو بہ طریقِ احسن ظاہر کیا ہے۔ان میں سے کچھ پاکستان کی حقیقت کے برجستہ بیانیے ہیں۔سراب کا پردہ چاک کرنے والوں کی صف میں تارڑ سب سے آگے ہیں۔

ناول کے انتساب اور اختتام میں عطار کے پرندے:

تارڑ کی تخلیقی بصارت فریدالدین عطار کی فارسی کلاسیکی طویل نظمیہ "منطق الطیر" سے بہت زیادہ متاثر لگتی ہے۔اس طویل نظم کی عکاسی "بہاؤ"، "راکھ"، "قربتِ مرگ میں محبت" کے آغاز میں بھی کی گئی ہے۔اپنے نئے ناول کے انتساب میں وہ ایک مرتبہ پھر اس کلاسیکی حوالے کی طرف پلٹے ہیں۔ انتساب کچھ یوں ہے: "عطار کے پرندوں اور نئے آدم کے نام"! یہ انتساب بھی خاصا معانی خیز ہے۔کیونکہ ناول ایک ایسی نثری Epic ہے جو ایک صدی سے زیادہ عرصے پر محیط تین خاندانوں کی تاریخ کی کھوج کرتا ہے۔ناول کو کسی واضح انجام کے بغیر ختم کرنے کی کوشش میں تارڑ عطار کی نظم سے ماخوذ تمثیل کے ایک پیچیدہ جال کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ انعام اللہ اور شباہت کے کینیڈا، امریکہ سرحد پر کسی اہم عمارت کو دھماکے سے اڑانے کے سفر کی عطار کی سات وادیوں اور تیس پرندوں سے مماثلت کرتے ہیں۔ بغداد اور قندھار کے مردہ پرندے ایک ایک کر کے زندہ ہو جاتے ہیں،اور انعام اللہ کو حالیہ مایوس کن دنوں کے بعد ایک روشن صبح کی نوید سناتے ہیں۔اس سے قبل وہ قلم کے ذریعہ سے تبدیلی لانے سے متعلق مایوسی کا اظہار کر چکا ہوتا ہے۔جب شباہت اسے خود کش حملہ کرنے سے روکنے کے لیے یہ کہتی ہے کہ انتقام کا بہترین ہتھیار لفظ ہیں تو وہ کہتا ہے:

"یہ بھی محض خام خیالیاں ہیں شباہت کہ ادب ظلم کا راستہ روک سکتا ہے۔۔۔لکھے گئے حرف میں سے انصاف کے کرشمے پھوٹ سکتے ہیں۔۔۔نہیں ادب بھی خود کو بری الذمہ قرار دینے کی ایک انٹلکچوئل ماسٹربیشن ہے۔۔۔جس سے فارغ ہو کر آپ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔۔۔اور یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ ہم اس نوعیت کی ماسٹربیشن میں مشغول رہیں، ناول تحریر کریں،مزاحمتی ادب تخلیق کریں،رُلا دینے والے مرثیے لکھیں۔۔۔یوں انہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتی لیکن ہم اس عمل کے نتیجے میں ناتواں ہوتے چلے جاتے ہیں اور میں۔۔۔انہیں گزند پہنچانا چاہتا ہوں۔۔۔کیا اب تم سمجھ رہی ہو۔۔۔؟"

تاہم جب وہ ایک ساتھ ایک جھیل میں جھانکتے ہیں تو گویا حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی ہے۔انعام اللہ پر سچ روشن ہوتا ہے۔یہاں سیمرغ کے متلاشی عطار کے تیس پرندوں کی طرف براہ راست اشارہ ہے۔جب پرندے سیمرغ کی سرزمین میں پہنچتے ہیں تو جھیل میں محض ایک دوسرے کا عکس دیکھتے ہیں نہ کہ افسانوی سیمرغ کو۔صوفی فکر کے مطابق خدا کائنات سے الگ یا باہر نہیں

ہے۔ سیمرغ کے متلاشی پرندوں کواحساس ہوتا ہے کہ سیمرغ ان کی ذات کے کُل سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی خدا اپنی تخلیق سے الگ نہیں ہے یہی بقا کا بھید ہے اور اس بھید تک تارڑ کا مرکزی کردار شاہت جیسی حقیقت آشنا خاتون کی مدد سے پہنچ جاتا ہے۔

اگر خس و خاشاک کو گارشیا مارکیز (Garcia Marquez) کے عظیم ناول ''تنہائی کے سو سال'' (One Hundred Years of Solitude) کا اردو نعم البدل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انتساب اور آخری سے پہلے والے صفحہ پر موجود ایک حوالہ کے درمیان ربط معنی خیز اور توجہ طلب ہے جہاں وہ لکھتے ہیں:

ایک آدم۔۔۔تم کون سے آدم کی بات کرتے ہو۔۔۔ وہاں تو بے انت تھے اور تم ان میں سے ایک ہوسکتے ہو۔۔۔

اور یوں ہر آدم کی ایک حوا تھی۔۔۔

اوران کے بدن تو پیراہنوں سے آزاد تھے۔۔۔

یہ اشارہ مختلف ارتقاء نواز نظریات (Pro-Evolution Theories) کی طرف ہوسکتا ہے جن کی حمایت کئی ایک مسلمان دانشور بھی کرتے رہے ہیں، جیسا کہ سرسید احمد خان لیکن اس سے زیادہ یہ بعد از 9/11 کی اس نئی دنیا کا حوالہ بھی ہوسکتا ہے جو تشدد، تباہی اور خون خرابے سے اُٹی پڑی ہے کہ جس کے بعد ایک دنیا نے جنم لینا ہے۔ عطار سے ماخوذ تمثیل کی روشنی میں یہی تشریح درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ناول ان الفاظ پر انجام ہوتا ہے:

''آؤ ایک نئی دنیا آباد کریں''

''**یوں** تو اردو میں بہت اچھی اچھی کتابیں نکل رہی ہیں، مگر معرکے کی کتاب کبھی کبھی تخلیق ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی کتاب ''نکلے تیری تلاش میں'' ایسی ہی کتاب ہے جس کا اثر دل میں مدتوں موجود رہتا ہے۔ یوں تو یہ سفر نامہ ہے مگر اسے ایک عمدہ خودنوشت بھی کہا جاسکتا ہے اور اب ''جہانِ دانش'' (کہ جناب احسان دانش کی خودنوشت ہے) اپنی پوری شانِ زیبائی و رعنائی کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔''

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

''**مجھے** یہ کہتے ہوئے کوئی شبہ نہیں کہ مستنصر حسین تارڑ نئی نسل کے چیخوف ہے۔''

(منصور قیصر)

''**امراؤ** جان ادا'' کے بعد ناول کسی بھی جاندار کردار سے آج تک محروم رہا تھا۔ ''راکھ'' میں پہلی بار اور بہت مدت کے بعد ایک ہی دفعہ کئی جاندار کردار ہمیں نصیب ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میرا جی کہتا ہے کہ مستقبل کا ناول اب شاید ''راکھ'' سے اپنا فیض حاصل کیے بغیر نہ رہ سکے گا۔ ''راکھ'' ناول نویسی میں ایک اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس ناول کے بعد تارڑ اور کوئی ناول نہ لکھیں یا کم از کم ایسا نہ لکھیں کہ یہ ناول لکھ کر وہ کمال کی اُس سطح پر اُترے ہیں کہ اس کے بعد تو آدمی پھر نیچے ہی اُترتا ہے۔ اور اوپر آتا ہے اور نیچے اُترتا ہے مگر کمال کی سطح وہی رہتی ہے جو نصیب ہوچکی اور جہاں قدم رکھا جاچکا۔ جیسے مقدس صحیفے اُتر چکے۔ احکام نازل ہوچکے۔ ایسے اب ''راکھ'' نہیں اُترے گی، وہ اتر چکی۔

(پروفیسر سمیع اللہ قریشی)

''**بہاؤ**'' ایک ایسی بڑی ندی کے بارے میں ہے جو ہمیشہ سے چیزوں اور برتنوں میں بہہ رہا ہے۔ ہر ناول پانی کی اس بڑی دھارا کا متلاشی ہوتا ہے۔ یہی افسانے اور ناول کا فرق ہے اور یہی فرق مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''بہاؤ'' اس صدی کا بہت بڑا ناول ہے۔''

(اختر حسین)

''ہے تورو''

(اُندلس میں اجنبی سے منتخبہ)

(مستنصر حسین تارڑ)

سان سباستیان کے یونانی تھیٹر نما بُل رنگ میں ہزاروں تماشائی دم سادھے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ان سب کی نظریں ایک نقطے پر منجمد تھیں۔ ایک ایسا نقطہ جس کی زد میں ایک سرخ پھاٹک اور اس کے کواڑ پر ہاتھ رکھے ایک بوڑھا آیا ہوا تھا۔ میری نظریں بھی اسی ایک نقطے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔بُل رنگ کا نصف حصہ سائے میں تھا اور بقیہ نصف حصے پر تیز دھوپ چمک رہی تھی۔بُل رنگ کی بالائی منزل کو جہاں میں بیٹھا تھا، اسلامی طرزِ تعمیر کی خوبصورت محرابیں گھیرے ہوئے تھیں۔سورج کی کرنوں سے منور نصف حصے میں واقع محرابوں کا سرخ رنگ نہایت شوخ لگ رہا تھا۔سرخ رنگ جو بُل فائٹ کا نمایاں رنگ ہے۔۔۔سرخ محرابیں۔سُرخ رومال۔سُرخ وردیاں اور پھر سُرخ خون۔۔۔اکثر اوقات بُل کا اور کبھی کبھی انسان کا۔۔۔بُل فائٹر کا۔

بُل رنگ کے درمیانی میدان کی سطح پر بچھی ریت نہایت ہموار تھی۔ میدان بالکل خالی پڑا تھا۔۔۔چند لمحوں میں یہاں موت کے سائے روشنیوں کا پیچھا کرنے والے تھے۔ میں اپنے اردگرد بیٹھے ہزاروں لوگوں کی طرح ایک ایسے ڈرامے سے پردہ اٹھنے کا منتظر تھا جس میں دوپہر کی دھوپ، شام کے سائے، گرم ریت ، ایک حیوان اور ایک انسان مرکزی کردار ادا کرنے والے تھے۔ انسان یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں موت کے سامنے سینہ سُپر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔وہ اب بھی لاکھوں برس قبل جنگلوں میں رہنے والے اپنے آباؤاجداد کی مانند ایک جنگلی درندے کے سامنے اکیلا خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکتا ہے اور اسے اپنی قوتِ بازو سے زیر کر سکتا ہے اور حیوان۔۔۔یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان یہ جنگ جیت بھی لے تو کیا۔یقینی موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے۔

ہر سُو مکمل سکوت تھا۔ میں لکڑی کی سخت نشست پر بیٹھا نیچے سرخ دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔اچانک بگل کی تیز آواز بُل رنگ میں گونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سرخ پھاٹک زور لگا کر دھکیلا اور پھر بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔چشمِ زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی سی تیزی سے اصطبل میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔اس مکمل سکوت میں اس کے طاقتور سُموں کی دھمک تیسری منزل پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے بوجھ تلے بُل رنگ کی زمین لرز رہی تھی۔اس نے میدان کا ایک چکر لگایا۔شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میدان خالی نظر آیا تو لکڑی کی اونچی گیلری پر حملہ آور ہوا۔گیلری کے پیچھے بیٹھے ہوئے چند تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو چار ٹکروں کے بعد جب بُل کو احساس ہوا کہ وہ گیلری توڑ کر تماشائیوں تک نہیں پہنچ سکتا تو بھاگتا ہوا میدان کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ طاقتور، مغرور اور ہسپانوی زبان میں ''لیر افتادو'' یعنی ناقابلِ تسخیر۔اس کو اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر شے کو فنا کر دے گا کیونکہ اس میں ایک اچھے بُل کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔مضبوط موٹی کھال، چمکتی آنکھیں، چوڑا ماتھا، سُم اور سر چھوٹے۔موٹی گردن جس پر گوشت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چوڑے کاندھے، دم لمبی اور پھر اس کا خطرناک ترین ہتھیار سینگ جو آگے کی طرف مڑے ہوئے تھے، ایک اعلیٰ نسل کا بُل جو بُل فائٹنگ کے لیے موزوں ترین تھا۔

بُل کے میدان کے درمیان میں کھڑے ہوتے ہی یہ مکمل سکوت کچھ یوں ٹوٹا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔''ہے تورو۔ہے تورو۔'' تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے دو موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بُل کے بارے میں بحث کرنے لگے۔

''بل شکل سے تو ''برارتیو'' یعنی بہادر لگتا ہے''

''نہیں مجھے تو ''آران کادا'' یعنی قدرے بزدل معلوم ہوتا ہے۔''

اگلی نشست پر بیٹھی ایک بڑھیا نے مڑ کر دونوں کو ڈانٹ پلائی۔

''برارتیو یا آران کادا نہیں ہے،صرف مانسو یعنی غصیلا ہے۔''

''ہاں بڑی اماں تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ برارتیو نہیں ہے کیونکہ بُل کی بہادری اس کی ماں پر منحصر ہوتی ہے۔'' ادھر سے جواب آیا۔پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ بڑھیا نے بھی بُل کی ماں کا خطاب ملنے پر بالکل برا نہ مانا۔

بُل جو پہلے سر اٹھائے ہوئے بڑے اعتماد سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، پبلک کے شور مچانے پر قدرے گھبرا گیا۔ ہزاروں آوازوں کا شور ''ہے تورو۔ہے تورو'' اس نے بل رنگ کے چاروں طرف دیکھا۔اپنے پچھلے سُم ریت میں رگڑے اور تنتے ہوئے میدان میں درمیان سر اٹھا کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ ''لیر افتادو'' ناقابلِ تسخیر۔

بُل فائٹنگ ہسپانوی تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا جز ہے جس کے بغیر ہسپانیہ کا وسیع کینوس بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔غیر ملکی اسے بربریت سے بھرپور وحشیانہ اور ظالمانہ کھیل قرار دیتے ہیں۔ بھلا جس کھیل میں ہر بار چھ بھینسے ہلاک ہوں، متعدد گھوڑے زخمی ہو جائیں اور کبھی کبھار انسان بھی مارا جائے، اسے کھیل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ادھر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو موسیقی، رقص اور

مصوری کی مانند فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ بربریت کے الزام کے جواب میں وہ امریکی فٹ بال اور باکسنگ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان ہر دو کھیلوں میں مرنے والوں کی تعداد بُل فائٹنگ میں ہلاک ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر بُل فائٹنگ ظالمانہ کھیل کیسے ہو گیا اور اگر ہو بھی تو ہسپانویوں کے نزدیک اتنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لیے تھوڑا سا ظلم بھی جائز ہے اور جہاں تک ناقدین کا تعلق ہے، وہ جائیں بھاڑ میں۔

ہر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے پرکھتا ہے۔ چند ایک کے لیے یہ جذباتی مسئلہ ہے۔ ان کی تمام ہمدردیاں بُل فائٹر کے ساتھ ہوتی ہیں اور داد و تحسین کے نعرے بُل کے لیے۔ کچھ لوگ اسے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بناتے ہیں۔ کیا بُل فائٹنگ کا انداز ''ویرونیکا'' سینٹ ویرونیکا کے نام پر نہیں جس نے رومال سے حضرت عیسیٰ کے چہرے سے پسینہ پونچھا تھا؟ چند ایک کے لیے یہ انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ میدان میں کھڑا بُل فائٹر ایک ہسپانوی ہے اور اس کے سامنے سرنگوں بُل دنیا کی تمام دوسری قومیں۔ کچھ لوگ بہرصورت بُل فائٹر کو ہلاک ہوتا ہوا دیکھنے کی تمنا لے کر آتے ہیں۔ بہرحال وجوہات کچھ بھی ہوں بُل فائٹنگ ایک ایسا کھیل یا فن ہے جس کے بغیر شاید ہسپانوی روح مردہ ہو جائے۔ جس طرح خوبصورت موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذوق کے ساتھ ساتھ موسیقی کی رمزیں جاننا از حد ضروری ہے۔ اسی طرح بُل فائٹنگ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لیے اس فن کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا بھی انتہائی اہم ہے ورنہ پہلی بار اس کھیل کو دیکھنے والے تماشائی کو شاید بُل فائٹر صرف ایک ظالم قصاب کی صورت میں نظر آئے جو غریب بُل کو ہلاک کر کے عوام سے داد وصول کرتا ہے۔

بُل فائٹنگ کے پیشے کی دلکشی، شہرت، عزت اور دولت ایسے عناصر ہیں جو ہزاروں ہسپانوی نوجوانوں کو ہر سال اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں اکھاڑوں میں استاد پہلوان نوجوان لڑکوں کو داؤ پیچ سکھاتے ہیں اور ان میں سے معدودے چند ہی اس پیشے کی بلندیوں پر پہنچ پاتے ہیں۔ ایسے ہی ہسپانیہ کے اکثر شہروں میں بُل فائٹنگ کے باقاعدہ سکول ہیں۔ وہاں سے کامیاب ہونے والے ایک ہزار نوجوانوں میں سے بمشکل ایک سو کسی چھوٹے موٹے بُل فائٹنگ میں داخل ہوتے ہیں اور ان میں سے دو چار ہی پیشہ ور بُل فائٹر بننے میں کامیاب ہوتے ہیں اور پھر ہزاروں پیشہ ور بُل فائٹروں میں سے ایک دو شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچتے ہیں جن کی کشش انہیں اس پیشے میں کھینچ لائی تھی۔ پیشہ ور بُل فائٹر کا خطاب ہمیشہ میڈرڈ کے بُل رنگ میں دیا جاتا ہے۔

بُل فائٹنگ میں دو طرزیں ہیں۔ ایک اندلس کی اور دوسری میڈرڈ سے متعلق ہے۔ میڈرڈ کی روایات کے پابند بُل فائٹر کا رجحان شوخی کی جانب ہوتا ہے اور وہ بُل کے گزرنے کے بعد ایک بت کی مانند ساکت ہو جاتا ہے۔ بُل فائٹر اندلس کا ہو تو وہ صاحبِ طرز اور پھرتیلا ہوگا۔

ارنسٹ ہیمنگوے اپنی کتاب '' DEATH IN THE AFTERNOON'' میں لکھتا ہے۔ ''اندلس کے صوبے کو ہمیشہ سے یہ فخر حاصل ہے کہ عظیم بُل فائٹروں کی اکثریت ایسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کے بُل بھی ہسپانیہ بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ یہ گرم آب و ہوا اور مسلمانوں کے خون کی آمیزش کا اثر ہے کہ اندلسی بُل فائٹر پُر وقار اور پُرسکون ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیات ہسپانیہ کے دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے بُل فائٹروں میں ناپید ہیں۔''

عام تخیل کے برعکس ایک اچھے بُل فائٹر کے لیے طاقتور ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اچھا بُل فائٹر تکنیک اور سائنس کی آمیزش کو بروئے کار لا کر بُل کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ ایک دفعہ خانہ بدوش بُل فائٹر راخیل ال گالو سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنی طاقت بڑھانے کی خاطر کونسی ورزش کرتا ہے تو اس نے جواب دیا ''مجھے طاقت کی کیا ضرورت ہے؟ عام بُل کا وزن تقریباً آدھ ٹن ہوتا ہے۔ کیا میں ورزش کے ذریعے اس کی طاقت کی ہمسری کر سکتا ہوں؟ بُل کو اپنی طاقت بڑھانے دو۔''

ایک بُل فائٹ میں چھ بُل ہلاک کیے جاتے ہیں اور ہر بُل فائٹر کے حصے میں دو بُل آتے ہیں۔ اگرچہ آٹھ ماہ کے بُل فائٹنگ کے سیزن میں (سردیوں میں بُل فائٹنگ نہیں ہوتی) ایک بُل فائٹر سو سے زیادہ بُل ہلاک کرتا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ بُل فائٹر ہمیشہ ہی اس کھیل کے اختتام پر فاتح بن کر ابھرے۔ کبھی کبھار کسی گرم دوپہر بُل کے نوکیلے سینگ چشمِ زدن میں سنہری ریشمی بال پھاڑ کر سرخ خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ سرخ انسانی خون میں۔۔۔ ہسپانیہ کا عظیم بُل فائٹر مونا لیتے ایک ایسی ہی دوپہر کو جب لنارس کے غیر معروف بُل رنگ میں ہلاک ہوا تو پورے ہسپانیہ میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ اسی لیے تو بُل فائٹ کو پُروقار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک اور افسوسناک بھی قرار دیا جاتا ہے۔

عظیم بُل فائٹروں کی اکثریت بُل کی بجائے ٹی بی اور سفلس جیسے امراض کا شکار ہوتی ہے۔ بُل فائٹر جب بل رنگ میں قدم رکھتا ہے تو سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے۔ بھاری اور تنگ لباس کے اندر ہوا کا گزر تک نہیں ہوتا اور اس کے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بُل فائٹ کے اختتام پر خاصی خنکی ہو جاتی ہے۔ گرمی اور سردی کی شدت اس کے پھیپھڑوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بُل رنگ کی دھول بھی مہلک ثابت ہوتی ہے اور بُل فائٹر ٹی بی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسمی عناصر کے تغیر پر تو اس کا اختیار نہیں مگر سِفلس۔۔۔؟ اس کا جواز کچھ یوں دیا جاتا ہے کہ بُل فائٹر بھی ایک فنکار کی مانند اگر شادی کر لے تو اس کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چونکہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ عورتوں سے میل جول بڑھانے سے قبل انہیں اچھی طرح پرکھ سکے، اس لیے کبھی نہ کبھی کوئی ''چنچل لڑکی'' اسے یہ خوفناک تحفہ دے جاتی

ہے۔بُل فائٹر اپنی جان نہ صرف بُل رنگ میں بلکہ بستر میں بھی داؤ پر لگا تا ہے۔

چونکہ بُل فائٹ اس وقت شروع کی جاتی ہے جب بُل رنگ کا نصف حصہ دھوپ میں اور بقیہ نصف چھاؤں میں آ جائے۔اس لیے بُل فائٹ کے اوقات بدلتے رہتے ہیں۔اس عظیم تماشے کی تکنیک اور کامیابی کا راز سورج کے چمکنے میں پنہاں ہے۔جب تک سورج بُل رنگ کے نصف حصے پر نہ چمکے،بُل فائٹنگ کا لطف نہیں آ تا۔ایک ہسپانوی مقولے کے مطابق ''سورج سب سے عظیم بُل فائٹر ہے۔'' دھوپ کے بغیر بُل فائٹر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہے۔یوں جیسے وہ سائے کے بغیر پیدا ہو گیا ہو۔

بُل فائٹر اور سورج کے بعد بُل فائٹنگ کی سٹیج کا سب سے اہم کردار بُل ہوتا ہے۔ہسپانیہ کے طول وعرض میں متعدد ایسے فارم ہیں جہاں پر بُل فائٹنگ میں حصہ لینے والے اعلیٰ نسل کے بُل پالے جاتے ہیں۔ہر فارم کا بُل خصوصی عادات واطوار کا مالک ہوتا ہے۔تجربہ کار تماشائی بُل کے رنگ میں داخل ہوتے ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں فارم کا پروردہ بُل ہے۔پرورش کے دوران میں سوائے رکھوالے کے اور کوئی شخص بُل کے پاس نہیں پھٹک سکتا تا کہ وہ انسان کے ساتھ میل جول سے اپنے خوفناک جنگلی اطوار نہ کھودے۔یہی وجہ ہے کہ بُل رنگ میں داخل ہوتے ہی تماشائیوں کا شور وغوغا بُل کو پریشان کر دیتا ہے۔دریائے راوی الکبیر کی دلدلوں میں پرورش پانے والے بُل بہترین جانے جاتے ہیں۔ 1857ء میں کونچا فارم کے پروردہ بُل نے اپنے سینگ سے ڈومینگو نامی بُل فائٹر کی ایک آنکھ نکال دی۔اس حادثے کے بعد ڈومینگو کو کانا بُل فائٹر کہا جانے لگا اور اس نے قسم کھالی کہ اب وہ ساری زندگی صرف کونچا فارم میں پلے ہوئے بُل سے ہی لڑے گا۔

بہترین بُل فائٹنگ کے لیے بُل کا وحشی اور ناتجربہ کار ہونا از حد ضروری ہے۔اس لیے جو بُل ایک مرتبہ بُل رنگ میں داخل ہو جائے،اسے ہمیشہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔اگر کسی وجہ سے اسے بُل رنگ میں نہ مارا جا سکے تو پھر بُل فائٹ ختم ہونے پر اسے فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔اگر بُل نہ مارا جائے اور اُسے ایک سے زائد مرتبہ بُل رنگ میں داخل ہونے کا موقع دیا جائے تو پچھلے تجربے کی بنا پر وہ بُل فائٹر کو یقیناً ہلاک کر دیتا ہے۔شروع شروع میں جب یہ پابندی عاید نہ تھی تو ہر سال بُل رنگ میں سینکڑوں بُل فائٹر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔چنانچہ 1567ء میں پوپ نے ان تمام عیسائی شہزادوں کو مذہب سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیدی جن کی ریاستوں میں بُل فائٹنگ رائج تھی۔ بالآخر سب نے متفقہ طور پر ایک ایسا قانون لاگو کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ایک بُل صرف ایک مرتبہ ہی بُل فائٹنگ میں حصہ لے سکتا تھا۔

اب بھی ہسپانیہ کے دور افتادہ قصبوں میں اس قانون کا احترام نہیں کیا جاتا۔قصبے کے باشندے اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ ہر بُل فائٹ کے لیے نیا بُل خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔چنانچہ خرانٹ اور تجربہ کار بُل ہمیشہ بُل فائٹر کو ہلاک کر دیتا ہے۔ایک ایسے ہی بُل کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک سیزن میں سولہ بُل فائٹروں کو ہلاک کر ڈالا۔اس کا سولھواں شکار ایک چودہ سالہ خانہ بدوش لڑکا تھا جس کا ایک بھائی اور بہن اس حادثے کے وقت بُل رنگ میں موجود تھے۔ان دونوں نے قاتل بُل سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد بُل جہاں بھی جاتا،وہ اس کا پیچھا کرتے تا کہ موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیں۔ادھر بُل کا مالک اپنے قیمتی جانور کی بے حد حفاظت کرتا تھا۔اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔یونہی کئی برس بیت گئے اور خانہ بدوش لڑکا اور لڑکی انتقام کی آگ سینے میں سلگائے بُل کا تعاقب کرتے رہے۔بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ بُل بوڑھا ہو گیا اور اس کے مالک نے اسے ناکارہ جان کر ولنسیا کے بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا۔خانہ بدوش جوڑنے بوچڑ خانے کے مالک کو اپنے پیارے بھائی کے ہلاک ہونے کی داستان سنائی اور اس سے درخواست کی کہ انہیں بُل کو مارنے کی اجازت دی جائے۔مالک کو تو صرف بُل کے گوشت سے غرض تھی۔چنانچہ اس نے اجازت دے دی اور یوں لڑکے نے پہلے اپنی انگلیوں سے بُل کی دونوں آنکھیں نوچ ڈالیں اور پھر خون آلود گڑھوں میں تھوکا۔اس کے بعد اس نے ریڑھ کی ہڈی خنجر سے کاٹ دی۔سب سے آخر میں دونوں بہن بھائیوں نے بُل کا کلیجہ نکالا اور بوچڑ خانے سے باہر گرد آلود گلی میں بیٹھ کر اسے ایک سیخ پر بھون کر کھا گئے۔اس انوکھے انتقام کے بعد وہ چپ چاپ اپنے وطن کو لوٹ گئے۔

گیٹ کیپر کو جب اپنا ٹکٹ دکھا کر بُل رنگ کے اندر داخل ہوا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شوخ رنگوں کا ایک متحرک سیلاب ہے جو میری آنکھوں میں کھنچا چلا آتا ہے۔پورا بُل رنگ ایک بڑے ملتانی پیالے کی مانند تھا جس کے اندرونی حصے میں ہر رنگ کے چھینٹے تھے۔بُل رنگ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر میں لکڑی کی سخت نشست پر رکھنے کے لیے گدّا لانا بھول گیا تھا۔یہ گدّے کرائے پر مل جاتے ہیں۔تماشائیوں کی اکثریت ہسپانوی تھی مگر مختلف گروہوں میں غیر ملکی سیاح بھی تھے۔کیمرے اور بُل فائٹ کے کتابچے ہاتھوں میں لیے وہ اپنے گائیڈ حضرات کا منہ تک رہے تھے جو انہیں ہونے والی بُل فائٹ کی تفصیلات بتا رہے تھے۔

بُل کے میدان کے اندر داخل ہونے پر بُل فائٹ شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ایک رسمی کارروائی کے ذریعے ہوتا ہے جس کی تفصیل کچھ کیوں ہے:

بُل فائٹ شاید ہسپانیہ کی وہ واحد تقریب ہے جس کا آغاز وقتِ مقررہ پر ہو جاتا ہے۔عین وقت پر پورا ہجوم بالکل خاموش ہو گیا اور سب کی نگاہیں سایہ دار حصے میں واقع صدر کی کیبن پر لگ گئیں۔صدر نے جو اس تقریب کا مختارِ کل ہوتا ہے،اپنا معطر رومال فضا میں لہرا کر بُل فائٹ کے شروع ہونے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بُل رنگ میں بگل کی آواز گونجی اور شاہانہ لباس

میں ملبوس دو گھڑسوار اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے صدر کی کیبن کے عین نیچے آن رُکے۔ یہ گھڑسوار ''ال گوسلز'' کہلاتے ہیں۔ صدر کے تمام احکامات بُل فائٹر تک پہنچانا ان کے ذمے ہوتا ہے۔ گھڑسوار جھک کر صدر سے پریڈ کے آغاز کی اجازت ملنے پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے بُل رنگ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ صدر کی کیبن سے ملحقہ کیبن میں موسیقاروں کا ایک طائفہ بُل فائٹ کی روایتی دھنیں بجانے لگا۔ ان میں بگل کی آواز نمایاں ہے۔ موسیقی شروع ہوتے ہی لوگوں کی نگاہیں صدر کی کیبن سے ہٹ کر مخالف سمت میں واقع دروازے پر لگ گئیں۔ اب ''پاسیو'' یا پریڈ شروع ہونے کو تھی۔ اس پریڈ میں بُل فائٹ میں شامل تمام افراد اور جانور حصہ لیتے ہیں۔ پاسیو کی قیادت گھڑسوار ''ال گوسلز'' کرتے ہیں۔ ان کے پیچھے تینوں بُل فائٹر شانہ بہ شانہ ٹھوڑیاں اوپر کیے، آنکھیں صدر کی کیبن پر جمائے، ہجوم کی تالیوں کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے سنہری ہیٹ بروکیڈ کی سنہری وردیوں اور ریشمی پتلونوں پر جڑے ہوئے رنگ برنگے شیشوں پر نظر نہیں ٹکتی۔ بُل فائٹروں کے ہمراہ مددگار بُل فائٹر بھی چلے آ رہے ہیں جو آڑے وقت میں بُل کو اپنی طرف متوجہ کر کے بُل فائٹر کی جان بچا لیتے ہیں۔ ان کے عقب میں چپڑاسی ہوتے ہیں۔ چپڑاسیوں کے پیچھے ''باندریلو'' آ رہے ہیں اور پھر گھڑسوار ''پکاڈور'' یا برچھی بردار۔ سب سے آخر میں بُل رنگ میں کام کرنے والے ملازمین ان خچروں کو لیے آتے ہیں جو مردہ بُل کو گھسیٹ کر اصطبل میں لے جانے کا کام کرتے ہیں۔ قاتلوں، ہتھیاروں اور میّت اٹھانے والوں کا جلوس۔

صدر کی کیبن کے نیچے پہنچ کر بُل فائٹر اپنے ہیٹ اتار کر صدر کو رنش بجالاتے ہیں اور پھر جلوس منتشر ہو جاتا ہے۔ بُل فائٹر بُل رنگ کی گیلری کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ باقی عملہ بُل رنگ سے باہر چلا جاتا ہے۔ ''پاسیو'' کا اختتام۔ لکڑی کی گیلری کے پیچھے کھڑے ہو کر بُل فائٹر اپنے نمائشی لبادے اتار کر کسی دوست یا اکثر اوقات اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بُل فائٹ کے دوران میں یہ لبادہ اس شخص کی گود میں یا اس کے سامنے گیلری پر رکھا رہتا ہے جہاں بُل رنگ میں بیٹھے ہوئے تمام تماشائی اسے آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ بُل فائٹر اگر خوبصورتی سے لڑے تو داد و تحسین کے ڈونگرے دوست یا محبوبہ پر بھی برستے ہیں اور اگر خدانخواستہ بُل فائٹر پھسڈی ثابت ہو تو سیٹیاں بجتی ہیں اور انہیں ''اوئے اوئے'' کے نعروں سے نوازا جاتا ہے۔

اس اثناء میں بُل رنگ کے ملازم میدان میں بچھی ہوئی ریت کو ہموار کرتے ہیں جو پاسیو کے گزرنے سے بکھر جاتی ہے۔ کس بُل فائٹر کو کون سے بُل سے مقابلہ کرنا ہے، اس کا فیصلہ بُل فائٹ شروع ہونے سے قبل لاٹری کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اگر بُل فائٹر بہت بلند پائے کا ہو تو مقابلے کے بُل کا انتخاب اس کی ذاتی پسند پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب بُل رنگ میں داخل ہونے والے پہلے بُل کے ساتھ لڑنے والا بُل فائٹر اس کپڑے کا انتخاب کرتا ہے جسے لہرا کر بُل سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ کپڑا ''کیپ'' کہلاتا ہے۔ کیپ باہر سے گلابی اور اندر سے پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بُل فائٹر اپنی کیپ جسم کے ساتھ لپیٹ لیتا ہے اور گیلری کے ساتھ لگ کر بے تابی اور بے چینی کی حالت میں بُل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب ہر بُل فائٹر بے حد مذہبی ہو جاتا ہے۔ وہ فرفر دعائیں مانگتا ہے اور بار بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے۔ ''کنواری مریم آج لاج رکھ لیجیو۔۔۔ کنواری مریم بُل شریف قسم کا ہو۔ سینگ زیادہ نوکیلے نہ ہوں بلکہ کیلے کی مانند ہوں۔ کنواری مریم اگر مجھے بُل کی دُم عطا ہو جائے تو گرجے میں جا کر پوری سوموم بتیاں جلاؤں گا۔''

اُدھر گھڑسوار ''ال گوسلز'' دوبارہ صدر کی کیبن کے نیچے جاتے ہیں اور اصطبل کی چابی طلب کرتے ہیں۔ صدر اوپر سے چابی پھینکتا ہے جو وہ اپنے پروں والے ہیٹ میں دبوچ لیتے ہیں۔ (اگر چابی کو ہیٹ میں نہ اچکا جاسکے تو ہجوم سیٹیاں بجا کر انہیں ہُوٹ کرتا ہے۔) گھڑسوار واپس آتے ہیں اور چابی سرخ دروازے کے پاس کھڑے بوڑھے کی طرف پھینک کر میدان سے باہر نکل جاتے ہیں۔

''تارڑ سٹاپ''

ہم سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے ممتاز اور نامور ادیب جناب مستنصر حسین تارڑ کو فروغ اردو انٹرنیشنل ایوارڈ ملنے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ وہ پچھلی دو دہائیوں سے پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے نثر نگار ہیں۔ اُن کے اولین سفرنامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' نے اردو سفرنامہ نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا اور جدید سفرنامہ نگاری کا آغاز ثابت ہوا۔ اُنہوں نے ممالک غیر کے علاوہ پاکستانی شمال کے بارے میں گیارہ سفرنامے قلم بند کیے اور اس غیر معروف خطّے کی بے شمار وادیوں اور جھیلوں کو متعارف کرایا۔ اس بنیاد پر عبداللہ حسین نے انہیں ''پاکستانی دھرتی کا بائیوگرافر'' کہا ہے۔ اہل شمال نے ان کی خدمات کے اعتراف میں وہاں ایک جھیل کو ''تارڑ جھیل'' اور ایک مقام کو ''تارڑ سٹاپ'' کا نام دیا ہے۔

نیاز احمد
''سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور''

''قصہ پارینہ''

مستنصر حسین تارڑ

''سکوٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھی ایک لڑکی، جو ہنس دی تھی''

نیلے ویسپا سکوٹر کے پچھلی پلاسٹک میں کسی ہوئی نشست پر۔۔۔ بیک سیٹ پر بیٹھی لڑکی، جس کے کولہے ابھی کامل نہ تھے کومل تھے اور اس کے باوجود اُس نشست کو ڈھکتے تھے اور اُن کے بوجھ تلے آئے پلاسٹک شیٹ میں اپنی مدھم حدّت منتقل کرتے تھے۔

مال روڈ کی آفت زدہ، قدم قدم پر رُکتی، لمحہ بھر کے لیے رواں ہوتی پھر رُکتی گھنی ٹریفک میں۔۔۔ کاروں۔۔۔ موٹر سائیکلوں۔۔۔ ویگنوں۔۔۔ سکوٹروں۔۔۔ بسوں کی بھی لائٹیں اُسی طور قدم قدم پر بریکیں لگنے سے روشن ہوتی، بجھتیں، پھر روشن ہوتیں۔ ریگل چوک کی قربت میں۔۔۔ اور وہ جو کبھی پلازہ اور اوڈین کی اُس سینما مثلث کو مکمل کرتا تھا جہاں صرف انگریزی فلموں کی نمائش ہوتی تھی۔ ریگل، جس کے داخلے پر حاجی کریم بخش سٹور کے پہلو میں سینما میں دکھائی جانے والی اکثر اوقات کسی ہالی وڈ کی فلم کا بل بورڈ آویزاں ہوتا تھا۔ سیمسن اینڈ ڈیلائلہ، سلومی، کئو واڈیس۔۔۔ پکنک۔۔۔ وائلڈر نارتھ۔۔۔ سکاراموش۔۔۔ بیئر فٹ کانٹیسا اور بہت بعد میں دے گریٹ اسکیپ۔ میگنی فسنٹ سیون اور کم سپٹمبر وغیرہ اور اُس بل بورڈ کے پہلو میں سٹینڈرڈ کی چھت پر ہر شام، جس پر لاہوری جان چھڑکتے تھے انجیلا ناچا کرتی تھی۔۔۔ جان چھڑکنے میں دور کیا جانا میرا اپنا ایک سکول فیلو مردان کا رہنے والا اُس کے عشق میں مبتلا ہو کر نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنی جائداد کے بیشتر حصے کو بھی برباد کر بیٹھا۔

اس ریگل چوک کے نزدیک، بس سٹاپ کے برابر میں اُس فٹ پاتھ کے پہلو میں وہ سکوٹر رواں تھا جس پر اگلے زمانوں میں ہالی وڈ کی سحر طراز حُسن کی ملکہ، ایوا گارڈنر۔۔۔ جو کبھی ''بیر فٹ کانٹسیا'' کے روپ میں اس ریگل سینما کی سکرین پر جلوے دکھاتی تھی، اور کبھی اوڈین سینما کی سکرین پر ہیمنگ وے کی ''سنوز آف کلی منجاروز'' میں پیرس کے ایک نائٹ کلب میں گریگوری پیک کے قریب سرک کر سرخ لپ اسٹک سے لالہٗ وگل ہوتے ہونٹوں میں بھنچے سگریٹ کو سلگانے کی درخواست کرتی تھی، وہی ایوا گارڈنر ''بھوانی جنکشن'' کی فلم بندی کے دوران بس اسی فٹ پاتھ پر سر شام اپنی لامبی ٹانگوں اور مہک آور بدن کے ساتھ ایک ساتھی اداکار کے ہمراہ چلتی جایا کرتی تھی۔

بس اُسی فٹ پاتھ کے پہلو میں مال روڈ پر وہ ایک نیلے رنگ کا ویسپا سکوٹر گزرتا تھا جس کی پچھلی نشست پر ایک ایسی لڑکی بیٹھی تھی جس کے کولہے ابھی کامل نہ تھے، کومل تھے، اور اس کے باوجود نشست کو مکمل طور پر ڈھکتے تھے۔

پچھلی نشست پر براجمان لڑکی کا بسنتی دوپٹہ لاہور کی مال روڈ کی آلودہ ہوا میں پھڑ پھڑاتا تھا۔

کبھی رواں ہوتی، کبھی رینگتی، کبھی رُکتی، پھر سے رواں ہوتی ٹریفک کا کوئی بھی نقش آنکھوں میں اتنی دیر نہ ٹھہرتا تھا کہ ثبت ہو جائے۔۔۔ روانی اور رکاوٹ کی البتہ کچھ خراشیں تھیں جو باقی رہ جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک خراش کے کینوس پر پل بھر میں گزر جانے والی تصویر کے کچھ شائبے سے تھے، کوئی واضح نقش نہ تھا۔ اور ان فراشوں میں پینٹ کی گئی تصویر میں سکوٹر کی پچھلی نشست پر براجمان ایک لڑکی تھی۔۔۔ اور وہ ایک بار ہنس رہی تھی۔

یہ کوئی ایسا عجوبہ تو نہ تھا کہ ایک سکوٹر کی پچھلی نشست پر ایک لڑکی براجمان ہے۔۔۔ وہ پچھلی نشست محض زیبائش کے لیے تو نہیں بنائی گئی تھی، کسی نہ کسی کے بیٹھنے کے لیے بنائی گئی تھی، کسی امّاں جان کو ہسپتال لے جانے کے لیے، اپنے بچے کو سکول پہنچانے کی خاطر، گھریلو استعمال کی اشیاء کو گھر پہنچانے کے واسطے۔۔۔ بلکہ زندگی میں اپنا پہلا اگرچہ مختصر دو تین مرلوں پر محیط گھر بنانے والے اُس پچھلی نشست پر ایک کموڈ یا ایروکیریا کا ایک گملا باندھ کر بھی اس کی افادیت کو نمایاں کرتے تھے۔ اور اس کے سوا۔۔۔ ایک لڑکی۔۔۔ کامل نہیں کومل۔۔۔ تو یہ کوئی عجوبہ نہ تھا۔

پر اس منظر نے میرے ذہن کے اندر حسد کے جو سپولیے تھے اُن کے ننھے منے پھن کھڑے کر دیئے۔ اُن کی ننھی منّی سرسراتی زبانوں نے مجھے ڈس لیا۔ صرف اس لیے کہ جب وہ نیلا ویسپا سکوٹر جس کی پچھلی پلاسٹک میں کسی نشست پر وہ لڑکی بیٹھی تھی میری آنکھوں کے زد میں آیا تو اُس لمحے وہ لڑکی ذرا آگے ہوئی، اپنے ساتھی سکوٹر چلاتے ہوئے نوجوان کے بائیں کان کے قریب ہوئی اور اُس نے اُس کے کان میں کچھ کہا سرگوشی کی یا بلند آواز میں کچھ کہا اور پھر پیچھے ہوتے ہوئے وہ ہنس دی۔۔۔ بس اسی ہنسی نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا۔۔۔ وہ اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد ایک عورت کی اپنے پہلے مرد کو سامنے پا کر اُس کے عشق میں مبتلا ہو کر سرخوشی اور آسمانی مسرت کے اظہار کی ہنسی تھی جس میں پہلے وصال اور اُس مرد کی پناہ میں آ جانے کی ہوس کی نمود تھی۔

جانے اُس نے اپنے ساتھی کے کان میں کیا کہا تھا۔۔۔

اُس نے جو کچھ بھی کہا، اُس میں محبت کی ایک بے اختیار آمیزش تھی، وہ یقیناً اُس شخص کے عشق میں غرق تھی، اُس کی ہنسی ایسی تھی۔

مجھ سے اس کی عشق میں ایسی سرمست غرقی اور بے پرواہ ہنسی برداشت نہ ہوئی کہ میں محروم تھا، ناخوش اور نا آسودہ تھا۔

جتنی دیر میں آپ دو چار سانس بھرتے ہیں، ایک بار آنکھیں جھپکتے ہیں بس اتنی مختصر مدت میں ٹریفک کی اُس بھیڑ میں رواں اُس سکوٹر کی پچھلی

نشست پر بیٹھی لڑکی گزر گئی۔۔۔میری آنکھوں میں ایک خراش ڈال کر اوجھل ہو گئی۔ پل دو پل کے موجود کے بعد نامعلوم مستقبل میں دفن ہو گئی۔۔۔

لیکن وہ پل جب اُس کولہوں والی لڑکی نے ذرا آگے ہو کر اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی اور پھر پیچھے ہو کر ہنس دی تھی وہ پل سرگوشی اور ہنسی کا میرے بدن پر یوں دائمی طور پر کندہ ہو گیا جیسے ایک مویشی کی کھال پر اُس کا مالک اپنی ملکیت کا سلگتا ہوا ٹھپّہ داغ دیتا ہے۔

اگر میرا بس چلتا تو میں نہ صرف اُس سکوٹر سوار کو بلکہ پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی کو صرف اس جرم کی پاداش میں ہلاک کر دیتا کہ وہ کیوں ایسی محبت بھری ہنسی بے دریغ ہنسی تھی۔۔۔

اگرچہ وہ دونوں، پچھلی نشست پر کولہے پھیلاتی لڑکی اور سکوٹر چلاتا لڑکا میری آنکھوں میں پل بھر تیرے۔۔۔اُن میں ایک خراش ڈالی جس میں وہ لڑکی پیچھے ہوتی ہنستی تھی اور اوجھل ہو گئے لیکن میں ان دونوں کی جان کا بیری ہو گیا۔ ایک شدید نفرت اور بغض نے مجھے کھولا دیا۔ میں حسد سے بھسم ہونے لگا۔۔۔اُس کی یہ محبت بھری ہنسی اور اُس میں سے پھوٹتی خوشی کی پھلجھڑی، وہ کیوں اتنے خوش تھے، بس یہی اُن کا میری برداشت سے باہر نا قابل تلافی جرم تھا۔

ایسا تو نہیں کہ میں ذاتی طور پر ایک مسّرت سے عاری، دُکھ بھری حیات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا اس لیے میں۔۔۔جو کبھی حسد کرنے اور بغض پالنے والوں میں سے نہ تھا اور آج ان دونوں کی نا قابل تردید اُلفت کے مظاہرے سے جل اٹھا تھا۔ میں ایک خوش گوار زندگی بسر کرتا تھا لیکن۔۔۔ خوشی کی اُس کاملیت سے آگاہ نہ تھا جو ان دونوں کے چہروں پر لحہ بھر کے لیے بھڑکی تھی۔ بیوی سے الفت رکھنے والا، دو بچوں سے دن رات لاڈ کرنے والا میں ایک مطمئن اور آسودہ شخص ہوں بلکہ تھا۔۔۔پر اُس ڈھلتی دوپہر میں جب وہ لڑکی اپنے ساتھی سے جڑ کر پھر ہنس دی تو میرے سینے میں ایک بھالا اتر گیا کہ یکدم مجھ پر آشکار ہوا۔ میں کبھی ایسی مسرت سے تو دوچار نہ ہوا تھا۔۔۔ الفت، قربت اور محبت کی مکمل سپردگی کی بے دریغ سرخوشی تو اُس لڑکی کی ہنسی تھی۔ میں محبت اور مسرت کے واہموں کی دُھند میں بھٹکتا رہا۔۔۔ایک فریب اور دھوکے میں مبتلا یہ سمجھتا رہا کہ بس یہی خوشی کی آخری منزل ہے اور اس کیفیت پر قناعت کرتا رہا۔

میں ایک شکستہ خوردہ سناٹے کی حالت میں وہاں۔۔۔اُسی فٹ پاتھ کی قربت میں جس پر کبھی ایوا گارڈنر کی الوہی پنڈلیاں چلنے سے ورم میں آ چکی مچھلیوں کی مانند پھڑکتی تھیں کھڑا رہا اور وہ سکوٹر اور اُس پر سوار لڑکی اور لڑکے میری آنکھوں میں ضبط ہو کر ایک دو پل میں گذر گئے۔

ریگل چوک کے ٹریفک سگنل جو ابھی زردی میں منتقل ہوئے تھے سُرخ لہو رنگ ہو گئے لیکن وہ سکوٹر رکا نہیں اُنہیں نظر انداز کرتے چوک کے پار ہوا۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن شاید وہ لڑکی اپنے ساتھی کی کمر میں بازو حمائل کیے اُس کی پشت سے لپٹتی اور ذرا پیچھے ہوتی ابھی تک ہنستی تھی۔

ریگل چوک کو عبور کر کے اُس سکوٹر کی رفتار میں شاید اس لیے اضافہ ہو گیا ہو گا کہ لڑکے کی پشت سے بار بار جُڑتی لڑکی کے بدن کی ہلکی سلگاہٹ اُس کے اندر سرائیت کر کے اُس پاؤں کی انگلیوں کے پوٹوں تک جا پہنچی اور انہیں ایسا مضطرب کیا کہ اُن کے تلے دبا ہوا ایکسی لیٹر زیادہ دب گیا اور سکوٹر کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ چیرنگ کراس کے چوک میں بھی ٹریفک سگنل سُرخ تھا، لڑکی کے بدن کی ہلکی سلگاہٹ۔۔۔یہ میرا گمان ہے۔۔۔اُس لڑکے کی آنکھوں پر بھی اثر انداز ہوئی، وہ یہی سمجھا ہو گا کہ یہ میری آنکھوں میں اترنے والی لڑکی کے بدن کی سلگاہٹ کی سُرخی ہے۔۔۔ٹریفک سگنل کی روشنی سبز ہے، وہ رکتی ہوئی ٹریفک کے ساتھ نہیں رُکا۔۔۔چیرنگ کراس چوک کے پار ہونے لگا۔۔۔جب کہ کوئینز روڈ کی جانب سے آنے والی ٹریفک کا اژدہام حرکت کرنے لگا تھا۔

وہ دونوں ایک قصہ پارینہ ہوئے۔۔۔

گنگا رام ہسپتال کی جانب سائرن بجاتی فریادیں کرتی، موت کی قربت کی دوہائی دیتی ایمبولینس میں وہ ایک قصہ پارینہ ہوئے۔

مجھے یقین ہے کہ اُس کچلی جا چکی لڑکی کے خون آلود لبوں پر وہی ہنسی ٹھہری ہوئی ہو گی اور میں اس مردہ ہنسی کو بھی برداشت نہیں کر پاتا، میں راکھ ہوتا ہوں۔۔۔آج بھی میں اُس لڑکی سے نفرت کرتا ہوں جو مال روڈ کی گھنی ٹریفک میں پچھلی نشست پر اپنے کولہے پھیلائے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کر کے پیچھے ہوتے ہنسی تھی۔۔۔

○

''مرہم لُطف ووفا''

مرہم لُطف و وفا تجھ کو کہاں آئے زخم
ہم سفر تجھ کو کہاں لے گئی تیری پرواز
آگ کس طرح ترے جسم کے نزدیک آئی
کیسے پٹرول کے شعلوں سے دبا شعلۂ ساز

(مصطفیٰ زیدی)

☆

''خاک سے افلاک تک''

حمد باری

دشت ہو صحرا ہو یا بہتا ہوا دریا کوئی
حکمِ خالق کے سوا ہلتا نہیں پتّہ کوئی

اِک نظامِ زندگی ہے اِک نظام کائنات
دو نظاموں میں تصادم کا نہیں خطرہ کوئی

خاک سے افلاک تک ہر ذرّے میں اُس کا وجود
اُس کی خلاّقی ہے کیسی یہ نہیں سمجھا کوئی

وقت کیا ہے فاصلہ کیا؟ جانئے قرآن سے
کیسے؟ صدیوں میں بدل جاتا ہے اک لمحہ کوئی

نیک و بد کے فرق میں پنہاں ہے ابدی زندگی
ابدیت تک پھر بھی ہم میں سے نہیں پہنچا کوئی

جسم و جاں جس کی امانت ہے اُسے لوٹایئے
لیکن اس کی حمد سے غافل نہ ہو بندہ کوئی

عصرِ حاضر میں بھٹکتے آدمی کی ہے دعا
شہرِ عرفاں کے لیے وا ہو نیا رستہ کوئی

غالب عرفان (کراچی)

نعت

سب سے اولیٰ و اعلیٰ پہ لاکھوں سلام
سب کے آقا و مولا پہ لاکھوں سلام

پست رفعت سے جن کی ہے بامِ فلک
حاصل اوجِ سدرہ پہ لاکھوں سلام

ختم جن پر ہے ہر عزت و منزلت
آپ کی شانِ والا پہ لاکھوں سلام

حاملِ شرع و شارع پہ لاکھوں دُرود
ہادی ء دین و دنیا پہ لاکھوں سلام

کوئی ہمسر کہاں جس کا سایہ نہ تھا
اس کے قد اُس سراپا پہ لاکھوں سلام

جس کی تابانیاں شرق میں غرب میں
ماہِ طیبہ و بطحا پہ لاکھوں سلام

بوریا عمر بھر جن کا بستر رہا
اُن کے زہد و تقویٰ پہ لاکھوں سلام

جان دے کر یہ دیں جس نے زندہ کیا
آپ کے اُس نواسہ پہ لاکھوں سلام

جو رہے ہر جفا پر بھی ثابت قدم
آپ کے اُن صحابہ پہ لاکھوں سلام

خورشید انور رضوی (اسلام آباد)

عرس کملے شاہ

نندکشور وکرم
(دہلی، بھارت)

عرس شروع ہو چکا تھا اور دُور دراز سے لوگ جوق در جوق آ کر درگاہ پر حاضری دے کر اپنے من کی مرادیں مانگ رہے تھے۔ کوئی چادر چڑھا رہا تھا تو کوئی پھول کی تھالی۔ بڑے ہال میں مشہور قوال بن خاں رامپوری اور اُس کے ساتھی اپنی بلند آہنگ آواز سے حضرت امیر خسرو کا کلام پیش کر رہے تھے اور زائرین بیٹھے مستی سے جھوم رہے تھے اور بعض عالمِ وجد میں رقص کر رہے تھے۔ اس موقع پر مینا بھی حسبِ معمول سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آ چکی تھی اور بے چینی سے پیڑ کی اُونچی شاخ پر بیٹھی چاروں طرف آسمان میں نظر دوڑا کر طوطے کو کھوج رہی تھی جسے دُور مدھیہ پردیش کے جنگلوں سے ابھی تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ طوطا تو عموماً مینا سے پہلے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور وہ موسمِ بہار کا یہ مہینہ اسی پیڑ پر بسر کرتے اور عرس کی گہما گہمی سے لطف اندوز ہوتے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ وہ مدتوں سے حسبِ معمول یہاں انہی دنوں آتے، جس کی بنا پر کملے شاہ کے عقیدتمندوں کا کہنا تھا کہ طوطا حضرت کملے شاہ ہیں اور مینا اُن کی اہلیہ۔

مینا طوطے کا انتظار کرتے کرتے متفکر ہو گئی تھی اور اُس کے دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ پھر اچانک ایک عجیب سا خیال اُس کے دماغ میں اُبھرا اور وہ خوف سے کانپ اُٹھی۔ ''کہیں طوطا کسی............ نہیں نہیں خدا کرے ایسا نہ۔ مگر پھر وہ کہاں رہ گیا۔ کہیں کسی شکاری نے اُسے زخمی یا ہلاک تو نہیں کر دیا۔ حالانکہ سرکار نے تو ان کے پکڑنے یا مارنے پر سخت پابندی عائد کر رکھی ہے مگر شکاری کہاں پرواہ کرتے ہیں؟ انہیں نہ دیا ہے نہ ماتما۔ وہ تو اتنے وحشی ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے بھائی بندوں کو مارنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تو پرندوں کو کہاں بخشیں گے؟''

مینا یہ سب سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے خدشات سر اُٹھا رہے تھے۔ ابھی وہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اتنے میں اسے پیڑ پر طوطے کے اُترنے کی آواز آئی۔ اُس نے سوچ و فکر میں مندھی آنکھوں کو کھولا تو اپنے پاس کی شاخ پر اُسے طوطا بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ بھی اُڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اور بڑے اُداس لہجے میں طوطے سے بولی۔ ''میاں مٹھو! کہاں رہ گئے تھے۔ تمہارے بارے میں سوچ کر مجھے بے حد چنتا ہو رہی تھی۔ خیریت ہے نا......؟''

اتنے دُور سے آنے کی وجہ سے طوطے کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے وقفے سے اُس نے کہا۔ ''ہاں خیریت ہی سمجھو۔ بس چلنے ہی لگا تھا کہ بڑے زور سے بارش اور طوفان نے آ گھیرا۔ بارش کے ساتھ اتنا زبردست جھکڑ شروع ہو گیا کہ کئی بڑے بڑے پیڑ تک اُکھڑ گئے۔ جس سے کئی جانور اور پرندے لقمۂ اجل ہو گئے۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی میں جس پیڑ پر بیٹھا تھا وہ بھی طوفان کی زد میں آ گیا جس سے میرے کئی بھائی بند مارے گئے۔ میں خوش قسمتی سے بچ گیا۔ کیونکہ پیڑ جس جگہ پر گرا تھا وہاں ایک چٹان تھی اور اس میں ایک چھوٹی سی غار نما جگہ میں میں جا گرا اور اس کے اُوپر پیڑ کے ایک بڑے تنے نے اُس جگہ کو ایسا ڈھانپا کہ وہ ایک محفوظ پناہ گاہ کی صورت اختیار کر گئی اور میں طوفان کی زد سے بچ گیا۔ اور جب طوفان تھما تو میں نے یہاں آنے کے لئے فوراً اُڑان بھری اور جداز جلد پہنچنے کے لئے راستے میں بہت کم آرام کیا۔

طوطا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا اور مینا بڑے متفکرانہ انداز میں بنا آنکھ جھپکائے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اور اُسے وہ زمانہ یاد آ گیا جب اُس کی اور طوطے کی دوستی ہوئی تھی۔ وہ برسوں سے موسمِ بہار میں چند مہینے اس پیڑ پر ہی کاٹتی تھی اور پھر دور پہاڑوں کی جانب پرواز کر جاتی تھی۔ اُس کا یہ معمول برسوں تک چلتا رہا تب ایک دن میاں مٹھو بھی اتفاق سے اسی پیڑ پر آ بیٹھا۔ اور کچھ مدت دونوں نے مل کر یہاں گزاری اور پھر اُن کی ایسی گہری دوستی ہو گئی کہ انہوں نے عہد کیا کہ جب تک زندگی ہے ہر سال اسی پیڑ پر ملا کریں گے۔ لہٰذا طوطے کے آنے میں تاخیر ہونے سے وہ انتہائی متفکر ہو گئی تھی۔

جب طوطا اپنی رام کہانی کہہ چکا تو مینا نے اس کے دشوار اور پُر مصائب سفر کا حال سُن کر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ ''میاں مٹھو! میں سوچتی ہوں کہ ہم آئندہ یہاں آنا بند کر دیں۔ اب ہم میں اتنی ہمت نہیں رہی اور عمر نے اتنا تھکا دیا کہ ہمیں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہی رہنا چاہیے اتنی دور آنے میں بڑی دِقتیں ہیں۔ طوطا بولا۔ دِقتیں تو ہر جگہ ہیں۔ اور موت تو کہیں بھی آ سکتی ہے اس لئے ہمیں اس خوف سے اپنے برسوں کے پروگرام کو جاری رکھنا چاہیے۔ دیکھو یہ ہزاروں لوگ بھی تو اتنی دُور دراز سے زیارت کے لئے آتے ہیں اور من کی مرادیں پاتے ہیں۔ شاید میں بھی یہاں آج کملے شاہ جی کی مہربانی سے پہنچا ہوں۔ اگر مجھے اُن سے عقیدت نہ ہوتی تو میں بھی وہاں اُس طوفان بادوباراں میں مارا جاتا۔ شاید حضرت نے میری حفاظت کی کہ میں یہاں اُن کے عرس پر پہنچ گیا۔ ورنہ......

''ورنہ کیا۔؟ یہ سب تمہارا سوچنے کا انداز ہے۔ یہ ہماری کورانہ عقیدت ہے۔ اور عقیدت کسی پتھر سے بھی ہو تو وہ بھی بھگوان بن جاتا ہے۔ ورنہ پتھر تو پتھر ہی ہے۔ اور یہ کملے شاہ......؟''

''مینا! تمہیں تو ان مزاروں، درگاہوں، سے کبھی عقیدت نہیں رہی مگر مجھے تو ہے اور میں ہی نہیں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ہے۔ اب حضرت کملے شاہ کے مزار کو ہی دیکھو۔ لوگ دور دراز سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے اور من کی مرادیں پانے یہاں آتے ہیں۔ اور......''

مینا نے بیچ میں ہی طوطے کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ارے! تم تو کورانہ عقیدت کے کارن کچھ جاننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ اور دوسرے مریدوں اور

پیروکاروں کی طرح اُن کے کارناموں اور کراماتوں پر پورا اعتقاد رکھتے ہو مگر تمہیں معلوم ہے کہ یہ کملے شاہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟''

''ہاں جانتا ہوں وہ بڑے پہنچے ہوئے فقیر تھے اور بہت دور دراز سے یہاں آئے اور انہیں یہ پُرسکون جگہ پسند آگئی اور انہوں نے یہاں اپنا ڈیرہ جما لیا اور پھر زندگی کی آخری سانس تک یہیں صبر وقناعت سے پڑے رہے اور بالآخر یہیں سپرِدِلحد کئے گئے۔

مینا ہنس پڑی اور تمسخر سے بولی۔''میاں مٹھو تم بھی بہت سیدھے ہو۔سُنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہو۔مگر ایسا نہیں کیونکہ مَیں کملے شاہ کی موت سے پیشتر بھی اسی پیڑ پر مقیم رہتی تھی۔اور مَیں نے اِس درگاہ کی تعمیر، پھر معتقدوں کے جوق در جوق آنے اور پھر یہاں شاندار عرس کے انعقاد کا سلسلہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔مَیں اس کہانی سے پوری طرح واقف ہوں۔

''اچھا مگر مَیں کہاں تھا؟''

اُن دنوں ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور تمہارا اِدھر آنا نہیں ہوا تھا۔تب مَیں دُور پہاڑوں سے آکر اس پیڑ پر تنہا بیٹھی رہتی تھی۔تم تو اس کملے شاہ کی درگاہ بننے کے بعد یہاں آئے تھے۔اور مَیں اُن کی زندگی اور درگاہ کے قیام کے بارے پوری طرح سے واقف ہوں۔''

''اچھا تو بتاؤ! بابا کملے شاہ جی کہاں سے آئے تھے اور ان کی وفات کیسے ہوئی؟''

طوطے کے استفسار پر مینا چند منٹ خاموش رہی جیسے وہ واقعات کے تانے بانے کو سلجھا رہی ہو یا واقعات کو ترتیب میں لانے کی کوشش کر رہی ہو۔پھر کچھ توقف سے بولی۔''سُن طوطے! یہ کہانی برسوں سے میرے دل میں گھٹن پیدا کر رہی ہے کئی بار سوچا مگر افسوس کہ اسے کسی کو سنا نہیں پائی۔آج تیرے استفسار پر تجھے حرف بہ حرف سناتی ہوں کہ یہ راز میری موت کے بعد میرے ساتھ ہی ختم نہ ہو جائے۔قصہ یوں ہے کہ......

طوطا بڑے دھیان سے مینا کی بات سننے کی غرض سے اُس کے اور نزدیک کھسک آیا اور بڑے انہماک سے اُس کی باتیں سننے لگا جیسے کوئی شردھالو پنڈت جی سے کوئی دھارمک کتھا یا کوئی عقیدتمند بزرگ مولوی کا وعظ یا کوئی سامع کسی مقرر کی مسحور کن تقریر سننے میں کھو گیا ہو اور مینا بولے جا رہی تھی......''

''یہاں سے کوئی آٹھ میل دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔''سید پور''۔گاؤں کے زمیندار رام پرساد کا بیٹا جانکی رام جو فوج میں حوالدار تھا، چھٹیاں گزار کر جب واپس میرٹھ اپنی رجمنٹ میں حاضری کے لئے جا رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ گاؤں کا کالے شاہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔اُس نے اُسے بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ وہ واپس گاؤں چلا جائے مگر وہ واپس جانے کے بجائے اُس کے پیچھے پیچھے ہی چلتا رہا۔گاؤں بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا اور گاڑی کا وقت ہو رہا تھا لہٰذا اُس نے سوچا چلو اسٹیشن سے خود بخود ہی واپس آجائے گا مگر وہ اس کا تعاقب کرتا ہی رہا۔لیکن اچانک کرنا خدا کا کیا ہوا کچھ میل چلنے پر جب وہ سڑک کراس کر رہا تھا کہ اُسے بڑی زوردار چیخ سنائی دی۔اُس نے مُڑ کر دیکھا تو اُس کی بھی چیخ نکل گئی کیونکہ ایک تیز رفتار ٹرک نے اُسے کچل کر رکھ دیا تھا اور بغیر رُکے تیزی سے بہت دُور نکل گیا تھا۔جانکی رام کے اُس کی اچانک بے وقت موت پر آنسو نکل آئے اور اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے چند ہی لمحوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔اُس کی موت سے اُسے ناقابلِ بیاں دکھ ہوا۔وہ اُسے ٹھکانے لگانے کی تدبیر سوچنے لگا۔تبھی اُس سڑک پر کچھ مزدور جاتے دکھائی دیئے جو علی الصباح کام پر جانے کے لئے وہاں سے گزر رہے تھے۔جانکی رام نے انہیں کچھ پیسے دے کر سڑک کے کنارے گڑھا کھدوا کر اُسے وہاں دفن کر دیا اور اپنا کمبل اُسے اوڑھا کر اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

''پھر؟''طوطے نے حیرانی سے پوچھا۔

مینا نے کہا۔''اتفاق سے کسی سیٹھ اور سیٹھانی کا ادھر سے گزر ہوا۔انہوں نے اُسے کسی پیر کی قبر سمجھ کر سلام کیا اُس پر اپنی سبز چادر چڑھا دی۔یہی نہیں انہوں نے بڑی عقیدت اور شردھا سے مراد مانگی کہ اگر اُن کا بیمار بیٹا روبہ صحت ہو گیا تو وہ یہاں لنگر کرائیں گے۔اتفاق سے ان کا بیٹا چند دنوں میں چنگا بھلا ہو گیا اور اُنہوں نے اسے کملے شاہ کی کرامات سمجھ کر اپنی منت کی تکمیل پر وہاں ایک لنگر ہی نہیں کرایا بلکہ قبر کو پختہ بنوا کر اس کے چاروں طرف فصیل بھی بنوا دی۔پھر کیا تھا ہندو مسلمان سبھی مذہب کے لوگ جوق در جوق وہاں مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے اور منتیں مانگنے کے لئے آنے لگے۔اور علاقے میں پیر کملے شاہ کی کراماتوں اور معجزوں کی کہانیاں پھیل گئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ علاقے کے بے شمار لوگ اس درگاہ کے مرید بن گئے اور وہ جب بھی آتے اسے جھک کر سلام کرتے اور منتیں مانگتے اور بعض کی مرادیں پوری بھی ہو جاتیں۔اس پر اس کے بارے میں کئی کرامات زبان زد خاص وعام ہو گئیں۔

کوئی کہتا۔'' کملے شاہ بڑے پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔اُن کے مزار پر مانگی ہوئی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔''

اور کوئی دوسرا اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا۔''ہمارے پڑوسی کی بیٹی سخت بیمار تھی۔اسے کملے شاہ کے مزار پر لایا گیا اور چنگی بھلی ہو گئی۔''

''شہر میں ایک شخص بہت مفلسی اور تنگدستی کی حالت میں تھا، اس نے روزانہ مزار پر حاضری دینی شروع کر دی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت امیر آدمی بن گیا۔''

عرس کے ابتدائی دنوں میں کسی منچلے مرید نے طوطا اور مینا کو پیڑ پر دیکھ کر ایک نئی کہانی کا اختراع کیا کہ انہیں خواب میں پیر جی نے درشن دے کر کہا ہے کہ وہ طوطا مینا کی شکل میں جنم لے کر پھر اس مزار پر واپس آئیں گے۔بس کیا تھا ہندو تو ہندو اُن کے سادہ لوح عقیدتمند مسلمان بھی اس بات پر اعتقاد کرنے لگے کہ طوطا ان کے پیر صاحب ہیں اور مینا ان کی اہلیہ جو ہر سال معلوم نہیں کہاں سے عرس کے موقع پر آتے ہیں اور پھر عرس کے بعد نہ جانے کہاں جنگلوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔''

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ کیجیے

"دوسری کربلا"

رتن سنگھ (نوئیڈا، بھارت)

اُس دن کی صبح
جوانی کے دور میں داخل ہونے کے لیے خوش خوش آگے بڑھ رہی تھی۔
تا کہ اس سردرُت میں دوپہر کی تمازت سے لطف اندوز ہو سکے۔
اُس وقت پنجاب کی دھرتی میں سرسوں کے پھول یوں کھِل اُٹھے تھے جیسے قدرت نے دھرتی کے "ربیجے" پر پیلی پٹ کے پھول کاڑھ کر خوبصورت پھلکاری بنادیا ہو۔
اس وقت پاک پتن کے باغوں کے پھول حضرت بابا فرید شکر گنج کی درگاہ پر نچھاور ہونے کے لیے کسی مالی کے ہاتھوں کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔
اس وقت "پنجہ صاحب" کے گوردوارے سے گوربانی کی آواز فضاؤں میں امن کا پیغام دے رہی تھی:
"نہ کوئی بیری نہ بیگانہ
سگل سنگ ہم کو بھی آئی"
اُس وقت ہیر رانجھے کے پیار میں ڈوبی اُس کے لیے میٹھی چُوری کا بھٹہ لے کر چناب کے کنارے پہنچنے والی تھی اور کسی میلے ٹھیلے میں کوئی سخی اِکتارے پر میرزا صاحباں کی پیار کہانی مہک مہک کر سنا رہا تھا۔
ہاں ٹھیک اُس وقت
یہ ہوا کہ
سورج غروب ہو گیا۔
اور دن کے وقت دھرتی پر اچانک کالی رات اُتر آئی
کالی رات بھی ایسی
جس میں
آسمان سے چاند اور ستارے بھی غائب تھے۔
ابھی اُن کے طلوع ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔
اس گہری کالی رات کے اندھیرے پھیلے تو کچھ درندے جو وقت کے شروع سے انسانی خون سے اپنی پیاس مٹاتے رہے ہیں۔
جنہوں نے کبھی
بھُو کے شیروں کے سامنے آدمیوں کو پھینک کر
ٹھہاکے لگائے تھے۔
جنہوں نے یزید بن کر کربلا کے میدان میں
حضرت زینب کے ننھے عون اور محمد
اور حضرت حسن کے ننھے علی اصغر کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔
جنہوں نے گورو گوبند سنگھ کے چار شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔
ہاں وہی درندے
روپ بدل کر
پشاور کے آرمی سکول میں داخل ہوئے
اور پھر یہ ہوا کہ۔۔۔
ایک سو بیس بچوں کی زندگی
دیواروں پر
فرش پر
علم کی کتابوں اور کاپیوں پر
مستقبل کی تحریروں پر
خون کے دھبوں کی شکل میں نقش ہو گئی
اور وہ بچے
جنہوں نے ایک عمر تک
زندگی کا سفر کرتے ہوئے بہت دُور تک جانا تھا
اُن کے وجود
لاشے بن کر
تابوتوں میں بند ہو گئے
جس وقت یہ ظلم ہو رہا تھا
تو
کسی درندے نے
گولی مارنے سے پہلے
بچوں سے کہا۔۔۔
"کلمہ پڑھو"
بچوں نے کلمہ پڑھا
اور سچے دل سے پڑھا۔
آخری وقت میں اپنے اللہ کو، اپنے رسول کو
یاد کیا تو
اُن معصوموں کی آواز
قریب ہی کہیں رکھے اُس جزدان تک پہنچ گئی
جس میں
قرآن شریف کی متبرک کتاب بڑے احترام اور اہتمام سے رکھی تھی
لیکن یہ آواز خون میں ڈوبی ہوئی تھی

اس لیے بچوں کے خون کے دھبے قرآن شریف کے اُن اوراق تک پھیل گئے
جن میں انسان دوستی کا پیغام دیتے ہوئے
حضرت محمدؐ نے
اللہ کے اس حکم کی طرف اشارہ کیا ہے
کہ
''کسی بھی مظلوم کا قتل، پوری انسانیت کا قتل ہے''
ان درندوں کے اس بزدلی بھرے احمقانہ قدم کی وجہ سے اللہ کے حکم کی ایسی
نافرمانی دیکھ کر حضرت زینب اور حضرت حسن کے منہ سے ایک ساتھ نکلا
''توبہ!''
''یہ طالب علم کل کو اُس سچ کی تلاش میں نکلتے جس کے لیے ہم نے کربلا میں
شہادت دی تھی۔''
ایسا سوچتے ہوئے
غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں انہوں نے فرمایا
''یہ تو دوسری کربلا جیسا سانحہ ہے۔''
ان عظیم ہستیوں کے درد بھرے الفاظ کو سن کر
وقت کی آنکھوں سے پل پل آنسو بہہ نکلے۔
ان آنسوؤں سے بھیگ کر پنجاب کی دھرتی کے تمام پھول مرجھا گئے۔
پاک پتن اور پنجہ صاحب کی دھرتی سوگوار ہوگئی۔
ہیر اور میرزا کی پیار کہانی کے حروف ماتم کرتے کرتے کالے پڑ گئے
پیار کرنے والوں کے بین کو سن کر، کالے دِن کی کالخ اور گہری ہوگئی۔
اور یہ کالخ آنے والے دنوں پر پھیلتی چلی گئی۔
اس کالخ کو پھیلتے دیکھ کر
وقت
کراہ کراہ کر کہہ رہا ہے
کہ
مستقبل کی تاریخ کے پنوں سے دہشت گردی کا کالا حرف مٹے گا
تبھی،
اس دھرتی پر روشن دن طلوع ہوگا۔
جب تک ایسا نہیں ہوتا
آنے والے دن کالے کے کالے ہی رہیں گے۔

بقیہ: عرس کملے شاہ

''اور ہاں مَیں یہ تو بتانا ہی بھول گئی کہ جن دنوں سیٹھ جی قبر کو پختہ کرا رہے تھے، ایک بیروزگار لیکن پڑھے لکھے نوجوان نور محمد کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے وہاں کسی کو مقیم نہ دیکھا اُس جگہ کو اپنا مسکن بنالیا اور وہ آنے جانے والوں کی خدمت کرنے لگا۔ پھر کچھ مدت بعد اُس نے اپنا ایک خادم بھی رکھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا حلیہ بھی بدل گیا۔ اُس نے کرتے شلوار کی جگہ لمبے کرتے اور گھٹنے دار پاجامے کو پہننا شروع کردیا اور شیروانی کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر خاکی رنگ کی ٹوپی نے اُس کی شناخت میں ایک انفرادیت پیدا کردی اور وہ نور محمد سے سید نور شاہ بن گیا اور وہ مزار کے پہلو میں بنے حجرے میں بیٹھے اپنے آنے والوں مریدوں کو دعاؤں اور پرشاد سے نوازنے لگا۔ پھر وہ خلق خدا کی بیماری اور حاجت روائی کے لئے دم درود، تعویذ اور دھاگہ بھی کرنے لگا۔ جس سے بہت سے لوگوں کو شفا بھی مل جاتی اور بہت سوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری ہوجاتیں، دلی مرادیں برآتیں جس سے عقیدتمندوں کی آمد میں روز بروز اضافہ ہوتا۔''

''کچھ سال بعد نور شاہ نے پیر کملے شاہ کے عرس کی بنیاد ڈالی اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین پیر اکبر شاہ نے اس سلسلے کو روایت کے مطابق بڑی عقیدتمندی سے جاری رکھا اور اس موقع پر لنگر، مشاعروں اور قوالیوں کا اہتمام بھی بڑے زور شور سے کیا جانے لگا۔ اور اب یہ ان کا ۶۳واں عرس ہے جس کے اشتہارات دیواروں اور اخبارات میں بڑی تعداد میں شائع کرائے گئے ہیں۔''

آج عرس کا آخری دن تھا اور کملے شاہ کے مرید اور عقیدتمند جوق در جوق ان کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آ جا رہے تھے۔ بڑے ہال میں قوالیوں کا پروگرام بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ اور مینا طوطے پر کملے شاہ کی داستان، زندگی کے اسرار کھول رہی تھی۔

''پھر مینا کچھ ٹھہرنے کے لئے خاموش ہوگئی اور پھر اُس نے طوطے کو مخاطب کرکے کہا۔ ''میاں مٹھو! جانتے ہو وہ کالے شاہ کون تھا؟

''نہیں۔''

''میرے بھولے بھالے مٹھو! وہ کملے شاہ جانکی رام کا پالتو کُتا تھا جو گاؤں سے اُس کے پیچھے چل پڑا تھا اور یہاں حادثے کا شکار ہوگیا۔''

یہ سُن کر طوطے کی آنکھیں حیرت واستعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ نہ جانے کس دنیا میں کھو گیا اور نیچے ہال میں قوال بڑی عقیدت واحترام سے اُونچی آواز میں گا رہے تھے:

چل نہ اِترا کے بہت تجھ کو بھی آنا ہے یہاں — دیکھ او گورِ غریباں سے گزرنے والے

ڈاڑھی

صغیر رحمانی

(بہار، بھارت)

ٹیکسی میں بیٹھتے بیٹھتے ہی اس نے اپنا پرس کھولا۔سوسو کے دو پتے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی۔'رونی سے یہاں تک کے دو سوروپے...؟ سچ ایکدم گلا کاٹنے لگے ہوتملوگ۔'

ٹیکسی ڈرائیور بھی کچھ کم ٹھس نہیں تھا، چھوٹتے ہی بولا۔'وقت بھی تو کافی لگتا ہے میڈم اور پھر پیٹرول بھی تو...'

'ارے مجھے معلوم ہے، پیڑول سے ہی چلتی ہے، پانی سے نہیں'اسکی آواز میں قدرے جھلاہٹ تھی۔کھسک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔'چلو بیٹے، باہر نکلو۔' اسٹینڈرڈ تھری میں پڑھ رہی اپنی بیٹی کو اس نے باہر کیا پھر خود بھی باہر آ گئی۔کچھ نیچے تک سرک آئے نظر کے چشمے کو اس نے انگلی سے اوپر کیا پھر موبائل میں وقت دیکھنے لگی۔ابھی سوا دس بجا تھا۔اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر پیدا ہوا۔شکر ہے، وقت سے اسٹیشن پہنچ گئی۔اسکی ٹرین گیارہ پینتالیس میں تھی۔

جب کہیں جانا ہوتا ہے، ایک عجیب طرح کے، نامعلوم اندیشہ سے بھر جاتی ہے وہ۔کئی روز پہلے سے ہی سفر کا ایک ایک سامان بیگ میں رکھتی جاتی ہے۔یہ نہ چھوٹ جائے وہ نہ چھوٹ جائے۔کہیں ٹریفک کے جام میں نہ پھنس جائیں، کہیں ٹرین نہ مس ہو جائے، اتنے بجے گاڑی ہے، اتنے بجے نکلنا ہوگا۔عجیب سی گھبراہٹ، ضطراب اور خدشہ سے گھری رہتی اور سامان اکٹھا کرتی رہتی۔ساتھ ہی سارا جوڑ گھٹاؤ اس کے اندر چلتا رہتا۔

لیکن وہ تو وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔تین روز قبل سے جو ایک بےچینی غالب تھی اس پر، اچانک وہ راحت میں تبدیل ہو گئی تھی۔گہری سانس خارج کرتے ہوئے پرسکون نظروں سے اس نے چاروں جانب دیکھا۔نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کا نظارہ ہی بدلا ہوا تھا۔چپے چپے پر پولیس لگی ہوئی تھی۔

'ارے یہ کیا بھیا، اتنی فورس کیوں ہے...؟' اس کے منہہ سے یکلخت نکلا۔

' کچھ ہوا ہوگا میڈم...' ڈرائیور نے لاپرواہی سے کہا اور اتنی ہی لاپرواہی سے ڈگی سے اس کا سامان نکال کر اس کے پیروں کے پاس پٹک دیا۔

'ارے سنبھال کے بھیا۔پاپا کے آچار کی شیشی ہے اس میں۔نہ جانے ٹوٹی یا بچی...؟' اس نے تھیلا اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔'پر یہاں ہوا کیا ہے...؟ اتنی پولس...؟ ریل منتری تشریف لا رہے ہیں کیا...؟'

'ارے ہٹا لے وہاں سے...جلدی کر۔'ذرا دور کھڑے پولیس کے جوان نے ٹیکسی ڈرائیور کو آواز لگائی تھی۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو وہ قلیوں کی طرف دیکھنے لگی۔دو دو قلی اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

'ارے بھئی دو نہیں، ایک چاہیے۔سامان ہی کتنا ہے...؟'

'ہاں میڈم چلیے...' ایک آگے بڑھ کر بولا تو دوسرا واپس مڑ گیا۔

'ریوا ایکسپریس...'

'چار نمبر میڈم...'

'چلو...'

'پچاس روپیا میڈم...'

'کیا...؟' حیرت واستعجاب سے اس کا منھ کھل گیا۔

'ایہے ریٹ ہے میڈم...'

'کیا مجھے نہیں معلوم؟ پہلی بار جا رہی ہوں؟ ہر دو ماہ پر کانپور جاتی ہوں۔بیٹے، جاتے ہیں نا ہم؟ مجھے الّو بنا رہے ہو؟ ایکدم سے لوٹ مچی ہے...؟'

'ایہے ریٹوے ہے میڈم۔چلنا ہو تو...' وہ اسکا بیگ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔

'اوہ مما، چلئے نا...' اسکی بیٹی زچ ہو رہی تھی۔

'یہاں رکیے نہیں، رکیے نہیں۔چلتے رہیے...' وہی پولیس والا پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

عجیب بےبسی تھی۔کشش و پنچ میں پڑی بیٹی کا ہاتھ تھامے کھڑی رہی کچھ دیر، پھر قلی سے مخاطب ہوئی۔

'چلو لیکن ٹرین میں برتھ تک چھوڑنا ہوگا...؟'

قلی مسکراتا ہوا تیار ہو گیا۔عام طور پر قلی برتھ تک ہی سامان پہنچاتے ہیں، پر اسے لگا، اسکی بات رہ گئی، اب پچاس وصول ہو جائیں گے۔

'بھیا، آج اتنی پولس کیوں ہے یہاں؟ آپ کے لالو جی آ رہے ہیں کیا...؟ ارے بیٹا ٹھیک سے ...نیچے دیکھکر چلو نا...'وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

'میڈم، آپکو کچھو معلوم نہیں ہے کا...؟ بمبے ٹیشن پر اتنک وادیوں نے بم بسپھوٹ کیا ہے نا۔ابھی ایک دو گھنٹا پہلے ہی کی تو بات ہے۔بہتے لوگ مارے گئے ہیں۔ٹرینو کو اڑا دیا ہے۔اسی لئے ایہا بھی سکورٹی لگی ہے۔اندر تو بڑی چیکنگ و یکنگ چل رہی ہے۔ای موہمڈنون چین سے جینے نہیں دیگا سب...' آخری جملہ اس نے ہونٹ دبا کر دھیرے سے ادا کیا تھا۔

چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔کپڑوں کے نیچے، جسم کے سارے رواں یکلخت کھڑے ہو گئے تھے۔قلی اپنی رفتار میں آگے بڑھا جا رہا تھا۔وہ ٹھٹکی کھڑی رہی۔سوچا، قلی کو روکے، نہیں روک سکی۔اس نے بیٹی کے ہاتھ پر

اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی، خودکو متوازن کرنے کی کوشش کرتی دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ بڑی سخت سکیورٹی تھی۔ پولیس کے جوان ہتھیار سنبھالے بالکل مستعد کھڑے تھے۔ پولیس کے کتے ایک ایک شئے سونگھتے پھر رہے تھے۔ جگہ جگہ بالو بھری بوریاں رکھی ہوئی تھیں، ان کے پیچھے بندوق سنبھالے کمانڈو الرٹ کھڑے تھے۔ مین گیٹ پر اتنی سخت چوکسی کہ ایک ایک آدمی مٹل ڈیٹکٹر سے ہوکر گذر رہا تھا۔ پولیس والے مسافروں کے بیگ، سوٹ کیس کھلوا کھلوا کر دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک چیز کی باریکی سے جانچ پڑتال کی جا رہی تھی۔

مٹل ڈیٹکٹر سے ہو کر وہ اندر پہونچی تو ایک سہرن پیدا کر دینے والے سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا، اسٹیشن ہے۔ نہ شور نہ سرابہ... نہ بھاگا بھاگی... ایکدم خاموشی اور خاموشی میں لپٹے رینگتے ہوئے لوگ۔ گاڑیوں کی آمدورفت کا اعلان اور چیتاونی...

'... یاتریوں سے انرودھ ہے کی کسی بھی سندگدھ ویکتی سے ساوُدھان رہیں... اسکی سوچنا ترنت پولیس یا ریلوے کرمچاری کو دیں... یاتریوں سے نویدن ہے کی کسی بھی لاوارث وستو کو ہاتھ نہ لگائیں... کرپیا دھیان دیں، کسی بھی آپات استھتی میں خود کو فوراً سرکچھت استھان پر لے جائیں...'

اس نے محسوس کیا، اس کے سینے کی دھڑکن تیز تیز چلنے لگی ہے۔ اس نے اپنا چشمہ ٹھیک کیا اور خود کو پرسکون کرنے کی سعی کرنے لگی۔ دھیان ہٹانے کی غرض سے اس نے بیٹی سے پوچھا۔ 'بیٹے' نانا کا سویٹر کس والے بیگ میں رکھا ہے...؟'

'بلیک والے میں...' بیٹی نے مختصر سا جواب دیکر بات ہی ختم کر دی۔ لیکن اسے تو کچھ بولتے رہنا تھا۔ یہ سکوت اس کے ذہن و دل پر بڑا اثر انداز ہو رہا تھا۔

'لیکن بیٹے...، نانا کو زیادہ تنگ نہ کرنا... انکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے... ہم لوگ ان سے مل کر دو ایک دنوں میں واپس آ جائیں گے...'

اسکی بیٹی چپ رہی' چلتی رہی۔

'یہ بول کیوں نہیں رہی...؟ ڈری ہوئی تو نہیں ہے...؟

'بیٹے، آپ نے مما کی بات کا جواب نہیں دیا...؟'

'مما، نانا کو دلّی کیوں نہیں لاتے؟ میں ان کے ساتھ گھوڑا گھوڑا کھیلتی...؟'

برجستہ وہ مسکرا پڑی۔ ہونٹوں کی دھاریاں پھیل گئیں۔ 'وہ نہیں آئیں گے بیٹے، انہیں کانپور ہی اچھا لگتا ہے۔'

اسکی ٹرین پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھی۔ قلی رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

'ایس الیون بھیا۔ برتھ نمبر ۲۹۔۲۸...' اس نے قلی کو بتایا۔

ٹرین کے اندر آئی تو یہاں بھی خاموشی۔ لوگ چپّی کی چادر تانے اپنی برتھ تلاش کر اپنا سامان رکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے بیٹی کو برتھ پر بیٹھا دیا۔ پیسے لیکر قلی جا چکا تو وہ بھی اپنا سامان برتھ کے نیچے رکھنے لگی۔ تھیلا اس نے اوپر ہی رکھا کہ اس میں پانی کی بوتل اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ پوری بوگی کا ماحول وہاں چھائی ہوئی خاموشی سے بوجھل ہو رہا تھا۔ گو کہ بوگی میں بہت کم لوگ تھے، آدھی سے زیادہ برتھ خالی تھیں۔ جبکہ عام طور پر اس ٹرین میں کافی ربھیڑ ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بھی کانپور جاتی تھی، اسی ٹرین سے جاتی تھی۔ یہ دیر رات کھلتی تھی اور اہل صبح کانپور پہنچا دیتی تھی۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا، کب چلے، کب پہنچ گئے لیکن آج اتنی کم بھیڑ...؟

سامان اڈجسٹ کر کے وہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ متفکر بھی لگ رہی تھی۔ اس کی برتھ جہاں تھی، وہ پورا کمپارٹمنٹ تو بالکل ہی خالی تھا۔ ۲۹۔۲۸، لوور مڈل برتھ اسکی تھی۔ اس کے اوپر سامنے کی تینوں اور سائیڈ کی دونوں برتھ خالی تھیں۔ ابھی ٹرین چھوٹنے میں دیر بھی تھی۔ ہر کوئی اسکی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ دو گھنٹا پہلے ہی اسٹیشن آ جائے۔ اس نے سا چا تو ہنسی آ گئی۔ سچ، وہ تو ایکدم نمونہ ہے۔ کئی روز پہلے سے تیاری کر رہی ہے پھر بھی پاپا کا ایش ٹرے رہ ہی گیا۔ راجیو سے بول کر جے پور سے منگوایا تھا۔ لے تو آیا تھا، پر اس کا نان اسٹاپ لیکچر بھی سننا پڑا تھا۔ 'ایک طرف تو پاپا کو سگریٹ پینے سے روکتی ہو، دوسری طرف ایش ٹرے لے جا کر دے رہی ہو۔ تمہاری تو بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہونہہ، چھوڑ دی پاپا نے سگریٹ اور تم نے چھوڑوا دی...'

'بات سمجھا کرو راجیو... بولتی ہوں اس لیے کہ ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ کیسے ہانپتے ہانپتے بے سدھ ہو جاتے ہیں؟ یہ بیماری ہوتی ہی ایسی ہے۔ پر میں یہ بھی تو جانتی ہوں، وہ چھوڑیں گے نہیں اسکو۔ ان کے ساتھ ہی جائیگی۔ اس عمر کی عادتیں کہاں جاتی ہیں...؟'

'بیٹے' آپ کچھ کھاؤ گے؟ چپس نکال لو تھیلا میں سے...' اس نے بیٹی سے کہا۔

اس کا موبائل بجا۔ راجیو تھا۔ چلتی گیا ہے آفس کے کام سے۔

'ہاں راجیو، ٹرین میں بیٹھ گئی ہوں۔ اب چلیگی ہی۔ ہاں ہاں، اسٹیشن آئی تب پتہ چلا ممبئی کے بارے میں۔ یہاں بھی بہت سخت سکیورٹی ہے۔ ارے نہیں، چلی جاؤں گی۔ اب تو بیٹھ چکی ہوں۔ ڈونٹ وری... ہاں ہاں، بیٹی ٹھیک ہے... نہیں، ڈری نہیں ہے... لو بات کرلو...' اس نے فون بیٹی کی طرف بڑھایا۔ 'بیٹے پاپا سے بات کرو...'

'ہلو پاپا... جی، چپس کھا رہی ہوں... آپ نے کھانا کھایا... جی میں ٹھیک ہوں... آپ کب لوٹیں گے پاپا؟ مما بتا رہی تھی کہ نانا سے مل کر ہملوگ بھی دو دن میں دہلی لوٹ جائیں گے... جی پاپا... بائے پاپا...'

ٹرین کھلنے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ سائیڈ والی دونوں برتھ پر مسافر آ گئے تھے۔ اوپر کی برتھ والا تو باضابطہ لمبی تان کر لیٹ چکا تھا۔ نیچے والا نیم دراز کوئی میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

اس نے مڈل والی برتھ کھولی۔ تھیلے سے چادر نکال کر بچھایا اور بیٹی کو لٹا

دیا' بیٹے، سردی لگے تو دوسری والی چادر اوڑھ لینا...چلو، اب تم سو جاؤ...گڈ نائٹ...'
اس نے اپنی برتھ پر بھی چادر بچھالی۔ موبائل میں چھ بجے کا الارم لگایا اور کھسک کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ نومبر کی ہلکی نم ہوا نے اس کے جسم کو چھوا تو اس کے اندر کنکنی گدگدی بھر گئی اور قدرے تازگی محسوس کرنے لگی وہ۔ باہر پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پولس کے مسلح جوان بھی گشت لگا رہے تھے۔
'نہ جانے ممبئی کی کیا خبر ہے...؟' اس نے سوچا، پاپا کو فون کر دینا چاہیے۔ فکر مند ہوں گے وہ۔' اس نے پاپا کو فون ملایا۔' جی پاپا... میں بول رہی ہوں...جی، ٹرین میں ہوں...ٹھیک ہوں... ہاں ہاں...وہ بھی ٹھیک ہے...سو رہی ہے...آپ فکر نہ کریں...میں صبح پہنچ جاؤں گی...'
گاڑی رینگنے لگی تھی۔
'...گاڑی کھل چکی ہے پاپا...میں صبح پہنچ رہی ہوں...'
فون بند کر اس نے سامنے دیکھا۔ سامنے نیچے والی برتھ کا مسافر بھی آچکا تھا۔ شاید رینگتی ہوئی ٹرین لپک کر اس نے پکڑی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے، ہاتھ میں کچھ وقت لیکر نہیں چلنے سے ایسی ہی بھاگا بھاگی مچتی ہے۔ نا بابا نا...اپنا فنڈا ٹھیک ہے۔ کم سے کم گھنٹا، آدھ گھنٹا پہلے پہنچو۔ بھلے انتظار کرنا پڑے۔ سامنے والے مسافر کی ہانپتی کانپتی کیفیت دیکھ کر اس میں اسکی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ دیکھو تو' بندے کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ کیسا پسینے پسینے ہو رہا ہے؟ کالی جینس اور گرے کلر کا جیکیٹ۔ بے وقوف ہے کیا؟ اتنے ماڈرن ڈریس اپ کے اوپر چادر کیوں لپیٹ رکھی ہے اس نے؟ اور پھر دہلی میں ابھی اتنی سردی کہاں؟ عجیب شخص ہے، چادر سے ہی چہرہ صاف کر رہا ہے؟ گورا چٹا چہرہ... گھنی لمبی ڈاڑھی...
ڈاڑھی...؟
تو مسلمان ہے...؟
چہرہ صاف کرنے کے بعد اس نے اپنی ڈاڑھی چادر کے نیچے کر لی ہے اور چہرے کا زیادہ تر حصّہ چھالیا ہے۔
پر کیوں؟ یہ اپنا چہرہ اور ڈاڑھی کیوں چھپا رہا ہے...؟
'.........؟'
اس نے محسوس کیا، پیروں کے نیچے سے سنسناہٹ جیسی کوئی چیز اوپر اس کے پورے جسم میں بھرنے لگی ہے۔
'یاتریوں سے انرودھ ہے کی کسی بھی سندگدھ وستو سے ساوَدھان رہیں...'
'ای موہمڈ نون چین سے...'
گاڑی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔
اس نے بے چینی سے چشمے کا شیشہ صاف کر دوبارہ آنکھوں پر چڑھایا۔ رفتہ رفتہ اس کے ارد گرد شک کا گھیرا کستا جا رہا تھا۔ کہیں یہ...؟ کہیں کیا...؟ یقینی طور پر...یہ خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیسا اکبکایا ہوا ہے۔ بے چین سا ہر چیز کو دیکھ رہا ہے...
اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ محسوس ہوا، اندر سے کوئی شئے اوپر آ کر حلق کے پاس پھنس گئی ہے جس سے اسکی سانسوں میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ کھڑکی سے نم ہوا آنے کے باوجود اسکی پیشانی گیلی ہونے لگی۔ نظر ترچھی کر، چشمہ کے کنارہ سے وہ اس کے حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگی۔ اسکی ایک ایک جنبش پر دھیان دینے لگی۔
چوکنی نظر سے آس پاس دیکھ رہا ہے وہ۔ ایک ایک چیز کو بھانپ رہا ہے۔ کہیں...اسی ٹرین میں کچھ کرنے کا اس کا ارادہ تو نہیں؟ سائیڈ کی برتھ والے دونوں مسافروں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ دونوں تو جیسے ہر غم سے آزاد نیند کی آغوش میں ہیں۔ انہیں تو کسی انہونی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ گمان ہی نہیں کہ یہاں کیا ہونے والا ہے...؟
کیا کرے وہ...؟ کیا انہیں جگا کر بتائے، بھائی صاحب وہ آدمی.. لیکن تب تک تو وہ...تڑ...تڑ...تڑ...نہ جانے کتنوں کو موت کی نیند سلا دیگا۔ نہیں نہیں، اس وقت کوئی بھی حرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ارے... وہ تو سوئی ہوئی اس کی بیٹی کو دیکھ رہا ہے...ایکدم سے اسکی سانسیں رک گئیں۔ ہائے، میری بچّی..نہیں نہیں، اگر اس نے اسکی بچّی کو کچھ کیا تو وہ اس کا خون پی جائے گی...جان سے مار دیگی اسے...بھلے وہ اسے بھی مار دے...اس کا چہرہ سخت ہو اٹھا تھا لیکن بدن کے سارے رواں بھی کھڑے تھے۔ گھبراہٹ ایسی کہ اپنی جگہ پر شل ہو گئی تھی جیسے۔
اس نے اپنا ہاتھ چادر کے اندر کر لیا ہے۔ ضرور...ضرور چادر کے اندر کچھ چھپا رکھا ہے اس نے؟ اے کے ۴۷ یا کوئی اور مہلک ہتھیار؟ لیکن اتنی سکیورٹی کے ہوتے...؟ ضرور پولیس والوں کو چکما دیکر اندر آیا ہوگا؟ ارے ہاں، یاد آیا۔ ٹرین کھل گئی تھی، جب تو دوڑ کر چڑھا تھا وہ۔ جب پولیس کے کھوجی کتّے بوگی کا چپّہ چپّہ سونگھ کر چلے گئے تھے۔
گاڑی کسی کراسنگ سے گذر رہی تھی۔ کھٹر پٹر کی تیز آواز کے ساتھ دائیں بائیں زور کے جھٹکے کھانے لگی تھی۔ اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ لیکن وہ...وہ تو ایکدم چست درست بیٹھا ہوا تھا۔ کیا غضب کی ٹریننگ ہوتی ہے ان کی۔ جسم میں بجلی بھری ہوتی ہے جیسے۔ جبھی تو پلک جھپکتے ہی قیامت ڈھا دیتے ہیں...
ارے، ارے، اٹھکر کہاں جا رہا ہے وہ؟ ضرور بوگی کا معائنہ کرنے گیا ہوگا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھسک کر برتھ کے کنارے آئی، گردن باہر نکال کر جھانکا۔ ٹائلٹ کے اندر گھسا ہے۔ وہ جھانکتی رہی۔ بوگی کے اندر تقریباً سارے لوگ سو چکے تھے یا پھر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ خوفناک لگنے جیسی خاموشی مسلّط تھی۔ ایسی حالت میں تو وہ آرام سے ایک ایک کو مار دیگا۔ کوئی نہیں بچ پائیگا۔ خوف اور خدشہ سے وہ لرز اٹھی۔ کھسک کر سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔ بیٹی گہری

نیند میں تھی۔ اسکی اپنی نیند تو کافور ہو چکی تھی۔ سامنے موت ہو تو نیند بھلا کسے آئیگی؟ جانے کب کیا ہو جائے؟ وہ ابھی تک لوٹا نہیں؟ اتنی دیر تک ٹائلٹ میں کیا کر رہا ہے؟ کہیں ٹائلٹ میں ہی بم تو نہیں پلانٹ کر رہا ہے؟ اور اتنی دیر کیا کریگا ٹائلٹ میں؟ سہمی سہمی پھر کنارے پر آ کر جھانکنے لگی۔ گیٹ کے پاس کھڑا موبائل سے باتیں کر رہا ہے۔ ضرور... اپنے آقاؤں سے بات کر رہا ہوگا؟ سارے حالات سے واقف کرا رہا ہوگا؟ اسے ہدایت دی جا رہی ہوگی؟ کیسے کرنا ہے؟ کب کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے...؟ سب کچھ اسے بتایا جا رہا ہوگا۔ جہاد کا گھونٹ پلا یا جا رہا ہوگا۔ جنّت میں گھر بنانے کا خواب دکھایا جا رہا ہوگا۔ وہ جلدی جلدی اپنی گردن ہلا رہا ہے۔ آقاؤں کے ایک ایک حکم پر لبیک کہہ رہا ہے۔

یا پھر وہ اپنے کسی ساتھی سے بات کر رہا ہوگا۔ وہ اکیلا تو نہیں ہی ہوگا؟ اور بھی ساتھی ہوں گے اسکے۔ شاید ابھی اسی ٹرین میں ہوں۔ الگ الگ بوگی میں۔ سب ایک دوسرے کے کانٹکٹ میں ہیں۔ کب، کیسے، کیا کرنا ہے۔ منصوبے کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔

آ رہا ہے... آ رہا ہے... وہ جلدی سے اپنی جگہ پر آ گئی۔ آنکھیں بند کر لیں، جیسے سونے کی کوشش کر رہی ہو۔ ذرا سی آنکھیں وا کر، چشمہ کے پیچھے سے دیکھنے لگی۔ اپنی برتھ پر بیٹھ گیا ہے۔ بیگ سرہانے رکھ لیٹ گیا ہے۔ ارے، اس نے اس کے بیگ کی طرف تو دھیان ہی نہیں دیا۔ ضرور اسی بیگ میں تباہی کا سارا سامان ہے۔ ورنہ اتنے جتن سے سرہانے نہیں رکھتا۔ برتھ کے نیچے ڈال دیتا۔

ٹی ٹی ای آیا تھا۔ ٹکٹ مانگ رہا تھا۔ بھائی صاحب وہ آدمی... وہ ٹی ٹی ای کو بتانا چاہتی تھی، پر منہہ سے لفظ باہر نہیں نکل پائے۔ وہ لیٹا ہوا ہے، پر اس کا ہاتھ تو اس کے بیگ پر ہی ہے۔ سہم گئی وہ۔ کچھ بولنے کا مطلب تھا، فوراً دھڑام.. دھڑم.. لاشیں... خون... چیتھڑے...

'ہاں بھئی.. ٹکٹ..' ٹی ٹی ای اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا ٹکٹ دکھایا ہے۔ کوشش کر رہا ہے، چہرہ سامنے نہ آئے۔ آنکھیں اور ناک دکھائی دے رہی ہے

'آپکی برتھ ٹونٹی سکس ہے... مڈل والی..' اس کا ٹکٹ دیکھکر ٹی ٹی ای آگے بڑھ گیا تھا۔

...تو اسکی وہ برتھ نہیں ہے۔ دوسرے کی برتھ پر جما ہوا ہے۔ خالی پا کر بیٹھ گیا ہے۔ نہیں نہیں، یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔

وہ جان سمجھ کر اپنی برتھ پر نہیں بیٹھا ہے۔ تاکہ واردات کرنے کے بعد اسکی سبھی نشان دہی نہ ہو سکے، اسکی شناخت نہ ہو سکے۔ اس کے بارے میں سبھی سبھی کچھ پتہ نہ چل سکے۔ ٹی ٹی ای بغل کے کمپارٹمینٹ میں ٹکٹ دیکھ رہا ہے۔ وہ پیچھے سے جا کر ٹی ٹی ای کو بتا دینا چاہتی تھی۔ ٹائلٹ... ہاں ٹائلٹ کا بہانا ٹھیک رہیگا۔ وہ اٹھی، من ہی من کچھ پڑھتی آگے بڑھی۔ ٹی ٹی ای کے پاس پہنچ، مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کلیجہ دھک سے کر کے رہ گیا۔ غضب کا عیّار ہے وہ۔ برتھ کے کنارے سے جھانک رہا ہے۔ بس یونہی ٹائلٹ کی طرف گئی، لوٹ آئی الٹے پیر۔ بیٹھی تو اس طرح جیسے جسم کی ساری طاقت نچوڑ لی گئی ہو۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ علی گڑھ ہوگا۔

علی گڑھ ہی تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی تھی۔ پیٹھا والے، چائے والے آواز لگا رہے تھے۔ وہ اپنی شیشہ لگی کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے۔ اس کا موبائل بجا ہے۔ وہ ایکدم سے چونک گیا ہے۔ جیب سے فون نکال کر نمبر دیکھتا ہے۔ اٹھکر کمپارٹمینٹ کی دوسری جانب چلا جاتا ہے۔ ضرور اسے اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی جگہ اڑا دینا ہے، ٹرین کو اور اسٹیشن کو بھی۔ اے بھیّا سنو... ایکدم بوکھلا کر پلیٹ فارم پر کسی کو پکار اٹھی۔ مزید کچھ کہتی، وہ برتھ پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اسکی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ سہم کر وہ کھڑکی سے چپک گئی۔

گاڑی کھل چکی تھی دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف، اسکی دہشت بھی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے لائٹ آف کر دی ہے۔ کمپارٹمینٹ میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ لیکن... اس نے لائٹ کیوں آف کر دی؟ اندھیرا کیوں کر دیا؟ کیا وہ تاریکی کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ بیگ کی زپ کھلنے کی آواز آئی ہے۔ اندھیرے میں بیگ کیوں کھول رہا ہے؟ کیا ہتھیار نکال رہا ہے؟ یا بم میں ٹائمر لگا رہا ہے؟ وہ آنکھیں پھیلا کر دیکھنے لگی۔ چشمہ کے باوجود کچھ صاف نہیں دکھ رہا۔ نہ جانے کیا کر رہا ہے وہ؟ نہ جانے کیا کرنے والا ہے؟ ضرور فدائین ہے۔ لگتا ہے، خود کے ساتھ ہی ٹرین کو بھی اڑا دیگا۔ تب تو... وہ اور اسکی بچّی... ان کے تو چیتھڑے بھی نہیں ملیں گے۔ ادھر راجیو سوچے گا، ہم لوگ پاپا کے پاس گئے ہیں... ادھر پاپا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے اور ہم لوگ... ہم لوگ... نہیں نہیں... بوگی کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔ انہیں تو پتہ بھی نہیں چلے گا، اور وہ کال کے گال میں چلے جائیں گے۔ لیکن... لیکن... اسکی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں۔ وہ تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ سامنے... اپنے سامنے... موت کو دیکھ رہی تھی۔ موت کو دیکھتے ہوئے مرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، اس کرب سے بڑی شدت سے گذر رہی تھی وہ۔ لیکن کیا وہ ایسے ہی مر جائے گی؟ مرنے سے پہلے، زندہ رہنے کے لیے، آخری کوشش سمجھ کر، کیا وہ کچھ نہیں کر سکتی؟ کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ اس پر جھپٹ پڑ سکتی ہے۔ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔ دبوچ کر شور مچا سکتی ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے نوچ سکتی ہے۔ اپنے ناخنوں سے اسکی آنکھیں پھوڑ سکتی ہے۔ ہاں ہاں، اسے اپنے آپ کو، اپنی بیٹی کو بچانا ہوگا۔ ورنہ راجیو کا تو سب کچھ ہی اجڑ جائے گا۔ اس کا تو ہم دونوں کے سوا کوئی ہے بھی نہیں۔ باپ رے، مجھ سے شادی کرنے کے لیے کون سی مصیبت نہیں جھیلی ہے اس نے۔ اس کے پریوار کا کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب ناراض تھے۔ سب کی مخالفت سہہ کر اس نے مجھ سے شادی کی تھی۔ سب کے طعنے برداشت کر اس نے مجھے اپنایا تھا۔ میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے اس نے۔ کتنا پیار کرتا ہے وہ ہم سے۔ وہ تو جیتے جی مر جائے گا۔ اور... اس عمر میں پاپا تو ایکدم بے سہارا ہو جائیں گے۔ وقت بے وقت کون دیکھے گا ان کو؟ دور ہے، پر ماہ دو ماہ

باقی صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ کیجیے

اللہ کا وعدہ

شائستہ عالم
(امریکہ)

میں گاڑی میں بیٹھی مستقل بڑبڑا رہی تھی۔ جھنجلاہٹ میں جو منہ میں آئے بول رہی تھی۔ میرا بھائی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا خاموشی سے سن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسئلہ کیا ہے مجھ میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ ساری زندگی میں نے ہزراوں باتیں برداشت کی ہیں اب بھی کر رہی ہوں۔ مگر آج غصہ آ ہی گیا تھا۔ میرے غصے اور جھنجلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ڈیڑھ مہینے کے قیام کے بعد کل میری فلائیٹ تھی۔ عموماً ہر شخص یہ چاہتا ہے ایک دن پہلے سارا کام اور پیکنگ ہو جائے اور آخری دن گھر میں سکون سے گذار لیا جائے۔ میں یہ دن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گذارنا چاہتی تھی۔ آج میرا ان سے یہ وعدہ تھا کہ ہم کہیں باہر جا کر کھانا کھائینگے۔ وہ پورے وقت میرا خیال رکھتے ہیں آج انکا دن ہوتا ہے کہ میں انکو کہیں لے جاؤں اور ہم سب مل کر اچھا وقت اکھٹے گذار لیں۔

مگر بدقسمتی سے آج بھی میرا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ پاکستان میں جھوٹ، بے ایمانی، اور وعدہ خلافی کا دور دورہ ہے۔ ہر شخص جھوٹ بول کر اور جھوٹے وعدے کر کے کام کو ٹالتا ہے۔ کسی کو کسی کی تکلیف کا کائی احساس نہیں۔ من حیث القوم ہم ایک بے حس ترین قوم بن چکے ہیں۔ پاکستان میں قیام کے دوران میں نے ایک باریش دکان دار کو یہ کہتے سنا کہ وہ رمضان میں روزہ اس لئے نہیں رکھتے کہ روزے میں جھوٹ نہیں بولا جا سکتا اور اس سے روزہ ضائع ہو جاتا ہے۔ انکے خیال میں کاروبار کے لئے دروغ گوئی سے کام لینا بہت ضروری ہے۔ اسکے بغیر کاربار ہو ہی نہیں سکتا۔

جس قوم کا ذہن یہ بن چکا ہو کہ بے ایمانی اور غلط بیانی سے کام لئے بغیر زندگی میں کامیابی نہیں مل سکتی اس قوم کی فلاح کیسے ممکن ہے۔ حکمرانوں کے گریبانوں اور ایوانوں میں جھانکنے سے پہلے ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ اور سرکاری افسروں کے دفتروں کا گھیراؤ کرنے سے قبل ہمیں اپنی ذات کا محاسبہ کرنا ہوگا اور آسمانوں کی دھول صاف کرنے کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے جبکہ ہم خود کچرے کے ایک ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک عام پاکستانی، ایک عام پاکستانی کو جس قدر بھی تکلیف دے سکتا ہے اسکا مظاہرہ پاکستان میں بارہا دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہم خواتین جب بھی وطن عزیز جاتے ہیں تو عزیز و اقارب سے ملنے کے علاوہ خریداری بھی ہمارے اس دورے کا بڑا حصہ ہوتی ہے۔ باقی شوپنگ تو ہو ہی جاتی ہے۔ مسئلہ درزیوں کا زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر کپڑے تو آج کل بوتیک سے مل جاتے ہیں اسطرح نہ صرف وقت بچتا ہے بلکہ بہت بڑی دردسری سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ مگر کچھ کپڑے سلوانے کے لئے درزیوں کے نخرے اور جھوٹے وعدے برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ایک دفعہ کپڑا ڈالنے کے بعد بار بار چکر لگانے پڑتے ہیں۔ کبھی کپڑے وقت پر تیار نہیں ہوتے۔ کبھی خراب سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کپڑوں کو بار بار واپس لے جانا پڑتا ہے۔ اور یہ چکر آخری دن تک چلتا رہتا ہے۔ آج بھی وہی معاملہ تھا۔ عموماً ایسی صورت حال کا میں پرسکون طریقے سے سامنا کر لیتی ہوں۔ مگر آج کچھ غصہ آ ہی گیا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور بہت گرمی بھی تھی۔ میں ایسا بہت کچھ بول رہی تھی جو شاید نہیں بولنا چاہئے تھا۔

میں کہہ رہی تھی ''پاکستان تو رہنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔ یہاں رہنے والے بڑے بدنصیب ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا پنجرہ ہے جہاں لوگ جانوروں کی طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ نکلنا چاہتے ہیں مگر نکل نہیں سکتے۔ اور یہ حالات خود لوگوں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے ہیں۔ یہاں کے لوگ خراب ہیں اور اللہ ان سے ناخوش ہے اور میں بہت خوش نصیب ہوں کہ میں امریکا میں رہ رہی ہوں'' میں با آواز بلند یہ باتیں کر رہی تھی۔ عام طور سے گھر سے نکلتے ہوئے یا دن کے آغاز میں میں کافی دعائیں پڑھ کر خود کو اور اپنی فیملی کو اللہ کی حفاظت میں دیتی ہوں۔ اس دن شیطان نے ایسا غصے کی حالت میں دماغ پر قبضہ کیا کہ دعائیں پڑھنا ہی بھول گئی۔ اور ایسی باتیں منہ سے نکالتی رہی جو کہ نازیبا تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچتی رہی کہ میں جو اول فول بک رہی ہوں اللہ کو یہ باتیں پسند نہیں آئینگی۔ بار بار اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ آج میرے ساتھ کچھ ایسا غلط ضرور ہونا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔

طارق روڈ پہنچ کر میں پہلے ٹیلر کے یہاں گئی۔ حسب معمول اس نے اپنی کچھ خود ساختہ مجبوریاں گنوا کر دو گھنٹے کا ٹائم اور لے لیا۔ مجھے جیولر کے یہاں بھی جانا تھا۔ اس سے پچھلے سال ایک سونے کی چین لی تھی جسکی مالیت اب تین لاکھ تھی اس میں کچھ مسئلہ تھا جسے ٹھیک کرانا تھا۔ جیولر نے کہا تھا کہ لے آئیں وہ ہاتھ کے ہاتھ ٹھیک کر دیگا۔ واقعئی کام جلدی ہو گیا۔ اب کپڑوں کا مسئلہ رہ گیا تھا مجھے سابقہ تجربات کی وجہ سے اندازہ تھا کہ ٹیلر کے یہاں دو گھنٹے سے زیادہ ہی ٹائم لگے گا۔ مجھے اپنے بھائی کا بھی احساس تھا آج سنیچر کو اسکا آدھا دن فارغ ہوتا ہے۔ گھر آ کر وہ کچھ دیر سو جاتا تھا مگر اس وقت میرے ساتھ تھا۔ شام کو ڈنر پر جانا تھا۔ کھانا کھا لیتے تو شام کو ڈنر پر کیا جاتے۔ ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر جوس وغیرہ پیا پھر طارق روڈ واپس آئے، کپڑے لئے اور واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اب میں کچھ مطمئن تھی۔ گھر روانہ ہونے سے پہلے دعائیں بھی پڑھ لیں مگر دل کہہ رہا تھا ''دیر ہو گئی ہے'' سارے راستے سب ٹھیک رہا، گھر قریب آ گیا۔ یہ ایک اپارٹ مینٹ بلڈنگ تھی جسکے اندر پارکنگ لاٹ تھا۔ لیکن بھائی نے اچانک گیٹ سے ذرا پہلے گاڑی روک لی۔ میں نے تھوڑا سا حیران ہو کر اسکی طرف دیکھا، کہ پوچھوں ''اندر کیوں نہیں جا رہے؟'' دوسرے ہی لمحے میری نظر ایک پستول پر پڑی جسکی پتلی سی نال تقریباً میرے بھائی کے سر پر تھی۔ ایک تئیس چوبیس سال کا دبلا، لمبا سا لڑکا جو سینے سے

اوپر نظر ہی نہیں آرہا تھا، پستول اسکے ہاتھ میں تھی۔ چند لمحے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا ''کیا کوئی مزاق کر رہا ہے، کیا کوئی نقلی پستول سے ہمیں ڈرا رہا ہے؟'' مگر کچھ ہی لمحات میں سمجھ میں آ گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ دراصل میرے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو مملکت خداداد پاکستان کے اس روشنیوں کے شہر کراچی میں تقریباً سب کے ساتھ ہو چکا ہے اور سینکڑوں لوگ اس صورتحال میں اپنی جان تک گنوا چکے ہیں۔

بھائی بالکل ساکت بیٹھا تھا، وہ ڈرا ہوا تھا اور شاید سوچ رہا تھا کہ اب میرا ردعمل کیا ہوگا۔ ان لوگوں کے ساتھ تو ایسے واقعات بار ہا ہو چکے تھے۔ میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے حواس بجا تھے۔ ڈری ہوئی تو تھی مگر یہ آگہی ضرور تھی کہ اس وقت مزاحمت کرنا یا شور مچانا خطرناک اور بے سود ہے۔ اس قسم کے حالات میں حملہ آور ہم سے زیادہ ڈرے ہوئے ہوتے ہیں، مزاحمت کی صورت میں گھبرا کر وہ کوئی بھی ایسا انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں جس کا مداوا نہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان، ہمارا پیارا وطن، بدقسمتی سے اس وقت اپنے تاریک ترین دور سے گذر رہا ہے۔ یہاں جنگل کا راج ہے۔ لوگ اپنے پیاروں کی لاشیں سڑکوں پر سے اٹھا کر لیجاتے ہیں اور بغیر کوئی ایف آئی آر کٹوائے انہیں صبر سے دفنا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں قانون نام کی کوئی چیز رہ ہی نہیں گئی ہے۔ نہ چور پکڑے جاتے ہیں، نہ ڈاکو، نہ قاتل۔ پولس خود ان جرائم پیشہ افراد کی پشت پناہی کرتی ہے۔ بعض دفعہ وہ ان گروہوں کے ساتھ ہوتی ہے اور بعض دفعہ انکے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ڈرتی ہے۔ ان جرائم پیشہ افراد کی فہرست لمبی ہے۔ بڑی بڑی ایجنسیاں، پولیٹیکل پارٹیز اور خود حکومتیں انکے ساتھ شامل ہوتی ہیں۔ چند ہزار کمانے والے ان قانون کے رکھوالوں کی مجال نہیں کہ وہ معمولی چوروں، ڈاکوؤں، بھتہ خوروں اور اغوا کنندگان کے پیچھے چھپے ان بڑے بڑے جید افراد کے اوپر ہاتھ ڈال سکیں۔ اگر وہ گرفتاریاں کر بھی لیں تو دوسرے ہی دن ''با اثر'' افراد کی سفارشوں سے یہ گرفتاریاں ''بے اثر'' ہو جاتی ہیں۔ دوسری صورت میں قانون کو مزاق بنانے والے لوگوں کے ہاتھوں قانون کے ان نام کے رکھوالوں کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تو زندگی کسے پیاری نہیں، ان پولس والوں کے بھی گھر ہیں، بیوی بچے ہیں۔ ایک چپ ہزار بلائیں ٹالتی ہے کے مصداق وہ بھی خاموش تماشائی ہیں۔ یہاں سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ خدا اور رسول کو گواہ بنا کر حلفیہ بیان دینے والے ہمارے ''خود ساختہ'' اور ''خود چنندہ'' لیڈر حضرات جو بظاہر عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لئے حکومتوں میں آتے ہیں، جب خود ہی رعایہ کی جان و مال سے کھیلنے لگیں تو لوگ آخر دادرسی کے لئے کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں

روز روشن کی طرح عیاں اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بھی وہی سب کچھ کیا جو ہر عقلمند انسان کرتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ جو کچھ بھی تھا اپنے ان کرم فرماؤں کے حوالے کر دیا۔ کچھ جسم پر سونا تھا، کچھ ڈالرز تھے ایک وہ سونے کی چین تھی جسکی مالیت تین لاکھ تھی۔ کل ملا کر تقریباً پانچ ساڑھے پانچ لاکھ کا سامان تھا۔ سب کچھ لے کر وہ فرار ہو گئے۔

میں گھر آئی تو حالات جاننے کے بعد میری بھابی نے کہا تم اتنا صدقہ خیرات کرتی ہو میں نے تمہیں ہمیشہ دیتے ہوئے ہی دیکھا، تمہارے ساتھ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ خیر جان کا صدقہ گیا۔ ایسا ہی سوچ لیا گیا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا تھا۔ دوسرے دن ہی میں امریکا واپس آ گئی۔ کچھ عرصے بعد (شوہر نامدار) پاکستان روانہ ہوئے۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ کچھ سیونگ بانڈز بھی لے گئے تھے جو انہوں نے سالوں پہلے خریدے تھے، جنکی مالیت ایک لاکھ روپے تھی۔ کئی سال تک اسکا منافع ملتا رہا پھر جگہیں اور پتے بدلنے کی وجہ سے منافع آنا بند ہو گیا۔ اب اس دفعہ جب وہ قومی بچت کے دفتر گئے تو انہیں بتایا گیا کہ کیونکہ بہت عرصہ ہو گیا ہے اسلئے انکا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ کچھ اور دفاتر سے بھی معلومات کی گئیں مگر سب نے یہی بتایا کہ اب انکی کوئی قیمت نہیں اور یہ بیکار کاغذ کے ٹکڑے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ان بانڈز کو وہیں پھاڑ کر پھینکنے والے تھے مگر انکے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرو۔ یہ انہیں وہیں ایک دراز میں ڈال کر اپنے آبائی شہر چلے گئے۔ ایک شام انکے بہنوئی انکو ایک دعوت میں لے جا رہے تھے کہ انکا فون بجا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اپنے دوست کو بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ کوئی وزیر کھوجہ صاحب تھے جو کبھی ان دونوں کے اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ آج کل وہ نیشنل انوسٹمنٹ کے چیرمین تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تذکرتاً اپنا مسئلہ انہیں بتایا، انہوں نے کہا یہ تو کوئی بات ہی نہیں، تم کراچی پہنچو، کراچی ڈسٹرکٹ کا منیجر خود گھر آ کر تم سے ملے گا اور سارا حساب کر کے تمہیں چیک دے دیگا۔

دوسرے دن منیجر واقعئی بیگ اور کھاتے اٹھائے گھر آ گیا اور اس نے بتایا کہ اس نے کمپیوٹر سے سارا حساب نکال لیا ہے اور اب ایک لاکھ روپے کے بانڈز ساڑھے پانچ لاکھ کے ہو گئے ہیں۔ پھر کھڑے کھڑے ساڑھے پانچ لاکھ کا واؤچر ڈاکٹر صاحب کے حوالے کیا۔ انہوں نے جب امریکا واپس آ کر یہ قصہ مجھے سنایا تو مجھے یقین آ گیا کہ خدا نے اپنے بندوں سے جو وعدے کئے ہیں وہ کبھی جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ نہ صرف یہ کہ اس نے ہماری جانوں کو محفوظ رکھا بلکہ جو کچھ بھی ہم کھو چکے تھے وہ ہمیں واپس مل گیا۔ زکات خیرات صدقات کرنے والوں کو اللہ نے ستر گنا زیادہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہمارے گھر سے الحمدوللہ پوری زکات نکلتی ہے اور صدقہ و خیرات بھی ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ صدقہ رد بلا ہے۔ صدقہ اور خیرات اللہ کے غصہ کو سرد کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''اے ابن آدم تو (بھلائی میں) خرچ کر میں تجھ پر خرچ کرونگا'' اور ''بے شک صدقہ خیرات اور زکات دینے والے مردوں اور عورتوں کے لئے جنہوں نے اللہ کو اچھا قرض دیا انکے لئے دگنا اجر اور بہترین بدلہ ہے''

میری نظر میں دنیا میں آنے کا مقصد انسان کی انسان سے بھلائی ہے۔ ''ورنہ اطاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں'' ہمیں صرف خدا کے بندوں کو راضی رکھنا ہے۔ خدا ہم سے خود ہی راضی ہو جائیگا۔۔۔۔!!!

''ایک گنبد کی صدا''

اختر شاہ جہاں پوری

(بھارت)

میں اگر تم سے خفا ہو جاؤں
برگ بردوشِ ہوا ہو جاؤں

لوگ جب چاہیں گے سُن لیں گے مجھے
ایک گنبد کی صدا ہو جاؤں

اُنگلیاں پھر نہ اُٹھیں گی مجھ پر
کسی مفلس کی قبا ہو جاؤں

جن چراغوں میں لہو جلتا ہے
اُن چراغوں کی ضیا ہو جاؤں

اپنی پوشاک بدل کر میں بھی
پیڑ کی طرح نیا ہو جاؤں

اے زمانے تجھے حاصل کرلوں
پیکرِ جرم و خطا ہو جاؤں

پَر نکل آئیں نہ جب تک اخترؔ
کیا کروں گا جو رہا ہوں جاؤں

❍

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

ایسے کہیں نہ دیکھے تھے آثار سامنے
راہِ وفا میں آ گئی دیوار سامنے

شاید چمن میں موسم گل کا ظہور ہوا
بدلی ہوئی ہے وقت کی رفتار سامنے

کوئی تو آئے چارۂ زخمِ جگر کرے
کہنے کو یوں بہت سے ہیں غمخوار سامنے

آیا تھا کون رکھ گیا گلدستہ میز پر
مرنے کے اب قریب ہے بیمار سامنے

فرماں روا کے روبرو بولا نہ جا سکا
کوئی تو ہو جو کر سکے اظہار سامنے

دیکھا یہی کہ برف پگھلنے کی دیر تھی
سر سبز ہو چکا ہے جو گلزار سامنے

کیا کیا نہ خواب ہم کو دکھائے گئے حسنؔ
دیکھے کوئی تو دیدۂ بیدار سامنے

❍

مظفرحنفی

(دہلی، بھارت)

جب شیش محل بہرِ اقامت نظر آیا
ہر ہاتھ میں اِک سنگ ملامت نظر آیا

بستی میں ہمیں یومِ قیامت نظر آیا
جو شخص بھی تھا غم کی علامت نظر آیا

اس راہ کے کانٹے مرے کچھ کام نہ آئے
ہر آبلہ پیروں کا سلامت نظر آیا

یہ سر نہ جھکانے کی سزا مجھ کو ملی ہے
کاندھے پہ مرے بار امامت نظر آیا

جس چہرے کو دیکھا وہی دیکھا ہوا چہرہ
جو شہر ملا شہر قدامت نظر آیا

شاعر کے لبادے میں چھپا تھا ظفؔر اقبال
نقاد کے پردے میں کرامتؔ نظر آیا

ہم نے ابھی مقطع نہ سنایا تھا مظفؔر
پلکوں پہ اُدھر اشکِ ندامت نظر آیا

○

صدیق شاہد

(شیخوپورہ)

بے تابیٔ دل جاں کو سنبھلنے نہیں دیتی
موسم تری یادوں کا بدلنے نہیں دیتی

غربت میں بھی سو کام سنورتے ہیں جو دیکھیں
پر حبّ وطن گھر سے نکلنے نہیں دیتی!

وہ رنگ ہے، خوشبو ہے، عبث اس کی تمنا
یہ سوچ مرے دل کو مچلنے نہیں دیتی

بیگانگی ایسی ہے کہ اِک پل بھی نہیں رکیے
زنجیرِ وفا ایسی کہ چلنے نہیں دیتی!

کیوں ترکِ تعلق پہ دل آمادہ ہوا ہے
غیرت ہے کہ یہ راز اگلنے نہیں دیتی

سوچا ہے کئی بار کہ اُس کوچے سے نکلیں
ناچاریٔ دل ہے کہ نکلنے نہیں دیتی

ہے یوں بھی بہت گرم ترے قہر کا سورج
کچھ میری تواضع اسے ڈھلنے نہیں دیتی

خوشیوں کا کوئی لمحہ چرالیں بھی تو شاہدؔ
کچھ ایسی متانت ہے، پنپنے نہیں دیتی

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

۔ غزل نما ۔

زمین ہے نہ کوئی آسماں، کہاں ہوں میں
نہ کوئی نام نہ کوئی نشاں، کہاں ہوں میں

نہ فکر سود و زیاں ہے، نہ کچھ عیاں و نہاں
یہ خواب ہے کہ ہے وہم و گماں کہاں ہوں میں

دل و نظر کے ہیں قصّے نہ ذکر ہجر و وصال
نہ درد کی ہے کوئی داستاں ، کہاں ہوں میں

یہ کس کے گھر میں مجھے لے کے آ گیا ہے جنوں
مکیں سے پوچھ رہا ہے مکاں، کہاں ہوں میں

میں صحرا گرد بھٹک کر کدھر نکل آیا
نہ شاخِ گل نہ کوئی آشیاں کہاں ہوں میں

خرد تو کیا ہے ، جنوں بھی بتا سکا نہ مجھے
نظر میں،دل میں کہ جاں میں کہاں،کہاں ہوں میں

میں خود کو ڈھونڈوں کہ تیری تلاش میں نکلوں
مجھے بتا ہے خودی تو کہاں، کہاں ہوں میں

کبھی کبھی مری وحشت بھی چیخ اٹھتی ہے،
یہ آدمی ہے کہ آتش فشاں ، کہاں ہوں میں

کہاں ہوں، مجھ کو یہ احساس ہو چلا ہے مگر
نہ جانے کیوں نہیں کھلتی زباں، کہاں ہوں میں

تُو میرے شعر کے دل میں تلاش کر مجھ کو
نہ پوچھ مجھ سے مرے مہرباں، کہاں ہوں میں

میں اک زمانے سے اپنی تلاش میں ہوں خیالؔ
تجھے خبر ہے مرے رازداں، کہاں ہوں میں

پریمی رومانی
(پونے، بھارت)

دیکھ کر تجھ کو نہ جانے کیوں اِدھر
کھُل رہے ہیں خود بخود دیوار و در

یا رقم کر پانیوں پر دِل کی بات
یا سُلگتی ریت پر آ کر بکھر

زندگی کا یہ حسیں منظر تو دیکھ
دو پرندے ہم سُخن ہیں شاخ پر

برف راتوں کا اثاثہ کون ہے؟
چلچلاتی دھوپ میں گھوما نہ کر

یا خطا کو اپنی مٹھی میں سمیٹ!
یا ندی بن کر سمندر میں اُتر

فائدہ خالی گرجنے سے ہے کیا
چپکے سے اے ابرِ آوارہ گُزر

○

کوثر صدیقی
(بھوپال، بھارت)

رات یوں بھی تو گذر جاتی ہے اکثر بیٹا
باندھ لے پیٹ سے کس کے کوئی پتھر بیٹا

رات جب تک نہ کٹے دھوپ نہ نکلے جب تک
بیٹھ جا پاس مرے گھاس جلا کر بیٹا

کھڑکیاں ٹوٹ کے رہگیروں پہ گر پڑتی ہیں
چل ذرا اونچے مکانات سے بچ کر بیٹا

شہر کے دشت میں شبنم کو بھی دریا ہی سمجھ
سب کی قسمت میں کہاں لکھے سمندر بیٹا

کچھ نہ کچھ بول کہ چپ رہنا بھی ضروری ہے
بیٹھ مت قفل کو ہونٹوں پہ لگا کر بیٹا

کون بے رحم ہے جو کاٹ کے سر سے سایہ
رکھ گیا جلتی ہوئی دھوپ کی چادر بیٹا

جاری رکھتا ہے تھپیڑوں میں محبت کا سفر
جوار بھاٹا تو اُتر جائے گا کوثرؔ بیٹا

❍

غالب عرفان
(کراچی)

اٹھے تو آگ جو گزرے دھواں دھواں گزرے
ہم اپنے وقت سے بھی تیز رو جہاں گزرے

ہماری فکر پہ آیا کبھی جو وقتِ عمل
طلسم ٹوٹا عقیدے بہت گراں گزرے

کبھی حیات کبھی مرگِ ناگہاں کے طفیل!
نہ پوچھو اہلِ جنوں کس کے درمیاں گزرے

ہماری سمتِ سفر کا نشان بھی نہ دیا
ہوا کی لہر پہ رقصاں جو بادباں گزرے

ہم اُس کے ساتھ چلیں تو بھی کیا نہیں ممکن؟
کہ زندگی کا سفر ایک امتحاں گزرے

عمل سے علم کو مربوط ہونے دو تو پھر
شعورِ و فکر میں عرفاںؔ کا جہاں گزرے

❍

ڈاکٹر رؤف خیر

(حیدرآباد، دکن)

اگر انار میں وہ روشنی نہیں بھرتا
تو خاکسار دمِ آگہی نہیں بھرتا

یہ بھوک پیاس بہ ہر حال مٹ ہی جاتی ہے
مگر ہے چیز تُو ایسی کہ جی نہیں بھرتا

تو اپنے آپ میں مانا کہ ایک دریا ہے
مرا وجود بھی کوزہ سہی، نہیں بھرتا

یہ لین دین کی اپنی حدیں بھی ہوتی ہیں
کہ پیٹ بھرتا ہے جھولی کوئی نہیں بھرتا

ہمارا کوئی نعم البدل نہیں ہو گا
ہماری خالی جگہ کوئی بھی نہیں بھرتا

معاف کرنا یہ خاکہ کہاں اُبھر پاتا
اگر یہ دستِ ہنر رنگ ہی نہیں بھرتا

کہاں یہ خیؔر کہاں ہار جیت کا خدشہ
کہ جسم و جان کی بازی سے جی نہیں بھرتا

❍

جاوید زیدی

(یو۔ایس۔اے)

مری کہانی ، تیرا فسانہ
کب تک آخر سُنے زمانہ

اور بھی قصّے رنگیں ہوں گے
یارو مجھ کو بھُول ہی جانا

دشتِ جنوں کی سیرابی کو
جب چاہو یہ لہو بہانا

طبیعت پیالہ بھرتا نہیں کیوں
واعظا مجھ کو یہ سمجھانا

کب تک نہرِ عشق نکالے
ایک ہی مجنوں اِک دیوانہ

شہرِ جنوں کی خاک ہے سرمہ
ہم کو وہ آداب سکھانا

محفلِ یاراں کر گیا سُونی
زیدؔی زندہ دل کو بلانا

❍

عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

پھیلی ہے دُور تک کبھی خود میں سمٹ گئی
کٹنی تھی زندگی یہ بہر حال کٹ گئی

اک آس بندھ گئی تھی کہ آئیں گے وہ ضرور
لیکن تمام رات اِن آنکھوں میں کٹ گئی

یہ اتفاق ہے کہ مجھے علم تب ہوا
اُس کے کرم کی جب کبھی خیرات بٹ گئی

انساں کی زندگی میں خلوص و وفا کہاں
جس سے پتنگ اُڑتی تھی وہ ڈور کٹ گئی

اُن کے بغیر دل پہ تھا ہر لمحہ بار جب
ہے شکر کا مقام گھڑی وہ بھی کٹ گئی

ایسا لگا کہ دُھند کی چادر ہے چارسُو
نظروں سے جب وہ خوشنما تصویر ہٹ گئی

جو اہلِ فن ہیں اُن کی کمی ہو گی قدر کیا؟
یہ سوچتے ہی سوچتے اک عمر کٹ گئی

یہ بارہا ہوا ہے کہ وہ ملتفت نظر
میرے قریب آنے سے پہلے پلٹ گئی

محور بدلتے ہی رہے ہیں زندگی کے عرشؔ
یہ گلستاں میں تو کبھی صحرا میں کٹ گئی

○

کرامت بخاری

(لاہور)

جہاں اندر جہاں رکھا ہوا ہے
مگر مجھ سے نہاں رکھا ہوا ہے

ملاقاتیں مسلسل ہوں تو کیسے
زمانہ درمیاں رکھا ہوا ہے

بہار آئی چمن میں چُپکے چُپکے
کہیں خوفِ خزاں رکھا ہوا ہے

روانی دل کے دریا میں کہاں تھی
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے

میں تنہائی میں تنہا تو نہیں ہوں
قفس کو رازداں رکھا ہوا ہے

غزل میں تو روائیت در روائیت
خیالِ رفتگاں رکھا ہوا ہے

ہے گھر میں اس قدر سامانِ نفرت
جہاں دیکھو وہاں رکھا ہوا ہے

مرا دل میرے پہلو میں نہیں ہے
اگر ہے تو کہاں رکھا ہوا ہے

خلا میں میری آہوں کے علاوہ
سکوتِ جاوداں رکھا ہوا ہے

عزا خانۂ خلوت میں کرامتؔ
غمِ آئندگاں رکھا ہوا ہے

○

سلیم انصاری

(جبل پور، بھارت)

یہ دادی اور نانی کھو رہے ہیں
کہ بچّے اب کہانی کھو رہے ہیں

سمندر بیکرانی کھو رہے ہیں
کہ دریا ہی روانی کھو رہے ہیں

تو کیا تہذیب کا ماتم کریں ہم؟
اگر رشتے معانی کھو رہے ہیں

کشادہ تو ہے دسترخوان، اور ہم
شعورِ میزبانی کھو رہے ہیں

جنہیں دل سے بہت ازبر کیا تھا
وہ سب چہرے زبانی کھو رہے ہیں

ہمیں خوابوں کی تعبیریں بہم ہیں
مگر آنکھوں کا پانی کھو رہے ہیں

○

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

تیرے نیناں رسیلے ہو گئے ہیں
کہ جب سے ہاتھ پیلے ہو گئے ہیں

ہوئیں دُشواریاں رستے میں اِتنی
ہمارے پاؤں نیلے ہو گئے ہیں

اُنہیں شرمندگی کیوں کر ہوئی ہے
وہ کیسے اتنے گیلے ہو گئے ہیں

اناؤں کی ترقّی کیا ہوئی ہے
کہ ذاتوں سے قبیلے ہو گئے ہیں

جڑوں نے پیڑ کی پانی پیا وہ
کہ سب پتے رسیلے ہو گئے ہیں

چُنے پلکوں سے میں نے خار سارے
ترے ملنے کے حیلے ہو گئے ہیں

زہیرؔ اِن پر قدم دھرنا ہے مشکل
وہ پتّھر بڑھ کر ٹیلے ہو گئے ہیں

○

ادھوری لڑکی

منیرہ احمد شمیم
(اسلام آباد)

''امتل''

''ہوں''

''چلواٹھو باہر چلتے ہیں''

''باہر کہاں؟'' امتل بیزاری سے پوچھتی ہے۔

''کہیں۔۔۔کسی چھوٹے سے ریستوران میں چائے پیئں گے۔

امتل چارپائی پر اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹ لیتی ہے اور بیزاری سے جمائی لیتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہے۔

امتل بکھرے ہوئے وجود کی لڑکی ہے یا مجھے بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید وہ خود بھی یہ جانتی ہے یا شاید وہ نہیں جانتی۔لیکن میں نے اُسے اس لمحے کی گرفت میں دیکھا ہے جب وہ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو دیکھ لیتی ہے۔اور پھر وہ اس امید کے ٹیپ سے اپنے وجود کو جوڑ لیتی ہے۔ یہ سوچ کر کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور میری زندگی میں آئے گا۔وہ اکثر اس کی باتیں مجھ سے کرتی جو اس کے خیالوں کا شہزادہ تھا۔لیکن جلد ہی آنسوؤں سے یہ امید کا ٹیپ بھیگ جاتا اور پھر اُدھڑ جاتا۔

امتل میری روم میٹ ہے۔ہم آخری سال میں ہیں۔یونیورسٹی کا یہ آخری سال خودفریبی، آزادی کا آخری سال ہے آگے کیا ہوگا۔۔۔آگے کیا ہوگا؟ کبھی کبھی تشویش اپنے بھاری ہاتھوں سے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔امتل کو میں چار سال سے جانتی ہوں۔یا شاید چار صدیوں سے کیونکہ میں نے اس کی کھوکھلی روح میں اتر کر اس تنہائی کی گونج سنی ہے جسے وہ سگریٹ اور شراب سے دبانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

معمولی، بے حد معمولی شکل وصورت کی امتل ایک گونج ہے۔اور اس گونج کا ایک دائرہ ہے۔اس دائرے کا مرکز ہے اور اس مرکز میں۔۔۔میں نے امتل کو دیکھا ہے لیکن یہ اور بات ہے۔

امتل کپڑے بدل کر تیار ہوگئی ہے وہ اپنے پرس میں سگریٹ کی تازہ ڈبیا رکھ رہی ہے۔اور اس نے اپنے وجود پر بے نیازی کا خول چڑھا دیا ہے۔اسے میں جانتی ہوں اور میں نے یہ خول اتار دیا ہے اور امتل کو اس کے اپنے اصلی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔اور کیا پتہ میں نے یہ سب کچھ اس کی ہمدردی میں کیا ہو۔ ہماری ہر بات کے دو رُخ ہوتے ہیں۔بعض اوقات ہم صرف ایک ہی رُخ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور دوسرا رخ ہمیں کبھی نظر نہیں آتا۔

''چلو جان! امتل تیار ہے۔''

اپنے بے جان اور ٹوٹے ہوئے وجود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے۔۔۔ایک طویل کش کو فضا میں بکھیرتے ہوئے بولی!

باہر دھوپ ہے ڈھلتی ہوئی، مال روڈ کے پرلے سرے پر ایک چھوٹا سا ریستوران ہے۔ہمیں وہاں جانا ہے۔یہی ہمارا ٹھکانا ہے۔ یہاں ہم تھوڑے سے پیسوں میں بہت سا عیش کرتے ہیں۔یا عیش کا تاثر حاصل کرتے ہیں۔۔۔ اسی عیش سے امتل کی کہانی بھی وابستہ ہے۔لیکن یہ کوئی اتنی بڑی کہانی بھی نہیں!

ریستوران میں لوگ۔۔۔اِکا دُکّا لوگ بیٹھے ہیں۔ریستوران کے کونے میں وہ بھی بیٹھا ہے جو اس کہانی کا ایک کردار ہے۔مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے لیکن نام میں کیا رکھا ہے اس کا کوئی سا بھی نام رکھ لیجیے، کوئی بھی خوبصورت نام مثلاً سرمد۔۔۔سرمد ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔باہر اس کی کار۔۔۔لمبی کالی کار کھڑی ہے۔اس کار کی چمک اس کی شخصیت میں بھی ہے۔سرمد خوبصورت ہے، دراز قد ہے۔پائپ پیتا ہے۔اور اس وقت بھی پائپ پی رہا ہے۔پائپ سے تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو چاروں سمت پھیل رہی ہے۔ میں اس خوشبو کو اپنے وجود کے ریشے ریشے میں اتار رہی ہوں۔ مجھے اچھے تمباکو کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔ ہمیشہ سے اچھی لگتی ہے۔امتل کونے میں بیٹھے ہوئے سرمد کی مقابل والی میز پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔امتل نے اپنے پرس میں سے سگریٹ نکالی اور ایک لمبا کش لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ساری کائنات کو اپنے اندر اتار رہی ہو اور سرمد اس کی کائنات ہو۔سرمد اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا اپنے پائپ سے نکلے ہوئے دھوئیں کی خوشبو بکھیر رہا ہے۔لیکن میں اس سارے کھیل میں کہاں ہوں؟ مجھے اس سارے اُلجھاوے میں اپنے آپ کو ڈالنے کی ضرورت نہیں۔۔۔کیونکہ یہ کہانی امتل کی ہے۔

سرمد امتل سے محبت کرتا ہے۔کم از کم امتل کا یہی خیال ہے اور وہ اس کی سوچوں کا محور ہے۔اس کا ثبوت وہ خط ہیں جو سرمد نے امتل کو لکھے ہیں۔ جنہیں اس نے مجھ سے چھپایا ہے۔لیکن مجھے ان خطوط کا علم ہے، کیسے علم ہے یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔سرمد کی محبت امتل کو گھُن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے اور وہ اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے اور کسی دن وہ کھوکھلے درخت کی طرح گر جائے گی۔

سرمد اور امتل کی اس خاموش محبت کو میں چھ ماہ سے دیکھ رہی ہوں اور بیرے بھی اس کھیل میں شامل ہیں۔وہ خاموشی سے خط اٹھانے لگے ہیں۔وہ چپکے سے آتے ہیں اور پانی کا گلاس سرمد کی میز پر رکھ جاتے ہیں۔سرمد جواب میں تشکر سے مسکراتا ہے۔پھر بیرا چائے لاتا ہے دو آدمیوں کے لیے لیکن دوسری پیالی ہمیشہ خالی رہتی ہے اسی طرح صاف شفاف جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو، جیسے امتل کا انتظار کر رہی ہو۔امتل دُور سے پیالی کو دیکھتی ہے اور آنکھیں بند کرتے ہی کہیں کھو جاتی ہے جیسے وہ اس چائے کی پیالی میں اتر رہی ہو اور سرمد اُسے ایک

ہی گھونٹ میں پی جائے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی سرمد سامنے والی ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہے۔ بیرا مسکرا کر پانی کا گلاس اور دو آدمیوں کی چائے ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ امتل آنکھیں بند کر کے اس خالی پیالی میں اترنے ہی والی تھی کہ ریستوران کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت سمارٹ سی لڑکی اندر داخل ہوئی اور بڑی گرم جوشی سے سرمد کی طرف بڑھی۔

سرمد کھڑا ہو گیا۔

ہائے۔۔۔لڑکی نے کہا۔

ہائے۔۔۔۔سرمد نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں قہقہوں میں چائے پینے لگے۔

میں نے دیکھا امتل کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ جیسے چائے کی پیالی میں غوطے کھا رہی ہو۔ زندگی کے اس ٹھہرے ہوئے بدصورت لمحے کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ اپنی خوف زدہ نظروں سے امتل نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔۔۔اور سارے غم اپنی جھولی میں سمیٹ کر ریستوران سے باہر نکل آئی۔

باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں۔۔۔خزاں کی زد میں آئے درخت کے زرد پتوں کو گہرا کر رہی تھیں۔ امتل نے جھک کر پتوں پر یوں ٹھوکر ماری جیسے اپنی بیتی ہوئی زندگی پر ٹھوکر مار رہی ہو۔

میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ تپتے سورج میں اس زمین کی طرح نظر آیا جس زمین پر برسوں بارش نہ برسی ہو۔

''امتل''

''ہوں'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اداس کیوں ہو؟''

''اداس نہیں ہوں مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے۔ جھوٹا۔۔۔کمینہ'' وہ غصے سے بولی۔

''کون؟'' میں پوچھتی ہوں

''وہ مجھ سے محبت کرتا تھا'' وہ بڑبڑائی۔

''تم اس سے ملیں''

''نہیں۔۔۔۔میری اس سے ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید وہ میرے اندر پہلے ہی سے موجود تھا۔ بس دریافت اب ہوا تھا۔۔۔پیار کہیں باہر سے نہیں آتا، یہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔ شاید ہم اسی انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ کب آئے اور اچانک مل جائے۔''

لیکن جسے تم جانتی نہیں اُسے تخیل کی مدد سے جان لیوا کیوں بنا رہی ہو۔ ایک بات کہوں تم نے یہ جو اپنے وجود کے ارد گرد اداسی اور بیزاری کا کمبل لپیٹ رکھا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس سے تم اپنے اندر کی تنہائی کا خلا بھر لوگی۔''

''زندہ تو رہنا ہے نا!''

''عجیب لڑکی ہو۔''

اچھا آؤ۔۔۔چھوڑو یہ باتیں۔۔۔کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

''تمہارے دل میں اپنے لیے اتنی ہمدردی دیکھ کر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے تم میری زندگی میں کوئی اہم رول ادا کرو گی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم مجھے بچا لوگی کسی آفت سے۔''

''امتل۔۔۔تمہیں کیسے معلوم کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔''

''ہونہہ۔۔۔میرے پاس ثبوت ہے''

''خط۔۔۔؟'' میں پوچھتی ہوں

''ہاں''

''مجھے معلوم ہے''

''تجھے کیسے معلوم ہے؟''

''وہ خط جو مجھ سے تم چھپاتی رہی ہو لیکن مجھے معلوم ہے!''

یہ کہہ کر مجھے یوں لگا جیسے میں ابھی اُسے قتل کرنے والی ہوں۔ خوف سے میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔۔۔ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ پرندوں کی ایک ڈار میرے سر پر سے گذر گئی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

''کیسے معلوم ہے تجھے؟''

امتل نے دوبارہ مجھ سے پوچھا۔

''اس لیے کہ۔۔۔تمہارے اندر کی تنہائی کو کم کرنے کے لیے وہ خط میں نے تمہیں لکھے تھے۔''

امتل نے میری طرف یوں دیکھا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔

امتل سے آنکھیں چرا کر میں دوسری طرف دیکھنے لگی۔

خواب

وہ دیکھو عظمتِ رفتہ، وہ صبحِ افتخار آئی
نویدِ بہار آئی، نسیمِ مُشکبار آئی
ضمیر و دل ہوئے تابع جو احکامِ الٰہی کے
مہک اُٹھا چمن سارا، عجب سی یہ بہار آئی

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

دلیر سنگھ ولد شیر سنگھ

امرناتھ دھمیجہ
(لدھیانہ، بھارت)

دلیر سنگھ ولد شیر سنگھ کا نام اپنے جدی گاؤں کے علاوہ دُور دراز کے اُن چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی بڑی عزت واحترام کے ساتھ لیا اور سنا جاتا تھا۔ اُس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کیونکہ اُس تمام علاقے میں دلیر سنگھ سے بڑھ کر کوئی بھی زمیندار اتنا امیر اور طاقت ور نہ تھا میلوں میل اُس کی سینکڑوں ایکڑ زرخیز زمین پر جب گندم کی فصل ایک الہڑ دوشیزہ کی طرح لہلہاتی تو گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے باشندے کی زباں پر دلیر سنگھ کے نام کا ہی چرچا ہوتا تھا۔ آس پاس کے کسان جن کی زمین کا رقبہ مشکل سے دو تین ایکڑ تک ہی محدود تھا دلیر سنگھ کی زمین کا پھیلاؤ دیکھ کر اپنے آپ کو بونا سا محسوس کرتے تھے۔ گاؤں کے زیادہ تر غریب باشندے اُس کی کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرنے کے علاوہ اُس کے ڈھور ڈنگروں کو سنبھالنے پر مامور تھے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ دلیر سنگھ کے دونوں ہاتھوں نے قسمت کو قید کر رکھا تھا اور خوشحالی اُس کی حویلی کی دہلیز پر سجدہ کر رہی تھی۔

سب راجے مہاراجے اور امیر لوگ اولاد نرینہ کے لیے ترستے ہوئے اس جہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا کرم دیکھئے دلیر سنگھ کے ہاں دو جڑواں بیٹوں نے جنم لیا تھا۔ دونوں بیٹوں کو اپنی گودی میں بٹھاتے ہوئے دلیر سنگھ اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر اکثر کہا کرتا تھا۔ نہال کورے توں تاں سانوں دو دو پتر دے کے نہال ہی کر دِتا اے۔ تُوں ویکھن گی ایہی پتر وڈے ہو کے ساڈے خاندان داناں روشن کردے ہوئے میریاں بانہواں بڑن گے۔ ہر انسان ایک اُمید پر زندہ ہے کل کیا ہونے والا ہے یا کیا ہوگا اس سے ہم بے خبر ہیں۔ دلیر سنگھ بھی اُمید کا سفر طے کرتے ہوئے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا اور اُس کے دونوں بیٹے جنکا نام رگھبیر اور جسبیر سنگھ رکھا گیا تھا۔ جوانی کی منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جوان اور امیر گھر کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے آس پاس کے گاؤں والوں کی جانب سے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ سماجی طور پر جوان بیٹیوں کے ماں باپ کی نظر ہمیشہ اچھے گھر اور ور کی تلاش میں رہتی ہے۔ نزدیکی گاؤں کے سرپنچ کی دو جوان بیٹیاں جن کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا لیکن قد کاٹھ میں دونوں برابر لگتی تھیں اور صورت میں بھی قابل قبول تھیں۔ اس کے علاوہ دونوں گھر والوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھالا ہوا تھا۔ سرپنچ نے اپنی دونوں بیٹیوں کا رشتہ دلیر سنگھ کے دونوں بیٹوں سے طے کر دیا۔ سگائی ہونے کے بعد شادی کی تاریخ دو ماہ بعد مقرر کر دی گئی تا کہ دونوں گھرانے شادی کی تیاری کر سکیں۔ دلیر سنگھ کی دلی تمنا تھی کہ دونوں بیٹوں کا وواہ اگر ایک ہی دن ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہو جائے۔ دلیر سنگھ کی یہ مراد بھی پوری ہو گئی اور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کیونکہ شادی والے دن دونوں بھائیوں نے سہرا باندھے ہوئے نزدیکی گوردوارے میں ماتھا ٹیکا اور بینڈ باجے کے ساتھ برات کی صورت میں دولہے بن کر گھوڑیوں پر سوار ہو کر جب گاؤں کی گلیوں میں سج دھج کر نکلے تو انسان تو کیا قدرت بھی اتنا خوش نما منظر دیکھ کر شرما گئی۔ بچے تو کیا بوڑھے بھی محبت بھری نظروں سے دونوں دولہوں کو سجے سوئے دیکھ کر اپنے اپنے دل میں یوں سوچ رہے تھے کہ یہ برات دلیر سنگھ کے بیٹوں کی ہو کر بھی جیسے اُن کے اپنے بیٹوں کی جا رہی ہو۔ سارے گاؤں میں خوشی کا ماحول تھا کیونکہ دلیر سنگھ نے ایک دن پہلے سارے گاؤں والوں کو کھانے پر بلایا تھا اور جھولیاں بھر بھر مٹھائی بانٹی تھی۔ ڈھول ڈھمکوں کا شور اور خوشی کا ماحول سارے گاؤں میں چھایا ہوا تھا اور گاؤں کے ہر بشر کے چہرے پر مسکان بکھری ہوئی تھی۔ دوسرے روز برات کی واپسی پر ڈولی سے اترتے ہوئے دونوں دلہنوں نے جب حویلی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ ساس سسر کے پاؤں چھوئے تو دلیر سنگھ کی آنکھوں میں خوشی کے چند آنسو آ گئے۔ دونوں بیٹوں اور بہوؤں کو آشیرواد دیتے ہوئے اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے:

اور وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ''اے میرے سچے پات شاہ تیرا لکھ لکھ شکر اے کہ تُسی اِس نماڑیں دے سر تے ہتھ رکھ کرایہہ کارج مکمل کرایا اے''

اکثر بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ عورت ایک بیٹا پیدا ہونے پر دوسرے کی تمنائی اس لیے رہتی ہے کہ میرے گھر دو بیٹوں کا جوڑ بن جائے پنجابی کہاوت ہے کہ ''اک پتر نہ جمی رنے، بانہہ جاوے تے اکھوں اُنھے، گھر آوے تے بھانڈے بھنے'' خوش قسمتی سے اگر پرماتما دو بیٹے دے دے تو وہ دونوں بڑے ہو کر ماں باپ کے لیے دو دو الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ اکثر ایسا کئی گھروں میں ہوتے دیکھا گیا ہے۔ کبھی کبھار معمولی سی بات پر دو بھائیوں میں تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے اگر دو سگے بھائیوں کے ہمراہ دو سگی بہنیں بیاہی جائیں تو وہ گھر اچھے تال میل سے سورگ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس آج کے حالات کے مطابق وہی دونوں سگی بہنیں اگر دیورانی اور جیٹھانی کا رول ادا کریں تو وہی سگی بہنیں ایک دن آپس میں سوتن جیسا روپ اختیار کر سکتی ہیں کئی مرتبہ معمولی سی بات ایک اچھے بھلے پریوار میں ایسی خلش بن کر اُبھرتی ہے کہ اپنے ہی خون کا رشتہ دشمنی میں بدل کر رہ جاتا ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے دلیر سنگھ کی حویلی کے سانجھے چولہے میں ہلکی ہلکی نفرت کی آگ سلگ رہی تھی اور اُس کا دھواں دونوں بھائیوں کے علاوہ دونوں بہنوں کے دل ودماغ پر ایسا چھایا تھا کہ ان کی دبی زبان سے بٹوارے کی صدا آنے لگی تھی۔ دلیر سنگھ کے کانوں تک جب یہ صدا گونجی تو وہ سن کر تھرتھرا سا گیا۔ کیونکہ اُسے یہ ہرگز امید نہ تھی کہ اُس کے بیٹے ایسا قدم اٹھائیں گے۔ دلیر سنگھ ہر صورت میں اپنے گھر کا امن اور ایکتا برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس بات سے بخوبی

واقف تھا کہ گھر کا بٹوارہ جگ ہنسائی کے علاوہ پورے پریوار کے لیے دکھدائی ہی نہیں ہوگا بلکہ تباہی کا کارن بھی بن سکتا ہے۔ اُس نے دونوں بیٹوں کو اکیلے میں بٹھا کر بٹوارے کے درد کو تفصیل سے سمجھایا لیکن وہ ناکام رہا۔ جوان بیٹوں کی ضد اور جوانی کے جوش کے آگے آخر کار اُس نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔

بٹوارے کی تجویز کو دلیر سنگھ نے مان تو لیا لیکن وہ اندر سے بُری طرح ٹوٹ گیا کیونکہ اُس کے دل میں آنے والے کل کے لیے ایسے ہزاروں سنہرے سپنے بسے ہوئے تھے جو وہ اپنی زندگی میں حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن حالات نے اُسے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ انسان جب بھی ہارتا ہے اپنی اولاد سے ہی ہارتا ہے۔

کھیتوں کے بٹوارے کے لیے نہ تو کسی پٹواری سے حد بندی کرانی پڑی اور نہ ہی جدی زمین کے ٹکڑے کرانے کے لیے کسی پیمائش کی نوبت آئی کیونکہ تمام کھیت کے بیچوں بیچ تقریباً دو فٹ کی چوڑی سی نالی جیسے عام طور پر کسان اپنی بولی میں کھال کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہی کھال اپنے لمبے سے جسم میں پانی کو سمیٹتے ہوئے دُور دور تک کے تمام کھیتوں کی فصل کو سیراب کرنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہے۔ پانی خواہ ٹیوب ویل کا ہو یا نہری ہو۔ دلیر سنگھ نے اُسی کھال کو حد بندی کا آدھار بنا کر دائیں طرف کے کھیت بڑے بیٹے کو دیئے اور بائیں جانب کے کھیت چھوٹے بیٹے کو سونپ دیے۔ دونوں بیٹوں کے لیے اس شرط کو ماننا لازمی قرار دیا گیا کہ یہ کھال پانی کے استعمال کے لیے دونوں بھائیوں کی مشترکہ رہے گی۔ جب بھی جس بھائی کی پانی کی باری آئے گی وہ اسے استعمال میں لا سکتا ہے خواہ وہ پانی نہری ہو یا اپنے اپنے ٹیوب ویل کا ہوگا۔ قارئین ہر کسان کو زمین سے بڑھ کر کوئی بھی شے اتنی پیاری نہیں ہوتی جتنا وہ اپنی زمین سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اُپجاؤ زمین کے لیے پانی کا ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ پانی ہی زمین کی جان ہے۔ پنجاب میں عام طور پر نہری پانی کی باری رات کو ہی آتی ہے لیکن کسان اپنی پانی کی باری کو کسی بھی صورت میں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ رات کے اندھیرے میں کئی مشکلات بھی آتیں ہیں۔ بعض اوقات تو کسانوں کو سانپ تک ڈس لیتے ہیں لیکن وہ پانی کا استعمال ہر حالت میں کرتے ہیں کیونکہ اگر پانی نہ دیا تو فصل سوکھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

بٹوارے کے کچھ دن بعد حسب معمول نہری پانی کی باری آ گئی۔ کھیتوں کا بٹوارہ تو ہو چکا تھا لیکن پانی دینے کا وسیلہ ایک کھال تھی جو کہ دونوں بھائیوں کے لیے سانجھی تھی۔ بڑے بھائی کا اصرار تھا کہ پہلے میں اپنے کھیتوں کو پانی دوں گا تم اگلی باری لے لینا۔ چھوٹے نے اپنی فصل سوکھنے کی دُہائی دیتے ہوئے سخت لہجے میں بات کی۔ بڑے بھائی کو چھوٹے کی بات ناگوار سی گذری۔ اور بات بڑھتے بڑھتے گالی گلوچ سے ہوتے ہوئے ہاتھ پائی تک آ پہنچی۔ سردیوں کی راتیں تھیں اور آس پاس کے کھیتوں میں بھی کوئی کسان موجود نہ تھا جو بات کو بڑھنے سے سنبھال لیتا البتہ دونوں بھائیوں کے ساتھ اپنا ایک ایک کارندہ موجود تھا ان دونوں کے ہاتھوں میں اپنی اپنی کدال تھی اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ جو بھی بھائی حکم دے گا وہ اپنی کدال سے کھال میں بہتے ہوئے پانی کا رخ اپنے کھیت کی جانب موڑ دے گا۔ پانی کو موڑنے کے لیے کدالیں کارندوں کے ہاتھوں میں تھیں وہی کدالیں غصے کی آندھی میں بہتی ہوئی حملہ کرنے کی غرض سے دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں آ چکی تھیں۔ نازک حالات کو دیکھتے ہوئے ایک کارندہ دوڑ کر دلیر سنگھ کو بلا لایا۔

دلیر سنگھ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر کھیتوں کی جانب بھاگا۔ اس سے قبل کہ دلیر سنگھ دونوں بیٹوں تک پہنچ پاتا دونوں بھائیوں کا غصہ گالی گلوچ سے ہوتے ہوئے چنڈال بن کر انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ دلیر سنگھ کے پہنچتے ہی ایک بھائی نے دوسرے بھائی پر اپنی کدال سے وار کر دیا۔ لیکن دوسرے بھائی کی چُستی سے وہ وار خالی گیا۔ جواباً جب دوسرے بھائی نے وار کیا تو بدقسمتی سے وہ وار دلیر سنگھ کے سر پر ایسا لگا کہ وہ خون سے لت پت بہتے ہوئے اُس پانی کی کھال میں جا گرا اور کھال کے دونوں کنارے اُس کے بھاری بھرکم جسم سے ٹوٹ گئے اور وہ خود جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

دلیر سنگھ کے سر سے بہتا ہوا خون پانی کی آمیزش لیے اُن دونوں بیٹوں کے کھیتوں میں اُگی ہوئی فصل کو یوں سینچ رہا تھا جیسے آج سے پچیس سال پہلے اِسی خون سے اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کے بچپن کو سینچا تھا۔

گھٹن بھری دھند

دیوی ناگرانی

(ممبئی، بھارت)

پیاری دیپا،

تمہارا خط ملا، پڑھ کر لگا کہ تم میرے بارے میں جاننے کے لیے زیادہ فکرمند بھی ہو اور پریشان بھی۔ کیوں نہ رہو گی، میں فیروز پور سے اپنا سب کچھ راتوں رات سمیٹ کر تمہیں بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ بتائے یہاں نینی تال آ گئی۔ یہاں آ کر اب دو مہینے ہو گئے ہیں، اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں دل کسی حد تک ٹھہراؤ حاصل کرنے لگا ہے۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی۔ ان یادوں کی پرچھائیوں میں جینا نہیں چاہتی۔ پر آج پھر تمہارے خط نے میرے دل میں ایک انقلابی اتھل پتھل مچا دی ہے۔ خود کو بچائے رکھنے کے لیے اپنی سوچ کے بہاؤ پر قابو پانے کی کوشش کرنے میں مصروف ہوں پر سیلاب تھم ہی نہیں رہا۔ بہاؤ میں بہہ جانے کے خوف سے خود کے دفاع کے لیے کوئی اور راہ نہ ملی صرف خود کو تمہارے ساتھ بانٹنے کے لیے قلم اٹھا لیا ہے اور یہ خط۔۔۔! اور پھر ہمارا ساتھ کوئی ایک دو دن کا نہیں لگتا ہے صدیوں کا ہے۔ پیدائش جنم تر کا ہے۔ خود کو تمہارے سامنے بے پردا کرنے میں مجھے اب کوئی حجاب نہیں۔ تم تو جانتی ہی ہو میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میری دو بڑی بہنیں اب بھی گھر میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہیں۔ میری ضد کی وجہ سے مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دینے کے لیے والد صاحب مجبور ہو گئے تھے۔ میں نے پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد پوسٹ گریجویشن کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ابھی تک دونوں بہنیں ایک آٹھویں پاس اور دوسری میٹرک پاس گھر میں گزشتہ پانچ سال سے بیٹھی جانے کس کے انتظار میں اپنی عمر کے سال بڑھا رہی ہیں۔ اب تک پڑھ لکھ کر نوکری پر لگ گئیں ہوتیں تو زندگی یوں ٹھونٹھ سی زیرِس نہ ہوتی کچھ معنی خیز رنگوں سے ضرور بھری ہوتی۔ مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے اور ہو بھی کیوں نا؟ آخر اس وقت میں انیس برس کی تھی۔ اس معر میں تو لڑکیوں کو مکمل ہوش ہوتا ہے اور وہ ذہنی طور پر لڑکوں سے دو قدم آگے ہوتی ہیں۔ خیر میں اپنی بات پر آتی ہوں۔ تم بھی تو کالج پڑھی ہو، وہاں کے ماحول اور سرگرمیوں کی ہلچل سے واقف ہو۔ میں بھی ناواقف ہونے کا ڈھونگ نہیں کروں گی۔ براہ راست اپنی بات پر آتی ہوں۔ اب یہ یقینی طور پر جان گئی ہوں کہ زندگی رشتوں کا ایک پلندہ ہے۔ اور رشتے بھی کوئی اپنے انتخاب کے نہیں ہوتے۔ کچھ خالص ہیں جیسے ماں باپ، بہن بھائی اور کچھ بن جاتے ہیں جیسے اپنے، پرائے، دوست، دشمن اور پھر پنپتے رہنے پر ان سے ایک لگاؤ سا ہو جاتا ہے۔ اپنے سے لگنے لگتے ہیں، عزیز ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موڑ پر مجھ سے آفتاب ملا۔ میرا بھی اس کے ساتھ ناتا جڑ گیا۔ ایک بانڈ سا بندھ گیا۔ سچ کہتی ہوں دیپا، جتنی جلدی وہ تعلق جڑا اس سے کہیں زیادہ رفتار سے وہ اپنی پٹڑی سے اتر بھی گیا۔ میں بھی ٹوٹنے لگی کسی واردات کی طرح۔ اب اس رشتے کو کوئی نام دینا ٹھیک نہ ہو گا! شاید اس لیے کہ میں نے اس رشتے کو پہچاننے میں غلطی کی۔ اب تو اسے بھول کہنے کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ بھول بھی کیسی؟ بس یوں سمجھو خود کے لیے سزا مقرر کی ہے۔ یہاں میں اپنی کہی بات کو بہتر کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی یوں ویران وافسردہ نہ ہوتی، کچھ معنی خیز رنگوں سے ضرور بھری ہوتی اگر کوئی ہم سفر مل جائے۔ میں اپنی زندگی کو بے رنگ کرنا چاہتی ہوں جس نے مجھے اندر دھنشی رنگوں میں سچا خوابوں کا آسمان دکھایا وہ اب میری زندگی میں کہیں نہیں تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟ جی ہاں، آفتاب کہا کرتا تھا ''ارپنا میں تمہیں چاند ستاروں کی ایسی دنیا دینا چاہتا ہوں جو تمہاری مانگ میں سیندور نہیں ستاروں کی جگمگاہٹ بھر دے۔۔۔'' ''کب آفتاب۔۔۔؟'' میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔ ''جب ہماری پڑھائی ختم ہو گی تب! جب ہمیں نوکری مل جائے گی تب! جب ہم تم دونوں اپنی جوابداری سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے تب!'' ''جوابداری سے تمہارا مطلب۔۔۔'' ''ارپا کیا یہ بھی آپ کو بتانا پڑے گا؟ جوابداری تو جوابداری ہوتی ہے نا؟ جب کمائیں گے تب کہیں گھر لے کر بس جائیں گے پھر میاں بیوی کہلائے جانے پر امی ابو کہلائے جانے کی للک تو ہو گی نا؟ ہو گی کہ نہیں۔۔۔؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ''اس سلسلے میں شادی کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہوا! وہ کب کرو گے۔۔۔'' ''شادی کیوں ہو گی باقاعدہ نکاح ہو گا پوری طرح رسومات کے ساتھ اور میں نے تو تمہارا نام بھی سوچ رکھا ہے۔ زرینہ! نام کیسا لگا؟''

دیپا سچ کہتی ہوں مجھے جیسے ایک نہیں ہزار سانپ ڈس گئے۔ میری اس جانب توجہ مرکوز ہی نہیں ہوئی تھی کہ آفتاب اتنا کٹر مسلمان ہو گا اس طرح اپنے مذہب کی روایتوں کو مجھ پر تھوپے گا۔ تب مجھے آفتاب پر غصہ آنے لگا تھا۔ محبت کا رنگ باتوں کی ترشی سے آہستہ آہستہ نہیں پر تیزی سے اترنے لگا۔ غلطی تو میری تھی میں نے بھی عشق محبت کے بہت سے قصوں کی طرح اسے بھی اپنی سلونی محبت کی کہانی کے طور پر انجام دینے کا خواب دیکھا تھا۔ سوچا تھا والد سے بغاوت کروں گی محبت بھری ایک نئی دنیا بساؤں گی۔ جہاں ہم دو ہمارے دو ہوں گے۔۔۔!

''آفتاب تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے پر میں سنجیدہ ہوں۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں یہ تو آپ کو معلوم ہے۔ ہم نے اس بارے میں بات کی ہے اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی اس بات کو گھر میں چھیڑ کر کوئی حل نکال لو گے! اور آج یہ حیرت انگیز منفرد باتیں لے کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

دیپا ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ جب آفتاب سے میری آنکھیں لڑی تھیں مجھے اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہ ہوا کہ میں ہندو ہوں اور وہ

مسلمان۔لگا دل کا معاملہ ہے دلوں میں حل ہو جائے گا پر میرا وہ گمان ایک گھمبیر مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔

اچانک مجھے لگا کہ میں خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی، بدن کانپنے لگا تھا غصے سے یا ڈر سے۔ یہ اس وقت طے نہیں کر پائی پر جب آفتاب کا ہٹھیلا رویہ دیکھا تو مجھے یقین ہوا کہ میرے ڈر کی بنیاد ٹھوس تھی۔

''کیوں کیا ہوا ارپا کانپ کیوں رہی ہو؟''

''آفتاب تمہیں میرے ساتھ آج ہی ابھی شادی کرنی ہوگی۔ یہ کیوں اتنا ضروری ہے تم اچھی طرح جانتے ہو؟''

''میں نے تو تم سے کہا تھا ارپا۔۔۔ پر تم بھی کبھی کبھی اڑ جاتی ہو۔''

''کیا مطلب؟ کیا اس کی جوابدار صرف میں اکیلی ہوں؟ تم نے تو کہا تھا حل نکال لوگے گھر میں بات کروگے۔۔۔!''

''کی تھی پر ابو امی ضد پر اڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں انہوں کہیں زبان دے رکھی ہے۔''

''مطلب۔۔۔ کیا ہوا آفتاب؟ صاف صاف بتاؤ''

''وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہیں ہوا تو وہ اپنی جان دے دیں گے''

''کیسا نہیں ہوگا تو آفتاب۔۔۔؟''

''اگر میں نے ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے نکاح نہیں کیا تو۔۔۔!''

میری دوست کیا بتاؤں کس طرح بیان کروں کہ اس وقت یہ ''اگر مگر'' سن کر مجھ پر کیا گزری؟ جیسے ایک ساتھ کئی آتش فشاں میرے تمام وجود کی دھجیاں اڑانے کے لیے وسپھوٹت ہوئے۔ میرا سہا سہا وجود صرف نا اُمیدی سے آفتاب کو دیکھتا رہا۔

''تو تم نکاح کروگے۔۔۔؟ اس کے ساتھ جس کو تم جانتے ہی نہیں صرف تمہارے ماں باپ نے وعدہ کیا ہے۔۔۔ اور میرا کیا؟ میرے پیٹ میں پل رہے اس بچے کا کیا؟ ان وعدوں کا کیا جو تم نے میرے ساتھ کیے؟''

''ارپا میں تم۔۔۔!''

''تم کیا آفتاب۔۔۔!؟ ابھی ابھی جو تم ہم دونوں کی جوابداری کی بات کر رہے تھے، اس جوابداری کو سنبھالنے کی بات کر رہے تھے۔ اب تم اپنی ہی کہی بات سے مکر رہے ہو!''

اُس لمحے میرا سارا بدن کانپ رہا تھا ڈر سے نہیں بلکہ غصے سے۔ دیپا، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہر جرم میں شرکت تو مرد کی بھی ہوتی ہے پر سزا اکیلی عورت کو بھگتنی پڑتی ہے؟ کیوں تنگ سماج کی ان گھسی پٹی روایات سے عورت کو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے؟ کیا آزادی صرف مردوں کے حصے میں آتی ہے کہ وہ من مانیوں کی گنگا میں نہاتے رہیں اور گنگا کو میلی کرتے رہیں؟ سہیلی پھر جو ہوا اُس نے تو میرے سر سے محبت کا بھوت ہی اتار دیا۔ بے شرمی کی ہر دیوار کو پھلانگتے ہوئے ایک پاک جذبہ کو ناپاک کرتے ہوئے اس نامراد نے کیا کہا جانتی ہو؟ سنو گی تو جان سکو گی کہ درندگی کیا ہوتی ہے؟ جانور کا چہرہ کیسا ہوتا ہے؟ صاف صفحات پر کالی تحریریں لکھنے والے ندی کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے بے بسی کو زوال کی راہ پر کس طرح چھوڑ دیتے ہیں؟

''کمبخت جوابداری سے کون مکر رہا ہے ارپا؟ میں تو تمہیں اپنے سر پر آئی ہوئی مشکلات کی داستان بتا رہا تھا یہ امی ابّو بھی نا۔۔۔! کچھ سمجھتے ہی نہیں عورت ذات کی پریشانی۔۔۔!''

''اپنے امی ابّو کو دوش دینے سے پہلے اپنا چہرہ کسی صاف آئینے میں دیکھ لو۔ وہ تو دیے ہوئے وعدہ کو اچھی طرح ادا کرنے کی روایت پر مر مٹنے کی بات کر رہے ہیں۔ شاید آپ ہی زندگی میں رشتوں کی اہمیت نہیں سمجھ پائے یا سمجھتے ہوئے مور بن رہے ہو۔ اب تو مجھے تمہاری نیت پر شک ہونے لگا ہے۔۔۔!''

''کیسا شک ارپا؟ میرے ارادوں کو یوں شک کی دھول سے مٹمیلا نہ کرو میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں''

''چاہت کیا ہوتی ہے تم اس سچ سے کوسوں دُور ہو آفتاب! اب اپنے ناپاک ارادوں سے آپ مجھے اور جھانسہ نہیں دے سکتے اب اسی وقت تم میری زندگی سے اپنے اس منحوس سائے کے ساتھ رفع دفعہ ہو جاؤ۔''

''ارپا۔۔۔!''

''آفتاب ممیا تا رہا''

تم نے میرے نام پر سیاہی پوت کر میری عزت کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ ایک عورت کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے۔ اب اس بے حیائی سے توبہ کرلو۔۔۔ یہی بہتر ہے۔۔۔''

''ارپا مجھے کہنے کا موقع تو دو۔۔۔! مجھے اپنی لاپرواہیوں کا مکمل طور پر احساس ہے۔''

''اب تمہاری کوئی بھی بات میرے زخم کا مرہم نہیں بن سکتی اور ویسے بھی تجربے بار بار نہیں کئے جاتے۔ بہتر ہے اپنے امی ابّو کے دیے ہوئے وعدہ کو نبھا کر ایک اور زندگی تباہ ہونے سے بچالو۔ اور اگر زندگی میں کبھی باپ بننے کا سکھ حاصل ہو تو اس اجنمے بچے کی قسم میں آپ کو بد دعا دیتی ہوں کہ تمہارا وہ سکھ بھی دکھ میں بدل جائے۔''

''اتنی سخت نہ بنو ارپا میں نے سوچ لیا ہے کہ امی ابّو کی تمنا پوری کر کے میں اس لڑکی کو طلاق دے کر تمہیں اپنا لوں گا اور اس بچے کو اپنا نام دیں گے''

دیپا اب اس کی لرزتی ہوئی آواز میں ڈر تھا۔ میری بد دعا کا خوف جھلک رہا تھا۔ انسان اتنا کائر بھی ہو سکتا ہے یہ پتہ نہیں تھا۔ اپنی سلامتی کو لے کر کوئی اتنا خود غرض ہو جاتا ہے یہ اس وقت جانا جب آفتاب کو مفاد کا ننگا ناچ کرتے ہوئے پایا۔ میرے نرم جذبوں کو اس نے اس قدر سخت بنا دیا کہ میرے دل کی ساری کڑواہٹ زہر بن کر الفاظ میں پرواہمان ہونے لگی۔

باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ کیجیے

''طائرِ لاہوتی''

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

ماڈرن آبادی کے جدید اور کشادہ گھر میں رہتے ہوئے بھی میر صاحبنی کی طبیعت میں ذرّہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ان کا مزاج آج بھی خزاں رسیدہ درخت کی مانند سخت اور کھردرا ہونے کے ساتھ ثقیل بھی ہو گیا تھا۔ جس طرح بارش کی کمیابی اور زمین کی سختی سے درخت کی جڑوں میں رواں خوراک کی رفتار سُست اور بوجھل ہو جایا کرتی ہے۔ جس کے باعث درختوں میں عجب طرح کی ویرانی اور اُجاڑ پن نمایاں ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح میر صاحبنی کی رگوں میں دوڑتا خون بھی پے در پے صدمات کے باعث سُست اور بوجھل ہو گیا تھا۔ جس کے سبب کوئی موذی مرض نہ ہونے کے باوجود بھی' وہ سوا امراض کا مجموعہ بن کے رہ گئی تھیں۔ زندگی میں اُن کی دلچسپی اولاد کے باعث تھی وگرنہ اُن کی دنیا تو اُسی دن لُٹ گئی تھی جس دن میر صاحب اُنہیں اس دنیا میں یک و تنہا چھوڑ گئے تھے۔ غلطیاں میر صاحبنی نے بھی زندگی میں کم نہ کی تھیں مگر کبھی کبھی وہ یہ ضرور سوچتیں! اگر اللہ میاں سبھی گناہ گاروں کو اس طرح سے دنیا میں سامانِ عبرت بنا دیا کرتے جس طرح میر صاحبنی کو بنایا ہے تو اس دنیا کی صورت کیا ہوتی اور ہمارے چہروں پر چڑھے غلافوں کے لئے قبرستان سے بھی زیادہ جگہ درکار ہوتی۔

خیالات کا تانا بانا بہت سی گتھیوں کی الجھی ڈور کو سلجھانے کی سعی میں مصروف رہتا اگر گاڑی کے پریشر ہارن کی مخصوص آواز میر صاحبنی کی سماعت کو ماضی کی زندہ مگر پُرخار وادیوں میں براہ راست کھینچ نہ لیتی۔

مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کر کے ریاض حسبِ عادت Back-Mirror سیٹ کرتے ہوئے مونچھوں کا زاویہ درست کرتا اور مخصوص انداز میں ہارن سے تین آوازیں نکال کر گاڑی سے نیچے اُتر جاتا۔ سب سے پہلے وہ اپنی پشاوری چپلوں کو زمین پر جھٹک کر گرد جھاڑتا' طبیعت پھر بھی مطمئن نہ ہوتی تو ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے پیلے رنگ کا دبیز کپڑا نکال کر اُس کا جھاڑن بناتا اور دونوں پاؤں کی جوتیوں کے دائیں بائیں کی مٹی جھاڑ کر گاڑی کی ونڈ سکرین کو چمکانے لگتا۔ اس دوران وقفے وقفے سے سر گھما کر پیچھے کی جانب بھی دیکھتا جاتا۔ گاڑی کی ونڈ سکرین کی صفائی سے مطمئن ہو کر دائیں بائیں کے دروازوں کو چمکاتا ہوا جب وہ گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف رواں ہوتا تو اکثر ڈینٹ کے تازہ نشان پر اُس کی نظریں ٹھہر جاتیں جس کے باعث اُس کے چہرے پر تناؤ اور تشویش کی ملی جلی کیفیت نمایاں ہو جاتی جس کے ردِعمل میں وہ اپنی قمیض کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبی برآمد کرتا اور اُس میں سے ایک سگریٹ نکال کر اُس کے دونوں سروں کو باری باری سگریٹ کی ڈبی پر ٹھونکنے کے بعد سگریٹ کا ایک سرا زبان پر پھیر کر گیلا کرتا اور خشک سرے کو ہونٹوں میں دبا کر سگریٹ سلگاتا اور چوڑی چکلی جفاکش چھاتی کا تمام زور صرف کرتے ہوئے لمبا کش کھینچ کر پھر سے گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا۔ ایک ایک کر کے سیٹھ صاحب کی وہ تمام زیادتیاں یاد آنے لگتیں جو گاڑی کو نقصان پہنچنے پر گاہے گاہے سیٹھ صاحب نے اس کے ساتھ کی تھیں۔

دنیا میں بہت کم انسان اس طرح کے ہوں گے جو ایک بار غصّہ آنے کے بعد اُس کا اظہار کیے بغیر نارمل ہو جائیں۔ ریاض کا تمام تر غصّہ اس کے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں منتقل ہو کر نوشی کے گھر کی کال بیل پر پڑ چکا تھا جس کے جواب میں کھولتی ہانڈی کی مانند' نوشی کی والدہ برآمد ہوتیں اور ریاض کو جاہل ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے شریفوں کے گھر کی گھنٹی بجانے کا طریقہ سکھانے لگتیں۔ جواب میں ریاض' طے شدہ طریقہ کار کے مطابق نوشی کے باہر نہ آنے پر غصّے کا اظہار کرتے ہوئے' لفظ شریف کو منہ ہی منہ میں بُڑبُڑانے لگتا۔

ریاض ایک غریب مگر خوددار ملازم تھا غلط بات کہتا نہ برداشت کرتا تھا۔ نوشی کے گھر وہ اپنی خوشی یا ضرورت کے لئے نہ آتا تھا وہ تو حکم کا غلام تھا۔ جب بھی سیٹھ صاحب کو بااختیار دوستوں کی دعوت مقصود ہوتی یا بڑی ڈیل کا موقع درپیش ہوتا وہ نوشی کی والدہ کو فون پر مطلع کر دیتے اور ریاض سیٹھ صاحب کے مقررہ وقت پر نوشی کے گھر کے باہر آ کر تین بار ہارن سے مخصوص آواز نکالتا جس کے جواب میں سجی بنی نوشی' گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنی زلفوں کو سمیٹتی آ بیٹھتی۔ اس کے پرفیوم کی تیز خوشبو ریاض کے نتھنوں میں سوزش پیدا کرنے لگتی۔ ریاض تیز رفتاری سے گاڑی بھگا کر تازہ ہوا میں لمبے سانس لیتا اور ناگوار بُو سے چھٹکارا حاصل کرتا۔

خلافِ توقع آج! نوشی تیار تھی اور نہ ہی اس کا ریاض کے ہمراہ جانے کا ارادہ تھا۔ وجہ' نوشی کی والدہ نے ریاض کو صاف صاف لفظوں میں بتا دی ''پانچ سالوں سے سیٹھ صاحب نے ایک ہی دام رکھے ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں ضروریاتِ زندگی اور معیارِ زندگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ان پانچ سالوں میں' سیٹھ صاحب نے نت نئے بنگلے' مل، فیکٹری' فارم اور نئے ماڈل کی بے شمار گاڑیاں خریدنے کے علاوہ الیکشن میں بھی بے پناہ دولت لٹائی ہے! یہ سب کچھ خالی خولی عقل کے زور پر حاصل نہیں ہوا اس میں نوشی کی اٹھتی جوانی اور مردوں کو ایک ہی وار میں ڈھیر کرنے کی صلاحیت کا بڑا دخل ہے جس کا حصہ نوشی کو ملنا چاہئے! یکمشت نہیں' نہ سہی' آج سے نوشی فی پھیرا تین گنا وصول کرے گی؟'' چربی چڑھے بے

ڈول کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بازاری انداز میں آنکھیں مٹکاتے ہوئے نوشی کی والدہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔جس کے بعد ریاض وہاں ایک پل نہ ٹھہرا۔ریاض کو بے دلی سے جاتا دیکھ کر ہارے ہوئے جواری کی مانند میر صاحبنی نے کمزور لہجے میں اپنی بات پھر سے دہرائی۔''سیٹھ صاحب سے کہنا اگر انہیں منظور ہو تو جلدی فون کر دیں ورنہ نوشی کی راہ میں دل بچھانے والوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔''

میر صاحب درمیانے درجے کے کھاتے پیتے خاندانی آدمی تھے۔ پہلی بیوی کی بے وقت موت اور اولاد کی بے مروتی نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کر دیا تھا۔بدقسمتی سے ان کی دوسری بیوی کا تعلق بہت اچھے خاندان سے نہ تھا۔جس کا احساس میر صاحب کو شدت سے ہوا کرتا۔دوسری بیگم کے بطن سے تین بیٹیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ان کی آزاد خیالی اور آزاد روی کے باعث جلد ہی میر صاحب ساری جمع پونجی سے محروم ہو گئے تھے جس کے بعد بیگم کا رویہ زیادہ ہی بے باکانہ ہو گیا تھا۔گھر کا سارا نظام بیگم کے منہ بولے بھائی چھّن میاں چلایا کرتے تھے جس کے باعث میر صاحب کی زندگی کے آخری ایّام انتہائی کسمپرسی اور کرب میں گزرے۔بیگم کی من مانی اور بیٹیوں کی آزاد روی کے باعث میر صاحب وقت سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میر صاحب کی موت ان کی بیگم کے لئے آزادی کا پیغام تھی۔اُن کی خواہشوں اور ارادوں میں اب کوئی چیز حائل نہ تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں گھر کے سارے طور طریقے بدل گئے۔چیتھڑوں میں نظر آنے والی میر صاحب کی بیگم جنہیں اہلِ محلّہ میر صاحبنی کہا کرتے تھے' کینچلی بدل چکی تھیں۔بھڑکیلے لباس اور گاڑھے میک اپ میں ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا۔بہت سا وقت ضائع کرنے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے جی بھرنے کے بعد کام کا آدمی ہاتھ لگا جس کا گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔سیٹھ صاحب میر صاحبنی کے ساتھ اُن کی بیٹیوں کے لئے بھی رنگا رنگ تحائف لے کر آنے لگے جس نے میر صاحبنی کی بڑی بیٹی' نوشی کی اٹھتی جوانی میں زہر گھول دیا۔سیٹھ صاحب کے آزمودہ ہتھکنڈوں کی بدولت' نوشی نے بہت جلد ماں کی جگہ لے لی۔نوشی کی جوانی سے سیٹھ صاحب نے نہ صرف اپنا بڑھاپا تابدار کیا بلکہ نوشی کے بروقت اور درست استعمال سے ڈھیروں مال بھی بنایا۔

شروع شروع میں میر صاحبنی اور سیٹھ صاحب کے درمیان لین دین کے معاملے پر کچھ تنازعہ بھی رہا پھر باہمی رضامندی سے نوشی کے دام مقرر کر دیئے گئے۔یہ سلسلہ کئی برس خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔مقررہ رقم کے علاوہ بھی سیٹھ صاحب' موڈ اور ڈیل کی مناسبت سے نوشی اور اس کے گھر والوں کو نوازتے رہتے۔پوش علاقے میں واقع نوشی کا یہ جدید گھر بھی سیٹھ صاحب کی دین ہے۔

کچھ عرصے سے نوشی کی والدہ اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں۔سیٹھ صاحب کی طرف سے ملنے والا معاوضہ انہیں مطمئن کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ وہ سیٹھ صاحب سے دوٹوک بات کرنا چاہتی تھیں جب کہ سیٹھ صاحب پکڑائی نہ دیتے تھے۔تنگ آ کر! انہوں نے ریاض کے ہاتھ اس اُمید پر پیغام بھیجا کہ اُن کی دھمکی پر سیٹھ صاحب دوڑے چلے آئیں گے کیونکہ میر صاحبنی نوشی کو سیٹھ صاحب اور اُن کے کاروبار کے لئے ناگزیر گردانتی تھیں مگر سیٹھ صاحب نے نوشی کی والدہ کے تقاضے کو اپنی بے عزتی سمجھا اور ہمیشہ کے لئے ان کے گھر سے لاتعلق ہو گئے۔

سیٹھ صاحب سے آزادی پر میر صاحبنی بہت خوش تھیں۔وہ تو کھلی ہواؤں اور آزاد فضاؤں میں اُڑنے کے لئے بیتاب تھیں۔اُنہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہ تھا کہ جس منہ کو تازہ خون کا ذائقہ لگ جائے وہ دنیا کی تمام لذتوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔میر صاحبنی نوشی کو سیٹھ صاحب کے قبضے سے آزاد کرانا چاہتی تھیں مگر اب ان کی اپنی بیٹی پر گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔کماؤ مرد نخریلا یا غصیلا ہوا کرتا ہے جب کہ کماؤ عورت زہریلی ہوا کرتی ہے۔جس کی مٹھی میں نہ صرف خاندان کی عزت نفس بلکہ ایڑی کے نیچے شوہر بھی کراہ رہا ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ میر صاحبنی کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔سیٹھ صاحب! تماش بین ہونے کے باوجود جہاں دیدہ' کاروباری اور وعدے کے پکے انسان تھے۔اُن کی چار دیواری میں نوشی ہر طرح سے محفوظ ہوا کرتی تھی مگر ہر روز نئے آدمی اور نئی گاڑی کی آمد سے میر صاحبنی کا دل دہلنے لگتا۔نوشی کے رویے میں پہلی سی سعادت مندی نہیں رہی تھی۔وہ قریب قریب خود مختار ہو چکی تھی۔اُس کی آمدنی کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔رقم ماں کے ہاتھ میں لا کر دینے کے بجائے بنک میں اپنا اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔اُس کے رہن سہن اور بول چال میں بہت بے باکی آ گئی تھی۔نت نئے ڈیزائن کے کپڑوں اور زیورات کے علاوہ ڈریسنگ ٹیبل پر ڈھیروں کے حساب سے خوشبوئیں اور میک اپ کا سامان سج چکا تھا اور اس کا زیادہ وقت شیشے کے سامنے گزرنے لگا تھا۔بات بات پر غصہ کرنا اور گھر چھوڑنے کی دھمکی دینا بھی اس کا معمول بن گیا تھا۔

میر صاحبنی بے شک اچھی عورت نہ سہی مگر ہر کام سلیقے' قرینے اور قاعدے سے کرنے کی ضرور قائل تھیں۔گھر اور بازار کے درمیانی فاصلے کو برقرار رکھنا جانتی تھیں' جو روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔کچھ عرصے سے نوشی کے معمولات میں نمایاں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ہر روز نئی گاڑی اور نئے آدمی کے بجائے' نئے ماڈل کی ایک لمبی کار تواتر سے نوشی کو لینے آ رہی تھی۔نوشی ہر شام بے چینی سے اس گاڑی کا انتظار کیا کرتی۔اُس کی تیاری کا انداز' بازاری عورت کے بجائے سگھڑ بیوی کا سا ہوتا جو روٹی روزگار کی تلاش سے تھکے ماندے شوہر کی واپسی پر اُس کی دلجوئی کا سامان مہیا کرتی ہے۔میر صاحبنی کی جہاندیدہ آنکھیں بیٹی کے انگ

انگ میں محبت کی خوشبو محسوس کر رہی تھیں اور اَن دیکھے خواب سجانے میں مصروف تھیں۔ مشرقی مائیں تو بیٹی کی اُٹھان کے ساتھ ہی بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں جب کہ میر صاحبنی کے بعد تیزی سے نوشی کا سفر بھی اندھی گلی کی جانب شروع ہو چکا تھا۔ میر صاحبنی آج خود کو تپتے ہوئے صحرا میں کھڑے اُس مسافر کی مانند محسوس کر رہی تھیں جس کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہو اور وہ اپنی راہ سے بھی بھٹک گیا ہو۔ آج مدت بعد انہیں شدت سے میر صاحب یاد آ رہے تھے۔ میر صاحبنی کو ایسا لگا جیسے میر صاحب ان کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے ہوں! ''کب تک بیٹی کو بازار کی زینت بنائے رکھو گی۔ فقیر اور منگتے بھی ساتویں ہانڈی کے بعد گھر کا رُخ کیا کرتے ہیں کیا تم اُن سے بھی گئی گزری ہو گئیں؟''۔

فون کی گھنٹی سے میر صاحبنی اس طرح چونکیں جیسے گہری نیند سے آنکھ کھل گئی ہو۔ دوسری طرف سے نوشی نے سپاٹ لہجے میں اپنے نہ آنے کی اطلاع دیتے ہوئے چند دن بعد واپسی کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میر صاحبنی گومگو کی کیفیت میں سراپا ملتجی آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے، من ہی من میں بیٹی کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگنے لگیں۔

ایک ہفتے کے بعد نوشی کی واپسی اور عابد سے شادی کا اعلان میر صاحبنی کے اوپر گرمی کے سخت موسم میں یخ بستہ پانی کی بالٹی انڈیلنے کے مترادف تھا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے پیش آمدہ خدشات وخطرات سے نوشی کو آگاہ کرنے لگیں۔ ''عابد کے بارے میں آپ کوئی ایسی ویسی بات نہ سوچیں وہ ایک شریف اور عزت دار آدمی ہونے کے ساتھ بڑے عہدے پر فائز ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے نہ صرف مجھے تحفظ دینے کا وعدہ کیا ہے بلکہ آپ لوگوں کی ذمہ داری نبھانے پر بھی آمادہ ہے۔''

کوئی شخص کتنا ہی ایماندار، بااصول اور مہذب کیوں نہ ہو، ضرورت، مصلحت یا منافقت کے تحت کبھی نہ کبھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ عابد نے بھی نوشی سے پہلی شادی کی بابت غلط بیانی صرف ضرورت کے تحت کی تھی۔ اُس کا بااختیار عہدہ اُسے بے پناہ منفعت پہنچا سکتا تھا اگر اُس کی بیوی چنٹ، چالاک اور خوبصورت ہوتی جب کہ اُس کی بیاہتا، گاؤں کی سیدھی سادھی مٹیار تھی اور تعلیم کی کمی نے اسے کبھی بھی کلچرڈ اور میریڈ شہری خاتون بننے پر آمادہ نہ کیا۔

ان دنوں پھر عابد کے دفتر میں نئی آسامیوں کی جگہ نکلی ہے جو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عابد کے قلم کی ذرا سی جنبش سے پُر ہو جائیں گی اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عابد کی گاڑی خرابی کا بہانہ کر کے گیراج میں بند کر دی جائے گی اور ہمیشہ کی طرح ہی اس بار بھی بیگم عابد کو ہر شام کسی نہ کسی سائل کے ساتھ ضروری شاپنگ پر جانا ہوگا!!

ہارن کی مخصوص آواز پھر سے میر صاحبنی کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اُن کا دل بہت سے اندیشوں اور وسوسوں کے باعث میراتھن ریس دوڑنے لگا ہے۔ وہ نوشی کو آواز دے کر پیش آمدہ خطرے سے باخبر کرنے کے لئے آواز دینے کی کوشش کرتی ہیں تو ان کی آواز ان کے منہ سے نکلنے کے بجائے دل سے نکلتی محسوس ہوتی ہے جس میں الفاظ بھی ان کے نہ تھے۔

میر صاحبنی!!! اتنی بھولی کیوں بنتی ہو۔ تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ نکاح کے دو بول پڑھنے یا پڑھانے سے کاروبار کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ تم نے اوّل روز سے میر صاحب کی دولت کے عوض خود کو فروخت کر کے اپنی نسل کو غلاظت کے جس کاروبار پر لگایا ہے اُس کا نصب العین حصولِ زر ہے۔ اس کاروبار میں ریاض، سیٹھ صاحب یا عابد کی تمیز وقت کا ضیاع ہے!!!

- بقیہ -

''گھٹن بھری دھند''

''مجھے تم سے کوئی اُمید نہیں، جانے کون سے موڑ پر اپنے سپنوں کے محل بنانے کے منصوبے گھڑتے ہو جو ایسے خیال تمہارے ذہن کو تاریک کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے۔ اب تم اندھیرے میں رہنے کے عادی ہو گئے ہو۔ روشنی تمہارے کس کام کی! میں آپ کی طرح کائر انسان کا سایہ نہ خود پر نہ اپنے بچے پر پڑنے دوں گی۔ ایک اور بات ضرور سن لو مجھے نہ تمہارے سہارے کی ضرورت ہے اور نہ میرے بچے کو تمہارے نام کی!'' دیپا سچ کہتی ہوں میں نے اس دن اس کائر انسان کو دیکھا جو گناہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہے اور معافی بھی مانگتا ہے تو اپنا حق سمجھ کر۔ پتہ ہے پھر کیا ہوا؟ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اپنی قمیض جھٹکی اور بالوں کو سنوارتا ہوا دو قدم آگے گیا اور پھر رک کر کہنے لگا۔

''ارپا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا''

انسانیت جہاں اپنے معنوں پر پوری نہیں اترتی شاید وہیں جوابداری کا اختتام ہو جاتا ہے۔ اب بھی سوچتی ہوں کہ کیا اس کے ساتھ جڑی ہوئی زندگانیوں کے ساتھ بھی وہ اُسی طرح نبھائے گا؟ کیا عورت کی خود اعتمادی کو اپنے فریب، بغض اور مکاری سے رسوا کرتا رہے گا؟ اپنے مفاد کے آگے معصوم، بے گناہ مسکراہٹ کو سانس لینے سے پہلے ہی یوں گھٹن بھری سزا کا حق دار بناتا رہے گا؟ یہ سوال بجلی کی مانند میرے دماغ میں گونج گئے۔ جن کے جواب آنے والے کل میں یہ معصوم زندگی ہم سے طلب کرے گی۔ جب وہ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آئے گی؟

تمہاری سہیلی، ارپا۔

''سچّی خوشی''

شگفتہ نازلی (لاہور)

(مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے)

ہر طرف پھیلی تھی تنہائی بہت
رات بھر روئی تھی شہنائی بہت

رات بھر کے جاگنے سے یہ ہُوا
سارا دن پھر نیند تھی آئی بہت

اُن کے ملنے سے ہمیں کچھ یوں لگا
جیسے ہو سچی خوشی پائی بہت

جس قدر چاہا تھا سب کچھ بھُولنا
اُس قدر ہی یاد پھر آئی بہت

کتنی ہی تو صورتیں تھیں آس پاس
صورت اُن میں اِک مگر بھائی بہت

پھر بھی خنکی کم نہیں ہو پائی تھی
گو کہ ہم نے آگ دہکائی بہت

اور اگر نہ ہی کریں تو خوب ہو
آپ کے احساں سے بھر پائی بہت

ہم کو بے حد منفرد سا تھا لگا
گرچہ لہجے میں تھی کجرائی بہت!

○

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ، بھارت)

یہ قریہ شہر میں رہنے لگا ہے
مسلسل زہر میں رہنے لگا ہے

سمندر بن گیا ہے کس کا آنسو
جو اکثر قہر میں رہنے لگا ہے

نکلتا ہی نہیں کیوں خود سے باہر
بدن کے دہر میں رہنے لگا ہے

عجائب میں اسے گن لو کہ اب تو
سمندر نہر میں رہنے لگا ہے

نہیں قطرے کو خوفِ خشک یعنی
بھری دوپہر میں رہنے لگا ہے

انا کی زد میں وہ آیا ہے جب سے
بلا کی لہر میں رہنے لگا ہے

رئیس اس عہدِ حاضر کے کرم سے
اندھیرا مہر میں رہنے لگا ہے

○

منظور ثاقب (فیصل آباد)

اس لیے میری محبت ہے ارادت ہے غزل
تیری مخمور نگاہوں کی عنایت ہے غزل

شعر ہوتے ہیں تو لگتا ہے مرے پاس ہے تُو
اس لیے شام و سحر میری ضرورت ہے غزل

اس کے شعروں میں جھلکتا ہے سراپا تیرا
تیری صورت ہے غزل تو تیری سیرت ہے غزل

ایک خوشبو سی بسی رہتی ہے خُلیوں میں مرے
جسم میں میرے لہو ہے کہ سرایت ہے غزل

خوبی و عیب سر بزم جہاں کہتا ہوں
میری کمزوری غزل ہے میری طاقت ہے غزل

دل کے تاروں کے لیے صورتِ مضراب ہے یہ
ہو اگر سر میں نہائی تو قیامت ہے غزل

ہر زمان بولے گا سر چڑھ کے غزل کا جادو
حسبِ حالات ہے اور دل کی روایت ہے غزل

فیصلہ منصفِ دل نے یہ سنایا ثاقب
جزو ایماں ہے غزل جزو شریعت ہے غزل

عارف شفیق

(کراچی)

مجھ سے کنارا کر گیا اندر کا آدمی
تالاب میں تھا قید سمندر کا آدمی

سائے کو اپنے قد سے بڑا دیکھ کر ہوں خوش
میں ڈھونڈتا تھا اپنے برابر کا آدمی

ہے ٹوٹ کر بکھرنا ہی اس کے نصیب میں
شیشے کا آدمی ہو کہ پتھر کا آدمی

حق مار کر ہمارا سکندر بنا تھا وہ
خود کو جو کہہ رہا تھا مقدر کا آدمی

کیسے بھلا بچے گا وہ لفظوں کے تیر سے
ہر وار روک سکتا ہے خنجر کا آدمی

کٹھ پتلیوں کا کھیل ہے یہ دھوپ چھاؤں کا
ہر آدمی ہے اپنے مقدر کا آدمی

اڑتا ہے آگ پانی کی تاثیر اوڑھ کر
اپنی ہوا میں خاک کے پیکر کا آدمی

انجام زندگی کا ہمیشہ سے موت ہے
آغاز سے اسیر ہے اس ڈر کا آدمی

عارف شفیق کھوکھلی بنیاد جس نے کی
سب جانتے ہیں وہ تھا اسی گھر کا آدمی

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

آجتک رکھا نہیں شاد ہمیں
روز کرتا ہے برباد ہمیں

سب ہی اپنی اپنی خوشیوں میں ہیں مگن
کون رکھتا ہے بھلا یاد ہمیں

دیکھنا ہے آپ کے ظلم و ستم
آہ کرنی ہے نہ فریاد ہمیں

بات کچھ تو ہے مرے شعروں میں
دے رہے ہیں داد پر داد ہمیں

فلسفہ کیا کیا پڑھاتے ہیں اب
یہ ادب کے سارے نقاد ہمیں

رہنما سارے کہاں ہیں سیفی
چھوڑ کر تنہا وہ آزاد ہمیں

○

اسد اعوان

(سرگودھا)

کون سنتا ہے محبت کا فسانہ پہلے
اپنا حق مانگتا ہے سارا زمانہ پہلے

ہم ترے شہر میں پھرتے تھے کھلی سڑکوں پر
ہر گلی کوچے میں تھا اپنا ٹھکانہ پہلے

میری جانب سے جدائی کا تجھے ڈر ہے مگر
راہِ الفت میں مجھے چھوڑ نہ جانا پہلے

ہم تو حالات کی زنجیروں میں ہیں جکڑے ہوئے
تُو نہ ملنے کا سنا ہم کو بہانہ پہلے

اُس کی محفل میں نئے یاروں کی شرکت ہے مگر
اُس نظروں میں تو ہے یار پرانا پہلے

ہر کوئی جاتا ہے عشق میں مقتل کی طرف
ہم ہوئے فرطِ محبت میں روانہ پہلے

○

تصور اقبال
(اٹک)

گھر سے وہ بے حجاب تھا ایسے نکل پڑا
نیت میں سر پھروں کی بہت ہی خلل پڑا
گردن میں کون جانتا ہے کیسے بل پڑا
برسیں جو اُس پر لاٹھیاں تو سچ اُگل پڑا
محفل میں اُن کے ساتھ مجھے دیکھ کیا لیا
اتنی سی بات پر وہ اچانک اُچھل پڑا
اپنے تئیں مدد کو پکارا تھا اُس نے بھی
میں ہو کے بے نیاز رُکا اور چل پڑا
روکو نہ اس کو آج یہ پیاسا تھا دید کا
بچہ ہے اس نے چاند کو دیکھا مچل پڑا
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر جو ایک تھا
جب یاد اُن کی آئی تصوّر اُبل پڑا

○

حفیظ انجم کریم نگری
(بھارت)

آپکی میں آپکی آواز ہوں
ہاتھ میں لے کر غزل کا ساز ہوں
کج کلا ہو دور ہے منزل مری
میں بھی اک انجام کا آغاز ہوں
مجھکو جانا ہے خرد کے بام پر
کوئی کیا سمجھے پرِ پرواز ہوں
کون ہوں کیا ہوں نہیں میں جانتا
راز ہوں اک راز ہوں اک راز ہوں
اسطرح آنکھیں دِکھانا چھوڑ دے
اے ستم پرور ترا غمّاز ہوں
اک ادھورا خواب ہوں اپنے لیے
آپ کے حق میں تو میں اعجاز ہوں
حسنِ ظن کی یہ نمائشی خوب ہے
آپکا انجم ہوں میں ہمراز ہوں

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

نہیں معلوم کس کس کا ہدف تھا
میں تنہا جب تلک تیری طرف تھا
یقیں کرتا میں ویرانی پہ کیسے
میں تعمیرِ چمن میں صف بہ صف تھا
بنا کاغذ پہ، جینے کا سبب وہ
وگرنہ مدتوں حرفِ تلف تھا
بنانا دل میں گھر، عمدہ ہے لیکن
میں اس منصب سے کب تک برطرف تھا
وفا داری تھی میرے خوں میں شامل
میں سچائی کی خاطر سربکف تھا
جو بے چینی میں دن گزرے تھے میرے
غمِ دوراں کا شاید میں ہدف تھا

○

وشال کھُلّر (لدھیانہ، بھارت)

خود سے گزرے گا تو پھر وہ بھی خلا مانگے گا
میرے باطن کا شناسا تو ہوا مانگے گا
راگ چھیڑے تو سہی رات کا جنگل مجھ میں
میری ہستی کا بیاباں بھی دُعا مانگے گا
جس میں تیری نہ رضا ہو میں اُسے ترک کروں
لفظِ خاموش سے احساس صدا مانگے گا
اس سے بچھڑا ہوں، بچھڑنے کا الگ موسم ہے
وصل کا میگھ سمندر سے گھٹا مانگے گا
رات کی رات بچھاؤں میں اجالا لیکن
چاند تاروں سے یہاں کون ردا مانگے گا
دل نے کیوں حسرتِ جاناں کے جلائے ہیں چراغ
کون اس در سے مری جان صلا مانگے گا

○

ابراہیم عدیل (جھنگ)

کوئی زمیں تو کوئی آسماں سمجھتا ہے
ہماری بات زمانہ کہاں سمجھتا ہے
وہ سینچتا ہے تمنّا کی سوکھتی کھیتی
ہمارے خوں کو وہ آبِ رواں سمجھتا ہے
تری جدائی کے موسم مہک رہے ہیں جہاں
مریضِ عشق اُسے گلستاں سمجھتا ہے
ہوا کے ہاتھ میں رکھنا ہے کیسے ہاتھ اپنا
یہاں یہ بات فقط بادباں سمجھتا ہے
تمام شہر مٹا کے چلا گیا سیلاب
تو ایسے کرب کو اب تک گماں سمجھتا ہے
بلا کے شور میں چُپ سادھ لی پرندوں نے
کہاں ہے وہ جو یہ طرزِ بیاں سمجھتا ہے
عجیب دکھ کے نگر سے گزر کے آیا ہے
وہ بوئے گُل کو بھی آہ و فغاں سمجھتا ہے
یہ دل کا آئینہ کیسے بچا سکے گا عدیلؔ
مزاجِ سنگ دلاں تو کہاں سمجھتا ہے

○

آفتاب خان (لاہور)

اُتارنا تھا خلا میں کسی پرندے کو
وہ لے گیا ہے قضا میں کسی پرندے کو
درخت بھیگ چکے تھے سبھی مگر میں نے
چھپا لیا تھا قبا میں کِسی پرندے کو
اُسے بھی سانپ نے ڈسنا ضرور ہے اک دن
جو زہر دے گا دوا میں کِسی پرندے کو
اگر شکاری درندہ شکار کر نہ سکا
تو مار دے گا انا میں کِسی پرندے کو
قفس میں خوف سے گردن جھکائے بیٹھا تھا
اُڑا دیا ہے ہوا میں کِسی پرندے کو
جو بچ گئے تھے نوالے امیر زادے سے
وہ دے دیئے ہیں عطا میں کِسی پرندے کو
کبھی اڑان کو سائے سے ڈر نہیں لگتا
مِلی حیات فنا میں کِسی پرندے کو
جو دھوپ چھاؤں ملے آفتاب سے یکساں
مِلا وہ ظرف ادا میں کِسی پرندے کو

○

پرویزمظفر

(برمنگھم)

جب دیکھا ہمیں حالِ پریشان میں دیکھا
کیا تم نے کبھی اپنے گریبان میں دیکھا

انسان میں دیکھی ہے فرشتے کی صفت بھی
پھر ہم نے درندہ اُسی انسان میں دیکھا

انگلینڈ میں جس طرح کی پریاں نظر آئیں
منظر کبھی ایسا نہ پرستان میں دیکھا

اعمال تو اعمال ہیں نیّت کا اثر بھی
اللہ کے انصاف کی میزان میں دیکھا

پل بھر کے لیے شاخوں پہ لہرائے تھے پرویزؔ
پھر ہم نے اِنہیں پھولوں کو گلدان میں دیکھا

○

مالک سنگھ وفا

(جموں، کشمیر)

اہلِ دنیا کے لیے شاہکار بن
زندگی میں ایسا اک فنکار بن

جو بھی چلنے والے ہیں چلتے رہیں
تُو نہ ہرگز راہ میں دیوار بن

داستاں جس سے سنور جائے کچھ اور
داستاں کا ایسا اک کردار بن

رنج۔غم۔راحت۔خوشی اور کچھ بھی نہیں
کوئی عالم ہو مگر خود دار بن

دھوپ میں سارے ہوں تجھ سے فیض یابؔ
ہو سکے تو سایۂ دیوار بن

تجھ پہ حرف آئے نہ کوئی اے وفاؔ
تُو نہ دنیا کے لیے آزار بن

ہر کوئی دے گا دُعائیں اے وفاؔ
زندگی میں سب کا تُو غم خوار بن

جو اُتر جائے ہر اک دل میں وفاؔ
تُو غزل کا مطلعِ انوار بن

○

شائستہ سحر

(میرپورخاص)

ہے راستہ طویل تر رات بھی
ہر قدم پہ تیرگی کی گھات بھی

اپنی ہی تلاش میں ہوں سرگراں
عجیب سی ہے کچھ یہ واردات بھی

مجھ کو انتظارِ مرگِ ناگہاں
کہ یہی ہے صورتِ نجات بھی

ہر نفس ہے موت کے حصار میں
ہے زیست استعارۂ ممات بھی

کب ہے مجھ میں یارا تیری دید کا
چشم تشنۂ تجلیات بھی

موجِ عشق جو مرے لہو میں ہے
تو رقص میں ہے ساری کائنات بھی

میں نے خود کو کھو پا لیا ہے اب
جیت ہے یہی میری اور مات بھی

نسیمِ صبح کا ملن بہار سے
جھوم اٹھی ہے سحرؔ حیات تھی

○

سبھاش گپتا شفیق

(گڑھد یوالہ، ہوشیار پور، بھارت)

تیری نگاہ غزل کی کتاب ہے کوئی — میری حیات اسی کا ہی باب ہے کوئی

میں اسکے دھیان میں رہتا ہوں ہر گھڑی ہر پل — یہ سوچ کر کہ یہ کار ثواب ہے کوئی

وہ میرے پاس بھی بیٹھا اور اٹھ کے چل بھی دیا — میں سوچتا تھا کہ شاید یہ خواب ہے کوئی

کھلے دروں پہ بھی دیتا رہا ہوں میں دستک — میرے جنوں کا بھی صاحب جواب ہے کوئی

جو ہو سکے تو کبھی دیکھ داغ اور کانٹے — وگرنہ چاند ہے کوئی گلاب ہے کوئی

○

علی شاہ

(بھکّر)

باغ کو دیکھ مچا دیتے ہیں اکثر دھوم پرندے — طوفانوں کا کیسے سمجھیں گے مفہوم پرندے

تنہائی کی قید میں زندہ رہنا کتنا مشکل — قفس میں آخر مر جاتے ہیں کچھ محکوم پرندے

فلک کو چھونے کا مضبوط ارادہ باندھ رہے ہیں — مسجد کے مینار پہ بیٹھے نا معلوم پرندے

کھیتی کھیتی ڈالی ڈالی ظلم کے جال بچھے ہیں — ایسی باتیں کیسے جانیں یہ مظلوم پرندے

ظالم کے مذموم مقاصد خاک میں مل گئے آخر — سانپ کو دیکھ کے یکجا ہو گئے سب معصوم پرندے

○

محمد شریف شیوہؔ

(لاہور)

کب تلک میرے چراغوں کو بجھائے گی ہوا — ہے یقیں، راس کسی روز تو آئے گی ہوا

جب تلک ہوں میں دِیا، سر پہ رہے گی یہ سوار — بن گیا مہر تو پھر آنکھ چرائے گی ہوا!

شمعِ دل میں نے جلا دی ہے اندھیرے گھر میں — دیکھتا ہوں کہ اِسے کیسے بجھائے گی ہوا!

جب تلک مجھ میں لچکنے کا ہنر ہے باقی — اُتنا اُبھروں گا، مجھے جتنا جھکائے گی ہوا

دے گئی ایسی تھکن، چاند کو چھونے کی لگن — پَر ہیں بے جان، یقیں ہے کہ گرائے گی ہوا

جانے کس روز، مہک تیری جلو میں لیکر — تیرے آنے کا پتہ مجھکو بتائے گی ہوا

شاخ سے ٹوٹ کر مشکل ہے اماں سے رہنا — اُڑنا ہو گا مجھے جس سمت اڑائے گی ہوا

ریت پر نقش بنانے کا یہ ہو گا انجام — جو بھی صورت میں بناؤں گا مٹائے گی ہوا

کر دیئے میں نے کرپشن کے سبھی گُل دیپک — جانے کس روز یہ اعلان کرائے گی ہوا

جب سرِ بام وہ آئیں گے نہا کر شیوہؔ — دُھوپ چومے گی بدن، زلف سکھائے گی ہوا

○

''فرشتے اور شیطان''

ڈین براؤن کے ناول سے منتخبہ

یوگیندر بہل تشنہ

(امریکہ)

تمہید

دنیا کی سب سے عظیم سائنس کی لیباٹری سویٹزلینڈ میں CERN

COUNCIL OF EUROPEAN RESEARCH NUECLEAR

کونسل آف یورپین ریسرچ نیوکلیر۔ آخرکار اینٹی میٹر ANTI MATTER کی کھوج میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس دریافت کا ایک قطرہ نیویارک کے پورے شہر کی ایک دن کی برقی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہل ہے۔ اور اس نئی ایجاد (ANTI MATTER) اینٹی میٹر کا ایک گرام ہیروشیما پر گرائے گئے ایٹم بم سے بھی زیادہ بربادی کی قوت رکھتا ہے۔ جو سو سال تک اثر پذیر رہے گا۔ اس کو بے حد حفاظت کے ساتھ ایک خاص قسم کی بیٹری کی قوت سے ایک کینسٹر CANISTER میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے پھٹنے سے کسی قسم کی آلودگی، گندگی وغیرہ نہیں پھیلتی اور نہ ہی یہ کسی قسم کی ریڈیائی کرنیں پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ کسی بھی شے سے ٹکرانے سے یہاں تک کہ ہوا کے لگنے سے پھٹ سکتا ہے۔ اس کو سائنسدان لیونارڈو ویٹرا اور اس کی بیٹی وٹوریا نے مل کے ایجاد کیا ہے۔ LEONARDO VETRA اور VITORIA۔ جس سائنس دان نے اس کو ایجاد کیا ہے اس کا قتل ہو چکا ہے اور جو پاس ورڈ (PASSWORD) اس کی داہنی آنکھ میں محفوظ تھا اس کو احتیاط سے نکال کر اس اینٹی میٹر کو چوری کر لیا گیا ہے۔ اور بڑی سرعت سے (VATICAN CITY) ویٹی کن سٹی میں پہنچا دیا گیا ہے اور ایک گرجے میں چھپا دیا ہے۔ جس کے پھٹنے کی معیاد محض چھ گھنٹے ہے جس کے پھٹنے سے ویٹی کن سٹی نیست و نابود ہو جائیگی۔

لیونارڈو ویٹرا کا قتل کرنے والے گروہ نے اس کے سینے پر گرم گرم لوہے کی مہر سے اپنا پہچان کا نشان لگا دیا ہے۔ الیومنٹی (ILLUMINATY)۔

اس نشان کی کھوج کے لیے ہارورڈ کے خاص ماہر نشان پروفیسر کو بُلایا گیا ہے۔ لینگڈن (LANGDON) جو اس کی بیٹی وٹوریا کے ساتھ مل کر اس کی کھوج کریں گے۔ سائنسدان لیونارڈو ویٹرا (LEONARDO VETRA) نے گوشت کے جلنے کی بُو سونگھی اور اس کو معلوم تھا کہ یہ اُسی کے گوشت کے جلنے کی ہی بُو ہے۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے سیاہ فام شکل کو دیکھا جو اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

''تمہیں کیا چاہیے، اس نے اُس سیاہ فام صورت کی جانب دیکھا۔

''پاس ورڈ'' اُس کی کھردری سی آواز فضا میں لہرائی۔

''لیکن میں وہ۔۔۔۔''

سیاہ فام شخص نے گرم گرم لوہے کی سیل کو اور زور کے ساتھ دبایا۔ اُس کے سینے میں گوشت سے ''ہس'' کی آواز آئی۔ گوشت جل رہا تھا۔ ویٹرا درد سے چلایا۔ ''اس کا پاس ورڈ کوئی نہیں ہے'' اس نے چلا کر کہا۔ اور وہ آہستہ آہستہ بے ہوشی کی جانب اُترنے لگا۔ سیاہ فام صورت نے کہا، مجھ کو معلوم ہے تم یہی کہو گے۔ ویٹرا نے اپنے حواس قائم رکھنے کی کوشش جاری رکھی مگر وہ سیاہ فام آدمی اُس کے اور قریب ہوتا چلا گیا۔ اور پھر ایک لمحے میں اس نے اس کی داہنی آنکھ میں تیز دھار کے چاقو سے بڑی ہی سرجیکل چابکدستی سے اس کی آنکھ نکال لی۔

''خدا کے لیے۔۔۔'' مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھ نکالی جا چکی تھی۔

ہزاروں میل دُور دو شخص گفتگو کر رہے تھے۔ اندر اندھیرا تھا۔ جو شخص انچارج تھا اس نے دوسرے شخص سے پوچھا۔ ''کیا تم کامیاب ہوئے ہو''، ''جی ہاں'' اُس کے لفظ چٹان کی طرح سخت تھے ''ادھر کسی کو کوئی شک تو نہیں گزرے گا کہ کس نے کیا ہے''، ''نہیں کسی کو بھی نہیں۔'' ''بہت اچھے، کیا تمہارے پاس ہے جس کے لیے تمہیں بھیجا تھا۔ دوسرے شخص کی آنکھیں چمکیں اور اُس نے ایک برقی آلہ میز پر رکھ دیا۔

''تم نے بہت اچھا کام کیا ہے'' برادر ہڈ کام آنا بہت اچھی بات ہے۔

''جاؤ۔ آرام کرو۔۔۔۔''

اپاسلک پیلس (APOSTOLIC PALACE) کئی بلڈنگوں پر مشتمل ہے جو کہ کرسٹین گرجے کے قریب میں واقع ہے۔ ویٹی کن سٹی (VATICAN CITY) کے شمال مشرق میں ہے جو سینٹ پیٹر سکوائر (ST. PETER) سے صاف نظر آتا ہے یہ پیلس روم کے چیف پادری (پوپ) کے لیے بنایا گیا ہے یہیں پر اُس کی رہائش گاہ ہے اور آفس بھی۔

لینگڈن جو آواز کی رفتار سے بھی پندرہ گناہ تیز رفتار طیارے میں امریکہ سے بلایا گیا ہے وہ سائنسدان کی بیٹی وٹوریا کے ہمراہ الیومیٹی کے نشان اور اینٹی میٹر کے سلسلے میں ویٹی کن سٹی، کمانڈر اولی وٹی (OLI VETI) کے ہمراہ پوپ کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہیں۔ لینگڈن کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ دنیا کے کرسچن مذہب کے عظیم راہنما (راہنمائے اعظم کی مقدس رہائش گاہ پہ کھڑا ہے اور ہال سے گزرتے ہوئے الابستر فوارے (ALABASTER FOUNTAIN) کے قریب کھڑا ہے۔ اولی ویٹی کمانڈر بائیں جانب مڑا اور ایک دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے ایک دیو قامت دروازے پر آ ٹھہرا لینگڈن کے گمان میں بھی اس قدر بلند دروازے کو زندگی میں پہلے کبھی دیکھا ہو۔

کسی نے اندر سے آواز لگائی اور جب دروازہ کھلا تو لینگڈن کو سامنے چکاچوند کر دینے والی روشنی کے لیے آنکھوں کو ہاتھوں کا پردہ دینا پڑا کہ یہ سورج کی روشنی کی طرح تیز تھی۔ پوپ کا آفس ایک بے حد کشادہ ناچ کا ہال نظر آ رہا تھا۔ سُرخ رنگا فرش ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا تھا۔ اور ایک بہت بڑا جھومر (CHANDLIAR) چھت سے لٹک رہا تھا۔ ہال کی دیواروں میں بہت ساری دیوقد کھڑکیاں تھیں جو ہال کے منظر کو حیران کن بنا رہی تھیں۔

کمانڈر اولی ویٹی نے نہایت مؤدبانہ انداز میں ایک شخص کو مخاطب کیا۔

''جناب یہ لینگڈن اور وٹوریا ہیں، محترمہ کے لباس کے لیے معذرت خواہ ہوں''

اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے کمانڈر کو الگ کر دیا اور دونوں مہمانوں کی جانب دیکھنے لگا۔ لینگڈن حیران ہو رہا تھا کیونکہ یہ کسی عمر رسیدہ پادری کے لبادے میں ہاتھ میں تسبیح لیے پادری کی طرح کمزور و ناتواں نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ اس کے برعکس ایک سیاہ رنگ لبادہ زیب تن کئے ایک جو اُس کے قد بُت سے مطابقت رکھتا تھا یقیناً ویٹی کن سٹینڈرڈ کے طور سے ایک خوبرو جوان لگتا تھا۔ اُس کے چہرے سے نور چھلک رہا تھا۔ اُس کے بھورے بال اور نیلی چمکتی آنکھیں ایسے لگیں جیسے اُن میں کئی راز پوشیدہ ہوں۔ قدرت کے راز۔۔۔ نہاں ہوں۔ وہ شخص ذرا اور قریب آیا اور اُس نے کہا۔

''میں کارلو ین ٹریسکا (CARLO VENTRESCA) ہوں۔ وہ تیس پینتیس کا لگتا تھا۔ لینگڈن نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص کافی تھکا سا لگا ہے۔ کیونکہ پچھلے عشرہ بہت مصروفیت میں گزرا تھا۔ اس کی انگریزی زبان نہایت خوبصورت اور پیاری من موہک تھی۔ میں مرحوم پوپ کا افسرِ اعلیٰ ہوں۔ اس کی آواز مہربان اور شفقت سے پُر تھی۔ جس میں اٹلی کے باشندے کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وٹوریا نے ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا کہ ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں وقت دیا، ہمیں ملاقات کی اجازت دی۔

کمانڈر اولی ویٹی نے آگے بڑھ کر مداخلت کی کوشش کی کہ اس محترمہ کے لباس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ لینگڈن نے جھک کر سلام کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے اُسے کمر سے پکڑ کر اٹھایا اور گویا ہوا کہ افسرِ اعلیٰ (CAMERLENGO) نے کہا یہ مقدس آفس مجھے ہرگز مقدس نہیں بناتا۔ میں تو صرف ایک پادری ہوں۔ اعلیٰ افسر تو صرف فرض نبھانے کے لیے۔ برائے کرم آپ تشریف رکھیے لیکن اولی ویٹی کمانڈر نے کھڑے رہنا پسند کیا۔ کیمرلنگو (CAMERLENGO) اپنے ڈیسک پر بیٹھ گیا۔

کمانڈر اولی ویٹی نے پھر دہرایا ''جناب اس محترمہ کا لباس میری غلطی ہے'' میرا تعلق اُن کے لباس سے نہیں ہے۔ سختی سے کہا اُس نے۔ میرا تعلق ہے کہ یہ تمہارے سیکورٹی آفس سے مجھے فون پر ایک بم کے خطرے سے آگاہ کر رہی ہے۔ اور مجھے اس کی اطلاع نہیں ہے۔ میرا تعلق ہے کہ جب آدھے گھنٹے میں پوپ چنے جانے کی سبھا کا آغاز ہو رہا ہے۔ میرا تعلق اُن کی حفاظت سے ہے۔ اولی ویٹی کمانڈر اوسان باختہ ہو رہا تھا۔ کمانڈر اولی ویٹی ایک بُت کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا۔ اور ایسے سیدھا کھڑا ہو گیا جیسے اُس کا معائنہ ہو رہا ہو۔

کیمرلنگو (CAMERLINGO) اس وقت ہیرو لگ رہا تھا۔ بارعب، مگر تھکا تھکا۔

''جناب آپ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ آپ کے اور بہت ضروری کام ہیں۔''

''میں اپنا فرض جانتا ہوں۔ میرا تعلق سب کی حفاظت کا ذمہ ہے اور کہ خفیہ جلسہ مناسب طور سے چل رہا ہے۔ یہ میرا تعلق ہے''

لینگڈن نے ایک مڑا ہوا فیکس (FAX) کا کاغذ کیمرلنگو کی جانب بڑھایا جونہی کیمرلنگو نے فیکس کو ہاتھ میں لیا اُس نے کمانڈر اولی ویٹی کو اگنور IGNORE کر دیا۔

''پلیز'' کمانڈر اولی ویٹی نے پھر مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ فادر ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں''

کیمرلنگو نے فیکس کو دیکھا اور پوچھا یہ کون ہے۔ اُس نے لیونارڈو ویٹرا (LEONARDO VETRA) کی لاش دیکھی۔ جناب یہ میرے والد ہیں۔ جن کا قتل ہوا ہے (ANTI MATTER) ان ہی کی ایجاد ہے۔ وٹوریا نے کہا۔ مگر نہ جانے کس کو اس کی بھنک پڑ گئی اور ان کا قتل کر دیا گیا۔

''میرے بچے مجھے افسوس ہے'' پادری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کون یہ کر سکتا ہے۔ اس نے نشان پر دھیان دیا۔ یہ نشان تو ایلومینٹی کا ہے۔ (ILLUMINATI) میرا خیال ہے آپ نشانی سے واقف ہوں گے۔ لینگڈن نے کہا۔ اور کیمرلنگو لینگڈن کی جانب دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی نظروں سے اس کو یقین نہیں ہو رہا تھا یہ تو مر چکے ہیں اور یہ جماعت تو (گروہ) تو ختم ہو چکا ہے۔ یہ جماعت ختم ہو چکی ہے اور یہ تاریخی سچائی ہے۔

مگر جناب اگر آپ کل یہ بات کہتے تو میں مان لیتا مگر آج جب یہ ہمارے سامنے ہے اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طور سے اپنی مہم جاری رکھے ہیں۔ تاکہ یہ اپنا پُرانا پیکٹ (PACT) زندہ کر سکیں۔

''معاف کرنا'' کونسا پرانا پیکٹ (PACT) کیمرلنگو نے کہا۔ میری تاریخ کی جان کاری زنگ آلود ہو چکی ہے۔

DESTRUCTION OF VATICAN CITY

''ویٹی کن سٹی کی تباہی''

''لیکن یہ تو ناممکن ہے'' کیمرلنگو نے کہا۔

وٹوریا آگے بڑھ کر کہنے لگی۔ ''مجھے افسوس ہے، میرے پاس ایک اور بُری خبر ہے'' کیمرلنگو نے لینگڈن اور وٹوریا کی جانب حیران کن نظروں سے دیکھا۔

کمانڈرراولی ویٹی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا''جناب یہ کوئی فراڈ ہے، آپ اس پر دھیان نہ دیں۔''

''لینگڈن میری زندگی کیتھولک چرچ (CATHOLIC CHURCH) میں گزری ہے۔اور میں جانتا ہوں میں آپ کومحتاط کررہا ہوں میں آج کا آدمی ہوں۔''عیسائیت کے بہت سے دشمن ہیں ان کو جن بھوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔کوئی حاجت نہیں''

''جناب یہ نشان بالکل ٹھیک ہے میں نے ہر طرح سے اس کا معائنہ کیا ہے۔

''کیا یہ سچ ہے'' کیمرلنگو نے وڈوریا سے نظریں ہٹاتے ہوئے کمانڈرراولی ویٹی سے دریافت کیا۔

''جناب میں اقرار کرتا ہوں کہ کسی قسم کا برقی آلہ کوئی اندر ہے جس کو کیمرہ پر دیکھا جاسکتا ہے۔سیکورٹی کے کیمرے پر نظر آ رہا ہے مگر جس قدر یہ اُس کو خطرناک بتا رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ میری عمر گزر گئی ہے خطرناک ہتھیاروں کا مطالعہ کرتے کرتے،میرا مطالعہ بہت زیادہ ہے۔

''ٹھہرو،اس کو فوراً حاصل کرو خطرناک ہے یا نہیں۔اس کو چھوڑ دو''

جناب یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ کہاں ہے اس کی کھوج کرنا اس وقت ناممکن ہے،اولی ویٹی کمانڈر بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ایک فوجی کی طرح۔

''کیا یہ ویٹی کن سٹی کے اندر ہے؟'' کیمرلنگو نے دریافت کیا۔

''جناب یہ ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ہماری دیواریں اس قدر مضبوط ہیں اور بجلی کے آلوں سے لیس کہ کسی شے کے اندر آنے کا امکان نہیں۔''

''اس کو فوراً ڈھونڈو'' کیمرلنگو نے سختی سے کہا۔

''حضور یہ ممکن نہیں کہ اس کو فوری طور سے دستیاب کیا جا سکے۔ کیونکہ اور بھی بہت سے کام ہیں سیکورٹی ہے۔اور یہ محترمہ جس قدر خطرناک اُسے بتا رہی ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ ایک گرام پورے شہر کو تباہ و برباد کر دے، نیست و نابود کرسکتا ہے۔ میرا تجربہ ان خطرناک ہتھیاروں کا بہت زیادہ اور اعلیٰ ہے،بم وغیرہ کے سلسلے میں۔

''تمہارا تجزیہ فرسودہ ہے، ناکارہ ہے۔ آج کے دور میں بے پناہ خطرناک ہتھیار بم بنائے جا چکے ہیں۔اور یہ تو میری اور میرے والد کے ساتھ کی مشترکہ ایجاد ہے اس کی تباہی کا اندازہ تم لگا ہی نہیں سکتے۔ میڈم وڈوریا کی آواز گرج رہی تھی اور بے حد غصے میں بولے جا رہی تھی۔اس وقت میری پوشاک پر نا جاؤ جو تمہاری نظر میں شروع سے ہی کھٹک رہی ہے میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں کہ رات کے بارہ بجے سے پہلے اس کو حاصل نہ کیا گیا تو تمہارے پاس رکھوالی کے لیے ایک بہت گہرا سوراخ رہ جائے گا مگر تم بھی اور تمہارے اہلکار بھی کہاں بچیں گے سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور سو سال تک اس کا اثر رہے گا''

کمانڈرراولی ویٹی کی کیڑے جیسی آنکھیں غصّے اور خوف سے کانپ رہی تھیں۔

''جناب میں اور زیادہ نہیں سن سکتا۔آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے حضور!ان کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے''

''خطرناک یا خطرناک نہیں'' خفیہ مجلس چل رہی ہے اور تمہاری حفاظتی بالکل نہیں ہے اس کو فوراً ڈھونڈو۔۔۔''

جناب ایسی کوئی بات نہیں ہے میں نے بموں کے تمام تر ذخیرے الگ الگ بغور مطالعہ کیے ہیں''۔

کیا تم نے انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPEDEA) میں ''A'' کے اندارج میں دیکھا ہے یہ نہایت ہی خطرناک ہے۔

اسی اثنا میں کمانڈرراولی ویٹی کے ایک نیچے کے افسر (ماتحت افسر نے) مداخلت کی اور کہا۔

جناب میں نے آن لائن اسے پڑھا ہے اس کے بارے میں جو معلومات مجھے ملیں وہ یہی ہیں کہ یہ واقعی بے حد خطرناک ہے۔ یہ کئی سوکلوگرام بم سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ANIT MATTER ذرا سی ہوا لگنے سے پھٹ سکتا ہے اور اس کی احتیاط نہایت ضروری ہے۔''

اولی ویٹی بھڑک اٹھا اور کیمرلنگو سے مخاطب ہوا۔

میں نے تمہارے پوپ کو بارہ سال نوکری دی اور اس سے پہلے پوپ کے ساتھ چودہ سال کی سروس دی ہے۔ سوس گارڈ SWISS GUARD بڑی ایمانداری سے اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔

اتنی دیر میں کمانڈر اولی ویٹی کی واکی ٹاکی(WALKY TALKY) کی گھنٹی بج اُٹھی۔ دوسری جانب سے اُس کا ماتحت کہہ رہا تھا کہ صاحب ابھی ابھی بم رکھنے کا فون آیا ہے اور وہ صرف کیمرلنگو سے ہی بات کرنا چاہتا ہے اور اُس نے مزید کہا ہے کہ رات بارہ بجے تک سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ ابھی بھی لائن پر ہے اچھا اس کو فون دو اُس نے کیمرلنگو کے فون پر کنکشن لگایا اور لاؤڈ سپیکر کو آن ہی رکھا تا کہ جو بھی یہاں بات ہو سن سکے۔

جناب آپ کو معلوم ہے شائد کہ ہم اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔

''کون ہو تم،خدا کے نام پر بتاؤ'' کیمرلنگو بول رہا ہوں۔

کیمرلنگو کے فون سے فولادی گرجدار آواز ابھری۔لینگڈن نے اندازہ لگایا اُس کا لہجہ مڈل ایسٹرن ہے۔

''میں پرانے برادر ہڈ (OLD BROTHER HOOD) کا نمائندہ ہوں۔جس کو تم گذشتہ چار سو سالوں سے دباتے چلے آئے ہو میں انہیں ILLUMINATI کا پیروکار ہوں''

''تم کیا چاہتے ہو'' کیمرلنگو نے کہا۔

''میں سائنسدانوں کا آدمی ہوں۔ جو تمہاری ہی طرح سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہے ہیں۔انسان کی DESTINY اُن کی کھوج کیا ہے اُس

کا پیدا کرنے والا کون ہے۔''

''تم جو کوئی بھی ہو'' کیمرلنگو کی آواز کاٹتے ہوئے یعنی قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''خاموش رہو اور تم صرف سنو'' اُس کی آواز میں حکم تھا اور لہجہ بے پناہ سخت۔

''تمہارے لیے یہی بہتر ہے'' اس کی آواز میں سختی تھی۔

''دو ہزار سال سے تمہارا چرچ سچائی پر حاوی رہا ہے تم نے اپنی جھوٹی باتوں سے سادہ لوح لوگوں کو ورغلایا ہے، پھسلایا ہے، بہلایا ہے اور اپنے مخالفوں کو قتل کرواتے رہے ہو جو تمہاری ضرورت کے مطابق نہیں چلتے تھے۔ سائنس کی ایجادوں کو لغو قرار دیا ہے اور لوگوں کو سورگ، نرک کے چکر میں الجھا کر ڈراتے رہے ہو، خوفزدہ کرتے رہے ہو اور آج تم از خود اس کا نشانہ بنے ہو''

''یہ بلیک میل ہے'' کیمرلنگو قریب چیختے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ بلیک میل نہیں ہے، ہماری کوئی ڈیمانڈ DEMAND نہیں ہے، ہمارا فیصلہ ہے اور ہمارا دیرینہ عہد کہ ہم نے ویٹی کن سٹی کو ختم کرنا ہے تا کہ تمہارا جھوٹ اور زیادہ دیر تک نہ چل سکے ہم چار سو سالوں سے اسی دن کے منتظر رہے ہیں آج رات بارہ بجے تمہارے ویٹی کن سٹی کے پرخچے اُڑ جائیں گے، نیست و نابود ہو جائے گا تمہارا ویٹی کن سٹی۔ اور تم کچھ بھی نہیں کر سکوں گے''

وہ مضحکہ خیز ہنسی میں ہنس رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔

کمانڈر اولی ویٹی فون کی جانب لپکا۔

''جناب یہ دہشت زدہ کر رہے ہیں۔ یہ سب غلط ہے ویٹی کن سٹی میں کوئی بھی ہماری اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ سب بکواس ہے''

''تم کو شائد علم نہیں کہ ایلی مینٹی ILLUMINATI تمہاری اندر کی مجلسوں میں گھستے چلے آئے ہیں، سوس گارڈ تو اندر گھس سکتا ہے'' کمانڈر اولی ویٹی حیران کن نظروں سے تک رہا تھا۔

''کیا وہ انسان نہیں ہیں''

شائد تم کو علم ہو گا کہ انگلینڈ کے پرائم منسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے بارے میں کہا تھا کہ اگر ہمارے لوگ نازی فوجی ان ایلی مینٹیوں کی طرح اندر گھس سکتے تو یہ جنگ صرف کچھ ماہ میں ہی ختم ہو جاتی۔''

''تم کسی طور سے ویٹی کن سٹی میں بم نہیں رکھ سکتے یہ قطعی ناممکن ہے۔''

''تم بیوقوفوں کی طرح بول رہے ہو'' دوسری جانب سے آواز گونجی اپنی وفاداری جتانے کی کوشش کر رہے ہو۔ شائد تم کوئی افسر ہو۔''

''او مائی گاڈ'' لینگڈن نے زیر لب کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی آدمی سوس گارڈ (SWISS GUARD) کے اندر ہے اور اندر گھس بیٹھ کرنا تو ان برادرہڈ کے لوگوں کا پیشہ ہے۔ ٹریڈ مارک۔

''کیا تمہارے آدمی ایسے شخص کے لیے جان پر کھیل سکتے ہیں جو پانی پر چل سکتا ہے، تم بیوقوف ہو، وہ بھی انسان ہیں، اور اُن کو قابو کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری گوناگوں جماعتوں میں، مجلسوں میں سوسائٹیوں میں، بنکوں میں اور MASSON وغیرہ میں کہاں کہاں سے نہیں۔ کہاں سے وہ اندر تک آئے، تمہارے شہر میں اور کس طرح تمہارے چار معزز پادری جن میں سے کسی ایک کو آج رات کے بارہ بجے سے پہلے نامزد ہونا تھا۔ جو سب کے منظورِ نظر رہے تھے۔ اور بے حد ضروری تھے وہ سب کیسے غائب ہو گئے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو'' اولی ویٹی کمانڈر نے کہا۔

''میں تم پر اُن کے نام روشن کرتا ہوں۔ کیا بتاؤں؟''

''کیا ہو رہا ہے'' کیمرلنگو نے کہا حیران ہوتے ہوئے۔

''کیا تمہارے سیکورٹی آفیسر نے تمہیں نہیں بتلایا۔ کیسا گناہ کیا ہے تمہارے افسر نے تمہارے چار معزز پادری سچ بتاتے ہوئے اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے نا۔ جن کو آج تمہاری خفیہ میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ قسم لینے کے لیے جن میں سے کسی ایک کو چنے جانا تھا۔ وہ کیسے سب چاروں غائب ہو گئے۔''

کیمرلنگو نے اولی ویٹی کے کان میں کہا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ اُن چاروں کا اغوا ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے خفیہ جلسے میں داخلہ نہیں لیا۔''

''جناب وہ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہوں گے، اُن کو وقت کا اندازہ نہیں رہا ہو گا جلد ہی وہ خفیہ جلسے میں حاضر ہو جائیں گے۔ آپ نے خود ان کے ساتھ چائے پی تھی۔''

لینگڈن حیران ہو رہا تھا۔ اُس کا شک سچ ہو رہا تھا۔

''میں اُن سائنسدانوں کا آدمی ہوں جن کو تم برسوں سے ستاتے آئے ہو''

کیمرلنگو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اُس نے حیران کن نگاہوں سے کمانڈر اولی ویٹی کی جانب دیکھا۔

''لو سنو میں تمہیں اُن کے نام بتاتا ہوں'' فون پر اس کی آواز گونجی

''پادری نماسے، پیرس سے، پادری گوڈیرہ، بارسی لونا سے، پادری ایب نیر فرنیک فورٹ سے، اور ایک طویل وقفے کے بعد اُس نے چوتھے پادری کا نام لیا وہ اور زیادہ مزہ لینا چاہتا تھا۔۔۔ اور اٹلی سے پادری باگیا، جو آپ سب کا ہر دل عزیز ہے اور اُسی کا نام نامزد ہونا تھا پوپ کے لیے۔ یہ چاروں ہمارے قبضے میں ہیں۔''

کیمرلنگو کی پیشانی پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو'' کیمرلنگو نے گبھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہی جو تم ہمارے سائنسدانوں کے ساتھ کرتے آئے ہو۔ آٹھ

بجے ہر ایک پادری ایک گھنٹے کے وقفے کے ساتھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ اور دنیا یہ منظر دیکھے گی۔تمام ٹی وی چینل جو تمہارے منتخب (نامزد) پادری کا انتظار کر رہے ہیں اُن کو یہ پتہ چلے گا کہ کس طرح اُن سب کو ایک کے بعد ایک پادری کو صفحہ ہستی سے نابود کیا گیا ہے۔ایک ایک پادری کو سولی پر لٹکایا ہے الگ الگ طور سے۔ آگ، پانی، ہوا اور زمین کے الگ الگ نشانوں کے ساتھ۔اور اس طرح ہم اپنا دیرینہ عہد مکمل کریں گے اور پھر تم نے دنیا کو سپریم پونٹیف (پوپ) دینا تھا نا۔۔۔ وہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا ایسے قتل جو سبق آموز ہوں گے۔پوری عیسائی دنیا کے لیے ایک درس۔۔۔کون فرشتے تھے اور کون شیطان تو پوری دنیا از خود جان جائے گی۔آخر کب تک تم معصوم عوام کو دھوکا دیتے رہو گے۔اُن کے جذبات سے کھیلتے رہو گے اور سائنس کے گوں ناگوں تجربوں کو جھٹلاتے رہو گے۔تم بھی ہمارے سائنسدانوں کو اسی طرح قتل کروا کر عوام کے سامنے پیش کرتے رہے ہو۔

''آج رات ہمیں نیا پوپ چننا ہے اور دنیا کو اُس کا نام بتانا ہے'' کیمرلنگو نے کہا۔

''کیمرلنگو'' اُس کی آواز گرجی۔

''دنیا کو پوپ کی ضرورت نہیں رہے گی۔کیونکہ آج رات بارہ بجے پوپ کو حکومت کرنے کو کچھ بھی نہیں رہے گا یہ تمہاری ویٹی کن سٹی نیست و نابود ہو جائے گی کمانڈر اولی ویٹی چلایا۔۔۔تم چرچ میں پادریوں کو قتل کروا کر بچ کر نکل جاؤ ایسا ممکن ہی نہیں۔۔۔''

''کیوں بچوں کی طرح باتیں کرتے ہو، ہم تم میں سے ہی ہیں۔ہم کو بچ کر کہاں جانا ہے'' لینگڈن اور وٹوریا، کیمرلنگو حیران خلا میں گھور رہے تھے۔ بند ہال کے اندر

خفیہ سبھا میں تین مرتبہ پوپ کے چناؤ کے لیے بیلٹ ہو چکا اور کوئی بھی ایک نام پوپ کے لیے نہیں سامنے آیا۔اب ایک آخری مرتبہ بیلٹ ہونا تھا۔

پادری مورٹاٹی دعا گو تھا کہ کوئی عجوبہ ہو جائے کہ ہمیں پادری مل جائے جس کو پوپ بنا سکیں۔اب بہت ہی تاخیر ہو چلی تھی۔ایک امیدوار غائب ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اُن چاروں کا غائب ہو جانا جن میں سے کسی ایک کو چنے جانا تھا بعید از عقل ہے۔اب ایسے میں دو تہائی ووٹ حاصل کر سکنا تو خدائی کرشمہ ہی ہو سکتا ہے۔۔۔۔ ناگہاں دروازے کا بولٹ کھلا اور دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوا۔ پادری مورٹاٹی کا چہرہ کھِل اٹھا کہ اب ہم کامیاب ہو جائیں گے اپنے پوپ کا نام نامزد کرنے کے لیے سب کی نگاہیں دروازے کی آہٹ پر لگیں تھیں۔پادری مورٹاٹی (MORTATI) کو علم تھا کہ صرف دو ہی حالتوں میں ہال کی سیل کھل سکتی ہے ایک تو کسی سخت بیمار پادری کو ہال سے باہر لے جانا ہو اور دوسرے کسی پادری کو اندر لانا ہو۔۔۔یہی قانون تھا۔۔۔اُس نے سوچا جو پادری غیر حاضر ہوئے تھے شائد وہ آ رہے ہوں۔مگر جب دروازہ کھلا تو گرجے کی ہال کی گونج خوشی کی نہیں تھی بلکہ بے پناہ سناٹا سا ہر ایک کے ذہن پر چھا رہا تھا۔ہر ایک حیران و ششدر رہ گیا۔پادری مورٹاٹی سکتے میں تھا جس شخص کو اُس نے دروازے سے اندر دیکھا ویٹی کن سٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کیمرلنگو اس انتہائی مقدس ہال میں اس طرح داخل ہوا ہو اور ایسی خفیہ سبھا میں داخلہ لے رہا ہو جب ایک مرتبہ دروازہ پر مہر لگ گئی ہو۔

پادری مورٹاٹی سوچ رہا تھا کہ یہ کیمرلنگو کیا سوچ رہا ہے۔۔۔

کیمرلنگو بڑی پھرتی سے گرجے کی سبزیر پہنچ گیا اور حیران اور ششدر سبھا کے تمام لوگوں سے مخاطب ہو رہا تھا۔

''محترم حاضرینوں میں نے انتظار کیا جب تک ممکن ہو سکتا تھا۔ یہاں ایک ایسی بات ہوئی ہے جس کا آپ سب کو جاننے کا حق ہے سب لوگ یہ جاننے کی کوشش میں تھے کہ آخر کیمرلنگو کیا کہنا چاہتے ہیں اور پادری مورٹاٹی سوچ رہا تھا کہ وہ کیمرلنگو کے کہنے کا کیا مطلب نکالے جو وہ سُن رہا ہے۔کیمرلنگو کے سامنے موم بتی کی روشنی میں گویا ہوا۔اور اُس نے نفرت اور دہشت کی داستان سنائی۔جس کو سن کر پادری مورٹاٹی کی روح کانپ گئی۔اُس نے کہا کہ اُن چاروں پادریوں کا اغوا ہو گیا ہے جن میں سے کسی ایک کو پوپ کے لیے نامزد ہونا تھا۔اور اُن کو خاص طرح سے قتل کر دیا ہے۔اس نے ایلومنیٹی ILLUMINATY کی بدلے کی بھاؤنا کے بارے میں ذکر کیا جو کہ اُن کا دیرینہ عہد تھا کہ وہ چرچ کو نیست و نابود کر دیں گے۔اس نام سے بس لوگ واقف تھے اور سبھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔مگر یہ سوچ کر کہ وہ تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکے ہیں اس خیال سے وہ متفکر ہو گئے اور بھول بیٹھے تھے۔اُن کا پھر سے اس طرح سر نکال لینا اس طرح اُبھر آنا وہ فکر مند ہوئے۔اُن کے بدلہ لینے کی قسم بھی اُن کو یاد آ رہی تھی۔کیمرلنگو کی آواز میں درد تھا۔ کیمرلنگو بولتا جا رہا تھا کہ پوپ کو بھی انہوں نے زہر دے کر مار ڈالا تھا اور آخر میں اُس کے الفاظ ایک زیر لب کی صورت خفیف سے تھے۔اُس نے ہال کی تازہ ترین ٹیکنالوجی کا ذکر کیا۔ANTI MATTER اینٹی میٹر جو ویٹی کن سٹی کو دو گھنٹے کے بعد نیست و نابود کر دے گی جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو ایسا محسوس ہوا جیسے شیطان بذات خود ہال میں داخل ہوا ہے اور ہر ایک سنّاٹے کے نرغے میں آ گیا ہے۔ہر ایک کی زندگی کا ایک آدھ سانس اس کے قبضے میں ہے۔کوئی بھی ہل نہیں رہا۔ایک مکمل جمود چھا رہا تھا اور کیمرلنگو کے الفاظ اندھیرے میں معلق ہو کر رہ گئے۔

پاردی مورٹاٹی اگر کوئی آواز سن رہا تھا تو وہ کیمروں کے اِدھر اُدھر گھمانے کی اور ٹی وی کے اہلکاروں کی یا برقی آلات کی۔اُس نے ایسی سبھا کو اس حالت میں کبھی نہیں پایا تھا۔

کیمرلنگو نے چاہا تھا کہ ان حالات کا لائیو (LIVE) حال ٹی وی پر نشر ہو اور سب لوگ دنیا میں اس کا ملاحظہ کریں۔سب لوگ حیرانی کے باوجود کہ بی بی سی کے رپورٹر زندہ حالاتِ حاضرہ کا ملاحظہ کریں اس لیے ایک آدمی اور ایک عورت داخل ہوئے اور اب کیمرہ کیمرلنگو کے سامنے تھا وہ کیمرے کی جانب آگے بڑھا اور یوں گویا ہوا۔

''میں ایلومنیٹیILLUMINATI سے مخاطب ہوں۔ اور اُن سب سائنس کی شخصیات سے بھی مخاطب ہوں۔''مجھے کہنے دو'' کیمرلنگو ذرا وقفے سے گویا ہوا۔

''تم نے جنگ جیت لی ہے''اب خاموشی اورزیادہ بڑھ گئی۔ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنّاٹا تھا۔پادری مورٹاٹی حیران ہورہا تھا۔

''بہت دیر سے چل رہا تھا اورتمہاری فتح یقینی تھی،اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا جیسا اس لمحے محسوس ہورہا ہے کہ سائنس ہی آج کا خدا ہے۔''

پادری مورٹاٹی سوچ رہا تھا کہ کیمرلنگو کو کیا ہو گیا ہے۔کیا یہ پاگل ہوگیا ہے۔پوری دنیا سن رہی ہے۔

اب ادویات،الیکٹرانک،کمیونیکیشن،خلائی جہتوں یہاں تک کہ نسل میں ہیرا پھیری اورکلوننگCLONING ایک انسان کو ہُو بہو بنا دینا اب عجوبے نہیں رہ گئے۔اب ہم ایسے عجوبوں سے بچوں کو بہلا نہیں سکتے یہ آج کی حقیقت ہے کہ آج سائنس خدا بن رہی ہے مگر نہیں ابھی اور بہت آسمان ہیں۔تم تباہی اور بربادی کے دہانے پر خود ہی کھڑے ہو۔اورکسی وقت بھی یہ سب تمہاری دریافتیں ازسرِ نوصفر تک آجائیں گی کہ تم نے تباہی اور بربادی کے یہ جو ANTI MATTER اپنی ہی بربادی کے لیے ایجاد کئے ہیں۔''

تم یقیناً فرشتہ نہیں بن سکتے البتہ شیطان یقیناً ہو کہ شیطان ہی بربادی چاہتا ہے۔۔۔اُسے اور کچھ آتا ہی نہیں۔

بقیہ: ڈاڑھی

میں آکرانکو دیکھ تو لیتی ہے۔اتنے ہی سے انکو کتنا بل مل جاتا ہے۔اور یہ، یہ میری بیٹی... ابھی دنیا ہی کہاں دیکھی ہے اس نے؟ ابھی ابھی تو آنکھ کھولی ہے۔اگلے ماہ تو اس کا ساتواں برتھ ڈے ہے۔کتنا انتظار ہے اس کو اپنے برتھ ڈے کا؟ کتنی تیاری کر رکھی ہے اس نے؟ کیا ساری کی ساری تیاری..نہیں نہیں،اسے اس پر جھپٹ ہی پڑنا چاہئے۔موقع اچھا ہے۔بیٹھا ہوا ہے۔اس سے قبل کہ بیگ سے ہتھیار نکالے وہ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔اگر اسکی لمبی ڈاڑھی پکڑ میں آجائے،تب تو وہ ایکدم مجبور ہوجائیگا۔پوری طرح گرفت میں آجائیگا۔درد اتنا ہوگا کہ کچھ کر ہی نہیں پائیگا۔ہاں ہاں،اسے اس پر حملہ کر ہی دینا چاہیے۔ایک...دو...ارے باپ رے، کس طرح گھور رہا ہے وہ۔اس کے اندچل رہی ساری باتوں کو پڑھ رہا ہے۔کتنا محتاط ہوگیا ہے۔کیا صرف بیگ میں ہی ہتھیار ہوں گے اس کے؟ چادر کے اندر بھی تو رکھے ہوں گے؟ ان کے پاس کیا نہیں ہوتا؟ چاقو سے لیکر اے کے ۴۷، ہتھ گولے، آر ڈی اکس تک۔اور پھر جسم سے بھی تو گٹھیلا پھرتیلا ہے۔اس کے پاس پہنچنے سے قبل ہی اس کا کام تمام کردے گا۔تو پھر...پھر...گاڑی اپنی پوری رفتار میں بھاگ رہی تھی۔چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو لانگھتی،تیز شور کرتی گزر رہی تھی۔ نہ جانے وقت بھی کیا ہوا تھا؟ پوری بوگی میں مرگھٹ جیسا سنّاٹا پسرا ہوا تھا۔تابوت میں رکھی لاش کی مانند لوگ اپنی اپنی برتھ پر سوئے ہوئے تھے۔ایک اسی کے کمپارٹمینٹ میں غیبی طور پر،لیکن دکھنے جیسی چیزیں چل رہی تھیں۔

کچھ تو کرنا ہی ہوگا؟ کیوں نہیں وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لے؟ اس کے پیر پکڑ لے؟ اس سے گڑگڑا کر بولے، دیکھو بھیّا، تمہاری بھی کوئی بہن ہوگی، میری بیٹی جیسی بیٹی ہوگی، کیا تمہارے دل میں رحم نہیں ہے؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟ اگر تمہاری بہن یا بیٹی کو کوئی مارے تو تم پر کیا بیتیگی ؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ آخر یہ سب کیوں کرتے ہو تملوگ؟ کیا ملتا ہے تمہیں بے قصوروں کا خون بہا کر؟ یہ اندھی لڑائی کیوں لڑ رہے ہو تملوگ؟ اس طرح گڑگڑانے سے اسے ضرور دیا آجائے گی۔بخش دے گا وہ ہمیں۔ہاں، یہی ٹھیک رہے گا۔ایسا ہی کرنا چاہیے۔

'بھائی صا..' وہ بولنے کے لیے منہہ کھولنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائیل کا الارم گھنگھنا اٹھا۔اس کا مطلب صبح ہوگئی تھی۔ چھ بج گئے تھے۔؟ باہر کہرا ہے، صبح پتہ نہیں چل رہی ہے۔لیکن یہ طئے تھا ٹرین کانپور پہونچنے والی ہے۔کانپور پہونچنے کے احساس سے ہی اس کے اندر توانائی بھر گئی۔بس تھوڑی دیر میں ہی...بس تھوڑی دیر اور...

گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی۔رفتار کم ہوتے ہی وہ اپنا بیگ اٹھا تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا ہے۔لگتا ہے، وہ یہیں اترے گا...نہیں، لگتا ہے یہیں کچھ کرے گا...اسی اسٹیشن پر کچھ کرے گا...

'چلو بیٹے...اٹھو، جلدی چلو..' اس نے بیٹی کو نیچے اتارا۔نیند سے جگی وہ آنکھیں ملنے لگی۔

'چلو بیٹے جلدی کرو..'

وہ سامان گھسیٹتے ہوئے گیٹ تک آئی۔ٹرین رک چکی تھی۔نیچے اتر کر ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔اسکا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔وہ گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

'یا اللہ...تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے..'

اس کے منہہ سے نکلا اور وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط......۳

فالسئی قباؤں کا شہر اور اُٹھتے سورج کی زمین

(Pretoria and Mpumalanga)

وین پری ٹوریا کی طرف رواں تھی۔ جو ہانس برگ سے تیس میل دور۔۔۔ ساؤتھ افریقہ کا دارالسلطنت۔۔۔ یہاں پچاس ہزار جھومتے گاتے ہوئے درخت اعلان کرتے ہیں کہ بہار آ رہی ہے۔۔۔ کھڑکی سے باہر مختلف شکل کے پہاڑ الٹی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا شہر قریب آ گیا تھا۔ وین کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ کینن کہہ رہا تھا یہاں ملک کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ وین کی رفتار پھر سے تیز ہو گئی تھی اور وہ ہائی وے پر آ گئی تھی۔ جب راستے میں ۱۸۷۳ء کی قائم کردہ یونیورسٹی ملی تو۔۔۔ کینن نے مائک تھام لیا تھا۔۔۔ اور اس کی آواز گونج رہی تھی۔۔۔ ''یہاں پچاس ہزار طالب علم ہیں۔ میڈیکل کا محکمہ صرف یہیں ہے۔ جو ہانس برگ پہاڑوں کی اونچائی پر ہے اور پری ٹوریا وادیوں میں۔۔۔ ایک ذولو قبیلے کے ذریعہ ۱۸۵۵ء میں پری ٹوریا وجود میں آیا تھا۔ یہاں زیادہ تر بول چال کی زبان افریقان ہے جو ڈچ اور جرمن کا ملاپ ہے۔ جب ڈچ وہاں پہنچے تھے تو انہوں نے یہ قانون جاری کیا تھا کہ طالب علم صرف افریقان میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں انگلش میں نہیں۔ پری ٹوریا میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں۔''

ایک خوبصورت عمارت پہاڑ کے اوپر نظر آئی تھی۔ پروین کے پوچھنے پر کینن نے بتایا تھا وہ خوبصورت عمارت خوبصورت جگہ پر وہاں کی پارلیمنٹ کی بلڈنگ تھی۔ کچھ دور مک ڈونلڈ ریستوران بھی نظر آیا تھا۔ حیران کن بات تھی کہ دنیا کے ہر حصے میں اسی امریکن ریستوران کی شاخ موجود ہے۔ اُسے دیکھ کر اُس کے امریکن سیاح ساتھی بے حد خوش تھے۔ انہیں کچھ اپنا نظر آ گیا تھا۔۔۔ کینن کی آواز پھر گونجی تھی۔۔۔ ''یہ پارلیمنٹ بلڈنگ ۱۹۱۰ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ منڈیلا نے یہیں قسم کھائی تھی صدر بنتے وقت۔ اس کی پہلی بیوی وِنی (Winnie) چاہتی تھی کہ گوری نسل سے انتقام لیا جائے۔ منڈیلا اس کے خلاف تھا اس لیے دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔۔۔ ۱۹۹۴ء کی آزادی کے بعد جو بچے پیدا ہوئے ہیں وہ پیدائشی آزاد کہے جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ درجہ بندی ٹوٹ گئی۔ سب ایک ہو گئے۔۔۔ دراصل اپارٹ ہائیڈ انسانیت کے چہرے پر کلنک تھا۔ گوری نسل جو Minority میں تھی ملک کی ستاسی فیصد زمین کی مالک تھی اور سیاہ نسل جو Majority میں تھی صرف چودہ فیصد کی۔ اچھی اور اونچی ملازمت سفید نسل کے لیے وقف تھی۔ اپارٹ ہائیڈ کی بنیاد ہی اس گھناؤنے نظریے پر ہوئی تھی کہ سفید نسل سیاہ نسل سے برتر ہے۔ کالے لوگوں کو ووٹ دینے کی اجازت نہ تھی۔ جسمانی مشقت کے کام کالے لوگوں کے لیے وقف تھے۔ سیاہ رنگ کے علاوہ ناک نقشے، سر کی بناوٹ، بالوں کی صورت (Texture) بھی اپارٹ ہائیڈ کی بنیاد تھی۔ اگر کسی کی اولاد گورے اور کالے کے ملاپ سے ہوتی تو بچے کو ماں باپ سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ خاندان بکھر جاتے تھے۔ سگے بھائی بہن ایک اسکول میں نہیں جا سکتے تھے۔ کالی ماں یا باپ اپنے سفید جلد کے بچے سے نہیں مل سکتے تھے۔ گورے اور کالے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے۔ شادی تو دور کی بات تھی۔ ایسی شادیوں کو ناجائز قرار دیا جاتا تھا۔

جو لوگ ایسی شادیوں میں شرکت کرتے تھے انہیں سزا ملتی تھی۔ تفریحات کے مقامات میں اگر گورے ہوتے تھے تو کالے نہیں جا سکتے تھے۔ پرائیویٹ دعوتوں میں گوروں اور کالوں کا ملنا جلنا غیر قانونی تھا۔ دونسلوں کی دنیائیں بالکل الگ کر دی گئی تھیں۔ قانون توڑنے والوں کو تین ماہ کی سزا ملتی تھی۔۔۔ قید بامشقت۔ گوروں کے راستے سردوں سے بچنے کے لیے چھت اور دیواروں سے محفوظ تھے۔ ریستوران، پوسٹ آفس، عبادت گاہیں سب الگ الگ۔ ریلوے اسٹیشن کے ایک ہی پلیٹ فارم پر جانے کے الگ دروازے تھے اور دروازوں میں بھی فرق تھا۔ ایک شاندار دوسرا معمولی۔ ٹرین کے اندر مختلف ڈبے ہوتے تھے۔ اگر کالی نوکرانی اپنی گوری مالکن کے ساتھ ٹیکسی میں جانا چاہتی تھی تو ٹیکسی والے ساتھ بٹھانے سے انکار کر دیتے تھے۔''

کینن کی باتیں آنسو بن کر اُس کے دل کے پیالے میں جمع ہو رہی تھیں۔ وین بے تحاشہ پری ٹوریا کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔ کینن اور ڈرائیور یوپا اپنے اپنے فرائض کسی روبوٹ کی طرح پورے کر رہے تھے۔ کینن بے حد نرم لہجے والا نیک دل انسان تھا۔ وہ سوچ رہی تھی انسانی ذہن کتنا کمزور ہوتا ہے۔ ماحول کا غلام۔۔۔ کالوں سے ڈرنا امریکہ میں عام ہے۔ ذہن کتنے غلط اثرات قبول کر لیتا ہے۔ جسم کے مکان اور اُس میں مقیم روح میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ سوچ کی لڑی ٹوٹ گئی تھی جب کینن نے پھر بولنا شروع کیا تھا۔۔۔ جب بھی وین چل رہی ہوتی تھی وہ اپنے ملک کی اہم باتیں سیاحوں کو بتاتا جاتا تھا۔۔۔ اُس نے کہنا شروع کیا تھا۔۔۔ ''یہ شہر پری ٹوریا پہلے ایک جنگل تھا۔ اس کو یہ شکل دینے میں پندرہ سال لگے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں جب ڈچ یہاں آئے تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ زندگی اپنی نہ رہی تھی۔ اسے کچل دیا گیا تھا۔ آج ساؤتھ افریقہ کو Rainbow Nation (قوسِ قزح کی قوم) کہا جاتا ہے۔ ایک ملک میں

ایک پوری دنیا ہے۔ یہاں کی آبادی پینتالیس ملین ہے تقریباً۔" راستے میں ایک چھوٹا سا شہر وٹ بینک ملا تھا۔ اس کے متعلق کینن نے ایک دلچسپ واقعہ یہ بتایا تھا کہ چرچل جہاں دوران جنگ قیدی تھا۔ لیکن فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے ایک مکان پر دستک دے کر مدد مانگی تھی۔ اُس گھر کے مالک جون ہاورڈ Jhon Howard نے دروازہ کھولا اور چرچل کو چھ دنوں تک تہہ خانے میں چھپا کر رکھا تھا۔ یہ واقعہ انگریزوں اور ڈچ کی جنگ کے زمانے کا تھا۔ جب چرچل صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ گیا تھا تو اس نے شکریہ کے خط کے ساتھ چھ عدد سونے کی قیمتی گھڑیاں جون ہاورڈ کو بھیجی تھیں۔۔۔ اپنی جان بچانے کا انعام"۔۔۔ کینن کی باتوں سے سب سیاح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تھکن اتارنے کو راستے میں ایک خوبصورت ریستوران May Fly کے سامنے وین رک گئی تھی۔۔۔ موسم خوشگوار تھا۔۔۔ وین نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔۔۔ خوبصورت منظر پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جھومتے، لہلہاتے کھیت اور پرندوں کی قطاریں۔۔۔ ایک اور قصبے میں وین داخل ہو گئی تھی۔ کینن وہاں کی تفصیلات بیان کر رہا تھا کہ "یہاں کے لوگ اچھے فنکار ہیں اس قبیلے میں آج بھی اپنی پرانی تہذیب کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ اس قبیلے کا نام Ndebele ہے۔ یہاں لوگ اپنے گھروں کو گہرے رنگوں میں رنگتے ہیں۔ زمین اور گھر کے برتن بھی عورتیں رنگین بناتی ہیں۔ یہاں کی عورت جس کا نام Esther Mhlanga ہے مشہور فنکارہ ہے۔ ایک اَن پڑھ عورت نے چالیس سال کی عمر میں مصوری شروع کی اور آج باسٹھ سال کی عمر میں اپنے عروج پر ہے۔ اتنی پسند کی جانے لگی کہ جرمنی نے ۱۹۹۴ء میں اسے دعوت دی وہاں مصوری کا فن بانٹنے کے لیے۔" کینن ایک مدرس کی طرح بول رہا تھا اور سب سیاح شاگردوں کی طرح سن رہے تھے۔ کینن خود اپارٹ ہائیڈ کے دوران چھوٹا بچہ تھا لیکن اُسے سب ظلم و تشدد یاد ہیں۔ اُس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اس موضوع پر بولتے ہوئے جذباتی ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں تلخ یادوں کے سائے لہراتے نظر آتے تھے۔

وین ایک چھوٹے سے قصبے سے گزر رہی تھی جس کا نام بل فاسٹ (Belfast) تھا۔ کینن کے مطابق یہ قصبہ ۱۸۹۰ء میں رچرڈ اونیل Richard Oniel نامی شخص نے تلاش کیا تھا۔ یہ جگہ سیاہ گرے نائیٹ اور سرد موسم کے لیے مشہور ہے۔ پانچ ہزار آبادی والا خوبصورت قصبہ جوہانس برگ سے آٹھ سو میٹر نیچے ہونے کی وجہ سے سرد تھا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی دوکانیں قطاروں میں تھیں۔ عورتیں گہرے رنگ کے روایتی لباس میں سر پر گٹھری اور پیٹھ پر بچہ لیے ہوئے چل رہی تھیں۔ دکانوں کے نام انگلش میں لکھے ہوئے تھے لیکن لوگ افریقان بول رہے تھے۔

اُس نے غور کیا تھا کہ کینن جب بھی اپارٹ ہائیڈ کے تشدد کی باتیں کرتا تھا اُس کے چہرے پر غم بھی ہوتا تھا۔ اور غصہ بھی۔۔۔ جب بغاوت کی باتیں کرتا تھا تو ایک جوش میں ڈوب کر۔۔۔ جب ملک کی آزادی اور اپنے لیڈر منڈیلا کا ذکر کرتا تھا تو فخر کے نشے میں چُور ہو کر۔۔۔ پروین اس کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر خود بھی جذباتی ہو جاتی تھی۔ بہت گہرے درد کی لکیریں اس کی پیشانی پر تھیں جب وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ "باتھ روم، ریستوراں، اسکول، سینما ہال، پارک کے دروازوں پر لکھا ہوتا تھا۔۔۔ "صرف گوروں کے لیے" کالوں کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا ردِعمل یہ ہوا تھا کہ بغاوت میں عورتوں نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔ کچھ گوروں نے بھی اپارٹ ہائیڈ کے خلاف آوازیں اٹھائی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ U.N.O کی نظر اس تشدد پر پڑی تھی اور دباؤ ڈالا گیا تھا اس زیادتی کو ختم کرنے کے لیے۔ سویٹو کے طالب علموں سے بغاوت شروع ہو کر مختلف شہروں کے اسکولوں میں پھیل گئی تھی۔ ہر جگہ طالب علموں نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا۔ یہ احتجاج آگ کی طرح پھیلتا گیا تھا۔ طالب علم گرفتار ہوتے گئے تھے۔ ظلم کا شکار ہوتے گئے تھے۔ لیکن یہ تحریک تھمی نہیں تھی بلکہ اور بھی بڑے پیمانے پر پھیلتی چلی گئی تھی۔ اس تحریک کا نام تھا Soweto Student Representative Council۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ جب پولیس حملہ آور ہو تب ہی اس کا جواب دیا جائے۔ لیکن ان کے پرسکون احتجاج کا جواب پولیس نے Violence سے دیا تھا۔۔۔"

سیاحوں کا قافلہ Mpumalanga کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وین کی کھڑکی سے خوبصورت نظارے نظر آ رہے تھے۔ لال مٹی میں مکئی کے کھیت اور سورج مکھی بھی لہلہا رہے تھے۔ پوملانگا (Mpumalanga) مقامی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "اُٹھتے سورج کی زمین" کے ہیں۔۔۔ اس زبان کا نام سس واتی (Siswati) ہے۔ یہ ساؤتھ افریقہ کا سب سے نیا سب سے ترقی پذیر صوبہ ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے قدیم غار، کھنڈرات، پہاڑ اور افریقہ کی سب سے Vibrant اور مختلف روایتوں کا سنگم ہے۔ ہیرے کی کان کا یہاں ۱۹۰۵ء میں علم ہوا تھا۔" کینن کی آواز پھر سے گونج اٹھی تھی۔

شہر Long Tompass آیا تو وین کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ یہ شہر یوں اہم تھا کہ یہاں ڈچ اور برٹش میں لڑائی ہوئی تھی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے شہر ملتے جا رہے تھے۔ وین رکتی اور چلتی جا رہی تھی۔ بل کھاتی سڑکیں، ہرے مخمل اوڑھے اُفق تک جاتے ہوئے میدان، کہیں سائے اور کہیں دھوپ کے ٹکڑے چھدرے بادلوں سے چھنتے ہوئے اور پروین کی مبہوت آنکھیں قدرتی حسن کی شراب پیتی جا رہی تھیں۔ جب نظارے حد سے زیادہ حسین نظر آتے تو یو یا پانچ منٹ کے لیے وین روک دیتا تھا کہ سیاح باہر نکل کر پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ وہ قدرت کی دل کش تخلیقات کیمرے کی جھولی میں بھر لیتی تھی۔ پہاڑوں کو چومتے ہوئے سورج کے ہونٹ۔۔۔ شعاعوں کے شہتیر، وادیوں میں کھلونوں سے چھوٹے چھوٹے سرخ چھتوں والے گھروں کے جھرمٹ، جھیل کے سینے پر دھوپ کا زریں آنچل۔۔۔

ہریالی کے درمیان چکنی سڑک تھی۔ وین پھسلتی جارہی تھی۔ دھوپ کا رنگ بدل رہا تھا۔ مل گجے اُجالوں میں سر بفلک پہاڑ رنگین ہو گئے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں رنگ برنگے بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے جس سے ایک نیا رنگ پیدا ہورہا تھا جیسے دو محبت کرنے والے دل ایک دوسرے میں گھل مل کر اپنا وجود کھو کر کچھ اور بن جاتے ہیں۔۔۔صبح آٹھ بجے کا سفر شام سات بجے پورا ہوا۔ رستوں میں رکتے رکتے۔۔۔ پہاڑوں کی گود میں ایک چھوٹا سا شہر Sabie بھی ملا تھا۔۔۔جس کی بنیاد ۱۸۹۵ء میں پڑی تھی۔ پندرہ ہزار کی آبادی والے اس خوبصورت شہر میں انہتر میٹر بلندی سے گرتا ہوا آبشار اس شہر کی پہچان ہے۔۔۔ وین تھکی ہاری منزل مقصود یعنی۔۔۔ The Royal Hotel کے دروازے پر آ کر رک گئی تھی۔ ہر طرف اونچے کوہساروں کی پھیلی ہوئی بانہیں آسمان کو خود میں سمالینے کو بے قرار نظر آ رہی تھیں۔ اندھیرے بڑھ رہے تھے مگر منزل کی دوری گھٹ چکی تھی۔۔۔ دور پہاڑ پر ایک تنہا گھر میں دریچے سے جھلملاتی روشنی آنکھ میں آنسو کے ایک قطرے کی طرح چمک رہی تھی۔۔۔

کچھ دیر بعد۔۔۔ ڈنر کے دوران کیپٹن اپنے ملک کی تہذیب و روایت کی دلچسپ اور انوکھی باتیں کر رہا تھا۔۔۔''وہاں بھی جہیز کی رسم تھی جس میں بھیڑ یا دیا جاتا تھا۔ عورت جتنی فربہ ہوا تنا ہی زیادہ جہیز دینا ہوتا تھا۔ اس لیے سب فربہ عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب معاملہ کچھ اور ہے۔ بھیڑیے کی جگہ نقد دیا جاتا ہے اور اب عورتیں وزن کم کرنا چاہتی ہیں۔ کم فربہ عورت کو زیادہ جہیز ملتا ہے اور لڑکی کے والدین کو لڑکا جہیز دیتا ہے۔ شادی کی رسم یہ ہے کہ دریا کے قریب جا کر لڑکیاں اپنے آباو اجداد کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہیں۔ دلہن ایک چھڑی کو زمین پر پٹخ کر کہتی ہے کہ اب وہ ایک شخص کی ہوگئی۔ پھر پورا گاؤں آ جاتا ہے جشن منانے۔'' کیپٹن کی باتیں سب سیاح یوں سن رہے تھے جیسے بچے کہانیاں سنتے ہیں۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔''پری ٹوریا جدید وقدیم عمارتوں کا سنگم ہے۔۔۔''

پروین کچھ دیر چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئی تھی۔ ہر طرف حسین باغات تھے۔ درختوں کی چھاؤں میں دوڑتی سڑکیں اور گلیاں نظر آ رہی تھیں۔ خوشگوار ہوائیں فالسئی پھولوں والے درختوں کو گدگدا رہی تھیں۔ کیپٹن کے مطابق پری ٹوریا میں پچاس ہزار فالسئی پھولوں والے درخت موسم بہار میں خوشبو لٹاتے ہیں۔ سڑکیں گلیاں اور ندیاں۔۔۔ سب فالسئی پنکھڑیوں کی قبائیں پہن لیتی ہیں۔ قطاروں میں کھڑے ہوئے درخت ان پر مخملی پھول نچھاور کرتے ہیں۔

خدا کی کھڑکی (God's Window)

صوبہ پوملانگا میں پل گرم ریسٹ ایک تاریخی گاؤں ہے۔۔۔ جو وہاں کی کان کے Monument کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہاں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وکٹورین وضع کی دنیا میں قدم پہنچ گئے تھے۔ لطیف و اعلیٰ لاؤنج میں آتش دان کے خوبصورت سنہرے شعلے لہرا کر استقبال کر رہے تھے جیسے یہ کوئی جادو کا گاؤں تھا جہاں ۱۸۷۰ء کی سب یادگاریں محفوظ ہیں۔ جیسے یہاں وقت تھم گیا تھا اور لوگ اسی صدی میں رہ رہے ہوں۔ Mpumalanga میں یہ خوبصورت جگہ وہی قدیمی رنگ اوڑھے ہوئے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ لیکن جدیدیت بھی اُبھر رہی تھی۔۔۔ یہاں سے قریب ساؤتھ افریقہ کا سب سے عظیم الشان نظارہ تھا جسے خدا کی کھڑکی (God's Window) کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ اسے یہ نام کیوں دیا گیا تھا۔۔۔ بے قابو ہوتی ہوئی حیرانگی اور یقین نہ آنے والے سچ کا شکار ہونا پڑا تھا۔۔۔ پہاڑوں کے لامتناہی جنگل۔۔۔ اَن گنت ناہموار، پتھریلی سیڑھیاں خدا کی کھڑکی کے نظارے تک لے گئی تھیں۔ وہاں تک جانے کے لیے سانسوں کا ناہموار ہونا بھی لازمی تھا۔ منظر مسلسل (Panoramic view) قدرت کے شاہ کاروں میں تھا۔ نو سو میٹر نیچے جنگلات اور حد نظر تک پہاڑوں کے سلسلے تھے۔ جادو بھری وادیاں اپنی بانہوں میں بلا رہی تھیں۔ جہاں بھی نظر جاتی تھی لازوال حسن جلوہ گر تھا۔ یہاں فنکار۔۔۔ خاص طور پر مصور دُور دُور سے آتے ہیں۔ پروین تو وجد میں آ گئی تھی۔ ایسا طرف انگیز سماں اس نے بہت کم کم دیکھا تھا۔۔۔ فراز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

خوشیوں کی ندی (Blyde River Canyon)

خدا کی کھڑکی (God'd Window) سے کچھ دور۔۔۔ کیپٹن سب سیاحوں کو لے کر Blyde River Canyon آ گیا تھا جو افریقہ کا سب سے بڑا اور دنیا کا تیسرا بڑا (Canyon) آب درّہ ہے۔ کیپٹن کے مطابق یہ سولہ میل لانبا اور آٹھ سو میٹر گہرا ہے۔ یہاں تنگ پتھریلے راستے اور اور بے حد تنگ پل Foot Bridge پر چلنا تھا۔ پانی کی ہنر مند انگلیوں نے یہاں پتھروں کے انوکھے مجسمے تراشے ہیں۔ بھنور کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پانیوں نے لاکھوں برس پتھروں پر اپنا سر پٹک کر ان کے سینے کو شق کر دیا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں قدرت کی بے پناہ طاقت کے سامنے انسانی ہاتھ کچھ نہیں کر سکے۔ نرم پانی نے سخت پتھروں سے جنگ جیت لی تھی۔ اپنے لیے راستہ بنالیا تھا۔ سرخ پتھروں کو گہرائی تک کاٹ کر۔۔۔ وہ نیچے گھاٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حیرت کی انتہا تھی۔ انوکھے تراشے ہوئے رنگین پتھروں کی گود میں نیلے بہتے ہوئے پانیوں کی بل کھاتی لکیریں تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی نرمی نے کس طرح سختی کو مات دی تھی۔ پانی کی انگلیوں نے پتھروں میں سوراخ کر دیے تھے جیسے انسانی ہاتھوں نے اوزار سے کیا ہو۔ نرمی نے سختی کا سینہ چھید دیا تھا۔ یہاں قدرت کا یہ کرشمہ کروڑوں سال سے جاری تھا۔ کہیں کہیں ان پتھروں کے سینے کی دراروں سے نازک پودے جھانک رہے تھے۔ گھاٹیوں کی گہرائی میں نیلا پانی تیزی سے رواں تھا۔ نہ جانے کب سے اور نہ جانے کب تک؟ نہ جانے کس تلاش میں؟ سامنے Three Rondavels کا بہترین نظارہ حیران کر رہا تھا۔ تین گول

پہاڑ۔کینن کہہ رہا تھا یہ آب درّہ Mpumalanga کے حسن کی شان ہے۔ Blyde River کے معنی ہیں خوشیوں کی ندی (Joyous River) دوسری ندی Treur ہے۔ Treur ایک ڈچ لفظ ہے جس کے معنی Mourning (ماتم) ہے۔۱۸۴۴ء میں کچھ لوگ اس ندی سے سفر کرتے ہوئے واپس نہیں آئے تھے تو سمجھا گیا تھا کہ یہ لوگ جان کھو بیٹھے تھے۔اس لیے اس ندی کا نام اُن کے رشتہ داروں نے غم کی ندی (Sorrow River) رکھ دیا تھا۔ پھر ایک دن وہ لوگ صحیح سلامت واپس آ گئے تھے دوسری ندی سے۔۔۔اس لیے اس کا نام خوشیوں کی ندی رکھا گیا تھا۔ یہ دونوں ندیاں ایک مقام پر جا کر ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔کینن کی اس بات نے پروین کو سوچ کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اتنی دور سے دو الگ الگ ندیوں کا آ کر ایک دوسرے میں ضم ہو جانا۔۔۔ایک خوشی کی ندی دوسری غم کی ندی۔۔۔ دونوں کا ایک دوسرے میں گھل مل جانا۔سکھ اور دکھ کا ملن۔۔۔زندگی کا دستور بھی تو یہی ہے ان دو ندیوں کی طرح۔۔۔خوشی اور غم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔۔۔کبھی الگ نہیں ہوتے۔۔۔بس ایک دوسرے پر حاوی ہوتے رہتے ہیں وقت کے ساتھ۔۔۔ یہ دو ندیاں خوشی اور غم کی۔۔۔دو آنکھیں ہیں۔۔۔دکھ اور سکھ کے آنسوؤں سے لبریز۔

شام ہونے کو تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کر رہے تھے اور سیاحوں کی وین۔۔۔Perry Bridge Hollow Hotel کی طرف جا رہی تھی۔۔۔اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف گامزن تھے سب۔

دیارِ سکون (Kruger National Park)

سورج گہری نیند سو رہا تھا لیکن اُفق سے جھانکتی نرم اور مدھم روشنی کہہ رہی تھی کہ شہنشاہ سورج جلد ہی بیدار ہونے والا ہے۔ سیاح چاق و چوبند ایک جیپ میں پر اشتیاق بیٹھے ہوئے تھے۔ کینن کا انتظار تھا کہ وہ آئے تو جیپ کروگر پارک کی طرف روانہ ہو۔اس کے آتے ہی جیپ چل پڑی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں کی پلکیں ابھی پوری طرح نہیں کھلی تھیں۔ خاموشی ہر طرف پیر پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوائیں سرد تھیں۔ جیپ سیاحوں کو لے کر ایک نئی دنیا، ایک نئی سلطنت کی طرف جا رہی تھی۔ حیوانوں کی دنیا اور اُن کی سلطنت کی طرف۔۔۔ سفاری۔۔۔(Safari) جہاں حیوانات اور نباتات کی دنیا تھی کینن کی آواز گونجنا شروع ہو گئی تھی۔۔۔وہ کہہ رہا تھا۔۔۔''سبھوں کو اپنے بیگ احتیاط سے رکھنے ہیں کیونکہ سفاری میں ایک بندر کسی سیاح کا بیگ لے کر دور اونچے پہاڑ پر بھاگ گیا تھا۔اُس بیگ میں اہم اشیا تھیں جیسے پاسپورٹ'' یہ سنتے ہی سبھوں کی گرفت اپنی اپنی چیزوں پر مضبوط ہو گئی تھی۔۔۔ کینن کے مطابق کروگر پارک میں اگر کئی ہفتوں تک بھی ڈرائیو کرتے جائیں یہ جیپ تو پورا پارک نہیں دیکھ سکتے۔اس کا رقبہ انگلستان کے برابر ہے۔۱۸۹۸ء میں بنایا گیا یہ پارک بیس ہزار اسکوائر میٹر سے بھی زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سارے حیوانات، پرندے، کیڑے اور نباتات زندگی جیتے ہیں۔ یہاں سولہ سو شیر، پچیس ہزار بفلو (Buffalo) اور بارہ سو چیتے ہیں۔ یہ پارک دنیا کے اُن بہترین مقامات میں ایک ہے جہاں جنگل کی، حیوانوں کی زندگی قدرتی طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں پانچ حیوانات بے حد اہم مانے جاتے ہیں وہ ہیں۔۔۔ شیر، چیتا، رہینو (Rhino)، Buffalo اور ہاتھی۔ جتنے جانور ہیں سب مل جل کر رہتے ہیں۔طاقت ور ناتواں میں کمزور کو مار ڈالتے ہیں۔لیکن انسان؟ طاقت کی ہوس، برتری کی بھوک کے لیے خون کرتے ہیں۔خوف و ہراس، بدامنی، نفرت اور تشدد کا جہاں تخلیق کرتے ہیں۔ ہریالیاں سیاہ گرد میں اور درختوں کے نغمے چیخ اور دھماکوں میں بدل دیتے ہیں۔۔۔اور یہ دنیا۔۔۔حیوانوں کی۔۔۔کتنی پرسکون نظر آ رہی تھی۔مضبوط شیر اور کمزور امپالا ایک ساتھ بھائی چارگی سے رہتے آ رہے ہیں۔ ہرے بھرے درختوں کے گنگناتے پتے جھوم رہے تھے۔۔۔زندہ رہنے کا حق خدا نے انسانوں اور حیوانوں دونوں کو دیا ہے۔زندگی کے لیے غذا بنیاد ہے۔لیکن انسان۔۔۔؟ ان کی بھوک تو کچھ اور ہے۔ دراصل حیوانیت انسانوں کی خاصیت ہے اور انسانیت حیوانوں کی۔ جب ایک کمزور امپالا کے زخمی بچے کو اس کے شکار سے ایک شیر بچاتا ہے۔اُسے پناہ دیتا ہے۔انسانیت کی عظمت حیوانوں میں اَسی فیصد ہے اور انسانوں میں بیس فیصد شاید۔۔۔اس پر سکون دنیا میں بے فکری سے چلتے ہوئے ہر طرح کی حیوانوں کو دیکھ کر اُسے اپنی یہ نظم بے ساختہ یاد آ گئی تھی۔۔۔

لانبے ناخن

ملکوں، شہروں شہروں دھول اُڑا کر
جنگل ہی میں خیمہ گاڑوں
ڈیرا ڈالوں
جنگلی جانوروں کے پنجے
حملہ آور ہوں گے لیکن
ان کے ناخن
جسم کی دیواروں تک ہی محدود رہیں گے
شہروں میں لہراتے، لانبے
ناخن دیواروں کے اندر
داخل ہو کر
روح کو چھلنی کر دیتے ہیں
قطرہ قطرہ خون بہا کر
اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں
خون تو بہہ جاتا ہے لیکن
جسم سلامت رہ جاتے ہیں۔۔۔!

☆

لسانی مطالعے

انتہائی خوبصورت علمی کاوش

یعقوب نظامی

(بریڈفورڈ، برطانیہ)

لسانی مطالعے پروفیسر غازی علم الدین کی ایک بے مثال علمی کاوش ہے۔ پروفیسر صاحب ایک درویش صفت انسان، زبان شناس محقق، ماہر لسانیات اور پائے کے استاد ہیں۔ ان کی شخصیت میں کمال کی انکساری اور منکسر المزاجی ہے ۔ یہ انتہائی دھیمے اور میٹھے انداز میں گفتگو کرتے وقت تمام ادب آداب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی عالمانہ رائے اس انداز سے دیتے ہیں کہ مخاطب کو اپنی کم علمی کا احساس تک نہیں ہونے دیتے......عربی کے عالم فاضل لیکن اردو میں بھی انہوں نے کمال کی معرکے آرا کتابیں تصانیف کی ہیں۔ آج میں ان کی جس کتاب کا تذکرہ کر رہا ہوں اس کی علمی و ادبی شہرت پاکستان سے بھارت اور پھر پوری دنیا اردو ادب میں پہنچی......لسانی مطالعے......نامی اس کتاب نے اردو ادب میں اس قدر دھوم مچائی کہ ڈاکٹر عاشق حسین ہرگانوی صاحب نے اس کی روشنی میں ......لسانی لغت (غازی علم الدین کے حوالے سے)......نامی کتاب تصنیف کی اور پھر شمس الرحمان فاروقی جیسے صاحب رائے عالم کو اس کتاب نے جھنجھوڑا تو انہوں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان کے علاوہ اردو کے وہ نقاد جن کا آج اردو ادب میں سکہ چلتا ہے سب نے اس کتاب کے بارے میں رائے دی جیسے ڈاکٹر عاشق حسین ہرگانوی نے......اردو: معیار اور استعمال (غازی علم الدین کی کتاب لسانی مطالعے کے حوالے سے)...... کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اتنے علماء ادب کی عالمانہ رائے صاحب کتاب کے لئے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ کتاب کے کچھ حصوں سے شمس الرحمان فاروقی نے اختلاف کر کے اپنی رائے قائم کی ہے لیکن ایک بات کا ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب نے اردو میں کچھ عرصہ سے پائے جانے والے جمود کو توڑا۔

غازی صاحب نے کتاب کا ایک نسخہ کمال مہربانی سے مجھے بھی عنایت کیا۔ میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب نظر آئے......دوران مطالعہ بیگم نے پوچھا کہ آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں آخر یہ کس موضوع پر لکھی گئی ہے......(میری بیگم پروفیسر شمیم نظامی بریڈفورڈ کالج میں انگریزی کی پروفیسر ہیں۔ لیکن اردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتیں) ......میں نے بتایا کہ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اردو الفاظ کا تخلیقی اور معنوی و اصلاحی پس منظر، لسانی تحقیق کے کچھ نئے زاویے ادب میں استعمال ہونے والے محاورات اور دوسرے پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے...... یہ سن کر بیگم کو تجسس پیدا ہوا اور پھر مجھے بتانے لگی کہ......''اس وقت برطانیہ میں انگریزی کے بہت سے محاورے متروک ہو چکے ہیں جن کو ہم کلاس روم میں اس لئے استعمال نہیں کرتے چونکہ اُن سے نسلی تعصب، اونچ نیچ اور دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے...... انگریزی علماء ادب نے ان تمام محاورات کو نصاب سے نکال دینے کا مشورہ دیا ہے......جس کے نتیجہ میں اب درس گاہوں میں ان کا عملی استعمال ممنوع قرار پایا ہے۔''

یہ تو تھی انگریزی کی بات......ادھر اردو کی نگری میں اس موضوع کو لوگ ایک عرصہ سے دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے لیکن پہل کون کرے اس کا انتظار تھا......ایسے میں یہ سعادت ایک ''غازی'' کو نصیب ہوئی۔ جس نے اس موضوع پر پہلے مقالے لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے اور صاحب رائے حضرات کی نظروں سے گزرے جس کے بعد مقتدرہ قومی زبان نے ان مضامین کو کتابی شکل دیکر......لسانی مطالعے......کے نام سے شائع کیا۔

میرے لئے کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں الفاظ کے معنی، پس منظر اور پھر محاورات پر بحث کی گئی ہے۔ اگر میں ہوتا تو اس باب کا عنوان ......لفظوں کی کہانیاں......رکھتا چونکہ اس باب بھی انہوں نے الفاظ کی تہہ میں جا کر اس بات کی کھوج لگائی کہ اس لفظ کا پس منظر کیا ہے جیسے......اشرفی (سونے کا سکہ) کے بارے میں لکھا ہے کہ ایران میں اشرف نامی ایک بادشاہ تھا جس کے عہد میں دس ماشے سونے کے وزن کا سکہ رائج ہوا اس نسبت سے اس سکے کو اشرفی کہا جاتا ہے۔ بے وقوف......لفظ کا پس منظر یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں طویل عبارت بغیر وقفہ Full stop کے لکھی جاتی تھی اس طویل عبارت کو بغیر وقوف کے کہا جاتا تھا۔ چنانچہ بعد میں وہ لوگ جو مسلسل بولتے یا کوئی فضول کام کرتے نظر آئے انہیں بے وقوف کہا جانے لگا۔ داماد......لفظ اصل میں دائم آباد سے نکلا ہے۔ والدین جس کے عقد میں بیٹی دیتے ہیں اس کے بارے میں دعا کرتے ہیں کہ تیرا گھر ہمیشہ آباد رہے۔ گھر آباد کرنے والے کو داماد کہا جاتا ہے......پیش خیمہ......زمانہ قدیم میں فوج کی روانگی سے قبل ہراول دستہ فوج کے پہنچنے سے قبل مقام قیام پر پہنچ کر خیمہ لگاتے تھے چنانچہ وہاں سے یہ لفظ نکلا۔ حلقہ بگوش......لفظ کا پس منظر کہ زمانہ قدیم میں لوگ اپنے غلاموں کے کانوں میں لوہے، تانبے، چاندی یا سونے کا حلقہ ڈال دیتے تھے جس کی مناسبت سے لفظ حلقہ بگوش کا آغاز ہوا......خوشامد لفظ کا استعمال ہم اکثر کرتے ہیں جس کا مطلب ہے خوش آمد......(اسے خوش آئے) مخاطب کو خوش کرنے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملانا۔ اس طرح غازی صاحب نے بڑی عرق ریزی سے الفاظ کے معنی اور ان کے پس منظر سے مجھ ایسے قاری کی معلومات میں انتہائی قیمتی اضافہ کیا ہے۔ میں جب یہ باب پڑھ رہا تھا تب میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ اگر مجھے موقع ملے تو میں بھی انگریزی کے وہ الفاظ جن کا اکثر ہم استعمال کرتے ہیں کے پس منظر پر کچھ لکھوں مثال کے طور پر......بائیکاٹ Boycott......کا لفظ دنیا میں اکثر

استعمال ہوتا ہے لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ اس لفظ کا آغاز آئرلینڈ سے ہوا جہاں مسٹر بائیکاٹ نامی ایک آدمی رہتا تھا۔ یہ جس گاؤں کا باشندہ تھا اس گاؤں کا جاگیردار کسانوں پر بہت ظلم کرتا تھا ایک دن سب کسان جمع ہوئے اور انہوں یک زبان ہو کر فیصلہ کیا کہ ہم سب متحد ہو کر جاگیردار کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کام نہیں کریں گئے......جاگیردار کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے مسٹر بائیکاٹ سے اندرون خانہ بات کر کے کچھ لین دین کے بعد اسے اس احتجاج سے منع کر دیا......مسٹر بائیکاٹ کے علاوہ پورے گاؤں نے احتجاج کیا تو مجبور ہو کر جاگیردار نے مطالبے مان لیے تو گاؤں والوں نے مسٹر بائیکاٹ کی اس حرکت پر اس کا حقہ پانی، بول چال اور لین دین بند کر دیا۔ اس دن سے آج تک مسٹر بائیکاٹ کے ساتھ گاؤں والوں نے جو رویہ اپنایا تھا اسے......بائیکاٹ...... کہتے ہیں۔

غازی صاحب نے کتاب میں زیادہ تر اُن محاورات پر بحث کی ہے جن کا زیادہ تر تعلق مذہب سے ہے......ایسے محاورے پڑھنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ جب اردو زبان پروان چڑھ رہی تھی تب معاشرے میں تنگ دلی اور مذہب کے خلاف نفرت انتہا پر تھی......لیکن ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اردو ادب میں اُن محاورات کی بھی بھرمار ہے جن سے محنت کش طبقہ کی توہین اور تذلیل ہوتی ہے......حیرانگی کی بات ہے کہ غازی صاحب نے اس طرف چلتے چلتے نظر ڈالی......اگر یہ اس طرف بھی بھرپور توجہ دیتے تو ممکن ہے وہ ایک باب اس طرح کے محاورات پر بھی لکھتے جیسے......جاٹ نہ جانے گن کو اور چنا نہ جانے باہ (مطلب فیروز اللغات ......جاٹ اچھی بات کو نہیں جانتا اور چنا سخت خشک ہوتا ہے......جاٹ جوتے سے درست ہوتا ہے اور چنے کھا کر چھاچھ پی جائے تو بہتر ہے)......موچی کے موچی ہی رہے (کوئی ترقی نہیں کی......جیسے تھے ویسے ہی رہے)......تیلی خصم کیا اور پھر بھی روکھا ہی کھایا (برا کام بھی کیا اور مراد پھر بھی نہ ملی)...... اندھا کیا جانے (بسنت) لالے کی بہار......اندھا گائے بہرا بجائے (بے وقوفوں کی سوسائٹی)......ان محاورات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس زمانے میں اونچ اور نیچ اور معاشرتی نفرت کی دیواریں بہت اونچی تھیں......لوگوں نے دوسروں کی کمزوریوں کے مذاق اڑائے اور وہ مذاق بعد میں محاوروں کی شکل میں مستقل حیثیت قائم کرتے گئے......میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہر زبان کا اپنا مزاج ہے چونکہ وہ جس ملک یا علاقہ میں بولی جاتی ہے وہ اس معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی ،فرانسیسی، ہسپانوی جیسی سب زبانیں اپنے اپنے ملکوں کے سماج کی عکاس ہیں......یہ زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز تو ہوتی ہیں لیکن اپنا حسن قائم رکھتے ہوئے دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے ماحول اور ضرورت کے مطابق اپناتی ہیں......کسی بھی زبان کا بغور مطالعہ کرنے سے اُس معاشرے، لوگوں کے رہن سہن، سوچوں بلکہ تاریخ کا علم ہوجاتا ہے......لیکن آج زمانہ بدل چکا ہے اور ان محاورات نے پرانے فرسودہ خیالات کی بھی نفی کی ہے۔ آپ صرف اس محاورے پر غور کریں کہ...... موچی کے موچی ہی رہے (کوئی ترقی نہیں کی......جیسے تھے ویسے ہی رہے) حالانکہ سچ یہ ہے کہ روس کے مرد آئین سٹالن، برطانیہ کی آئرن لیڈی مارگریٹ تھیچر، بابائے امریکہ ابراہیم لنکن اور صدر اوباما......ان سب کا تعلق موچی خاندان سے ہے......ان کے کارناموں سے سب اہل علم واقف ہیں......اسی طرح آج کا جاٹ بیوقوف نہیں بلکہ وہ علمی و ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں......اگر شک ہو تو فیض احمد فیض اور محمود ہاشمی کے ادبی اثاثہ کا مطالعہ کیجیے......ایسے میں سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہمارے محاورے ہمیں شرمندگی کی طرف نہیں دھکیل رہے ہیں......کیا ہماری زبان میں اتنی لچک اور سکت نہیں کہ وہ بدلتے زمانے کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت یا دم خم رکھتی ہو۔

ایک زمانے میں انگریزی کے لفظ Niger کا برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں استعمال عام ہوتا تھا لیکن آج اس لفظ کے استعمال کرنے پر پابندی ہے اور جو کوئی بھول کر بھی اس کا استعمال زبانی کلامی کر بیٹھے تو اسے پھر سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں لفظ ماسٹر (بامعنی استاد) کے اور میڈم (بامعنی ٹیچرس کے) عام ہے لیکن برطانیہ میں ماسٹر اور میڈم کا لفظ اب ممنوع ہو چکا ہے چونکہ اس میں ایک دبدبہ اور اتھارٹی کا احساس ہوتا ہے۔ اب برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں ماسٹر اور میڈم کی بجائے ......ٹیچر...... کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح پولیس مین، پوسٹ مین، فائر مین جیسے الفاظ کو نصاب سے نکال دیا گیا ہے چونکہ ان سے یہ تاثر ملتا تھا کہ یہ کام صرف مردوں کے لئے ہیں اب ان کی جگہ...... پوسٹل ورکر، پولیس آفیسر، فائر فائٹر...... جیسے استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ بات کہنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہمارے ہاں جو الفاظ صدیوں سے رائج ہیں ان میں بھی وقت اور ضرورت کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ زبان سے معاشرتی اونچ نیچ اور نفرتیں ختم ہوں۔

زبان ایک ایسا خوبصورت ہتھیار ہے جس کے استعمال سے ہم دوسرے سے رابطہ اور اظہار رائے کر سکتے ہیں......یہ اظہار ہم زبان...... ہاتھ کے اشاروں......ہونٹوں کی جنبش...... آنکھوں اور پلکوں بلکہ جسم کے کسی بھی حصے کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر کرتے ہیں...... جو عرف عام میں ...... باڈی لینگوئج...... کہلاتی ہے......کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں زبان دی اور پھر عقل سلیم سے بھی نوازا تو پھر کیوں نہ ہم اس کا استعمال کرتے ہوئے اپنی زبان کو بھی ایسا خوبصورت، دلنشین اور شگفتہ بنائیں کہ لوگ اپنی زبان پر فخر کریں نہ کہ دل میں رنجش اور دکھ و درد پیدا ہو......اگر اس نکتہ پر ماہر لسانیات اتفاق کریں تو پھر غازی علم الدین نے جو پہلی اینٹ رکھی......پھر جس پر ڈاکٹر ہرگانوی صاحب نے دوسرا قدم آگئے بڑھایا...... اس میں مزید کام کرتے ہوئے ایسے تمام محاورے بھی متروک کیے جانے چاہے جن سے بدمزاجی پیدا ہوتی ہو۔ یہ کام اسی صورت ممکن ہے جب تعلیمی نصابوں سے انہیں نکال دیا جائے۔ جب ان کا استعمال محدود ہوگا تو پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اپنی موت آپ مرجائیں گئے۔

''مزاجِ ناقہ رامانندِ عرفیؔ''

ڈاکٹر سید تقی عابدی
(کینیڈا)

الطاف حسین حالیؔ کا انتقال ۳۱؍دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ہوا۔ یہ سال یعنی ۲۰۱۴ء ان کی سوسالہ برسی کا سال ہے لیکن دنیائے اُردو میں وہ جوش و خروش نہیں جو حالی کی صد سالہ سالگرہ کے جشن پر ۲۶؍اکتوبر ۱۹۳۵ء کو سر زمین پانی پت پر دیکھا گیا۔ حالی ۱۸۳۵ء پانی پت میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ پانی پت وہ مقام ہے جہاں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے کئی بار ہوئے۔ ماہنامہ زمانہ نے جو دیانگم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس صد سالہ سالگرہ کے جشن کی مکمل رپورٹ نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کی۔ ہم یہاں اس مفصل رپوٹ سے کچھ مطالب چن کر قارئیں کے لئے بصورت آنکھوں دیکھا حال پیش کرتے ہیں۔

یہ جشن ۱۹۳۵ء کو پانی پت کے میدان جو حالیؔ ہائی اسکول اور ڈاک بنگلہ کے درمیان واقع تھا برگزار کیا گیا۔ اس میدان میں مہمانوں کے لیے خیموں کا ایک کیمپ قائم کیا گیا جس میں تقریباً سوڈیرے نصب تھے۔ اسکول کی عمارت کے پیچھے پنڈال تیار کیا گیا تھا اور اس کی عمارت کو ڈائینگ ہال اور جشن کی نمائش کے لیے سجایا گیا تھا۔ تقریباً چار سو مہمان حالیؔ اسکول کے اطراف خیمہ زن تھے۔

اس جشن کی صدارت کے لیے ہز ہائی نس نواب آف بھوپال حمید اللہ خان کو منتخب کیا گیا تھا۔ بیرونی مہمانوں کی آمد ۲۴؍اکتوبر سے شروع ہو گئی تھی چنانچہ علاّمہ اقبالؔ، ڈاکٹر سر راس مسعود، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، امین زبیری اور ڈاکٹر علیم وغیرہ مہمانان میں شامل تھے۔ نواب آف بھوپال حمید اللہ خان ۲۶؍اکتوبر ۹ بجے صبح پانی پت کے ریلوے اسٹیشن پر پہونچے جہاں ان کے استقبال کے لیے ایک شامیانہ نصب کیا گیا تھا اور ان کے استقبال کرنے کے لیے سر راس مسعود، علاّمہ اقبالؔ، نواب اسمٰعیل خان اور صلاح الدین سلجوقی کونسل جنرل افغانستان موجود تھے۔ نواب صاحب نے تمام ذی وقار حضرات سے مصافحہ کیا اس موقع پر سلامی دی گئی نواب صاحب معزز اراکین کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اسی ٹرین میں سر اکبر حیدری، خواجہ حسن نظامی، مولانا شوکت علی اور دوسرے افراد بھی پانی پت وارد ہوئے۔ نواب صاحب ناشتہ کے بعد حضرت بو علی قلندر کی درگاہ پہنچے جہاں قبروں پر فاتحہ پڑھ کر حالیؔ ہائی اسکول کی عمارت کا معائنہ کرتے ہوئے پنڈال میں تشریف لائے جلسہ گاہ کی ڈائس پر کرسیاں ترتیب دی گئی تھیں۔ جلسہ میں تقریباً پانچ ہزار افراد موجود تھے۔

نواب بھوپال کی صدر نشینی کے بعد خواجہ غلام السیدین نے محمد اسلام چودھری کو تلاوت کلام پاک کے لیے مدعو کیا جس کے بعد اسکول کے طلبا نے اپنی روز آنہ دعا پڑھی حالیؔ کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے نواب صاحب کی خدمت میں معروضہ پیش کیا جس میں اسکول کی مالی مشکلات کا ذکر تھا۔ نواب صاحب کو عمدہ پھولوں کا ہار پہنانے کے بعد حالیؔ اسکول کے ایک ٹیچر لئیق احمد نے علاّمہ اقبالؔ کے فارسی استقبالیہ اشعار پیش کئے۔ ان اشعار کو ہم سلیس ترجمے کے ساتھ یہاں پیش کر رہے ہیں۔

مزاجِ ناقہ را مانند عرفیؔ نیک می بینم چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
(عرفیؔ شیرازی کی طرح اونٹ کے مزاج کو خوب جانتا ہوں اور جب محمل کو سنگین دیکھتا ہوں تو حُدی نغمے کو بلند آواز پڑھتا ہوں)

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو ز الطاف تو موج لالہ خیزد از بیابانم
(حمید اللہ خان کی وجہ سے ملک اور ملت کو بلندی نصیب ہوئی ان کے لطف و کرم سے میری راہ میں گل اور لالہ کی نشو و نما ہو رہی ہے)

طوافِ مرقدِ حالیؔ سزد ارباب معنی را نوائے او بجانہا فگند شوری کہ می دانم
(حالیؔ کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔)

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم
(آ کے فقر اور شاہی کو حالی کے حضور میں مل کر پیش کریں، تو ان کی قبر پر جواہر نچھاور کر اور میں پھولوں کو بکھیر دوں۔)

علاّمہ اقبالؔ کی نظم خوانی کے بعد مولانا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو نے مولانا حالیؔ بحیثیت شاعر نثر نگار و نقاد تقریر کی۔ خواجہ غلام السیدین نے مولانا حالیؔ بحیثیت مصلح قوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین امیر جامعہ دہلی نے مولانا حالیؔ بحیثیت محبِّ وطن تقریریں کیں۔ مقامی شعرا نے نواب صاحب کی شان میں نظمیں پڑھیں۔ حفیظ جالندھری نے ''دورِ حالیؔ'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ ڈاکٹر سر راس مسعود نے اعلان کیا کہ نواب صاحب نے حالیؔ اسکول کے لیے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ منظور کیا، وزرائے بھوپال اور پنجاب گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار روپے کی امداد کا اعلان کیا۔ لنچ کے بعد معززین کے پیغامات سُنائے گئے کچھ انعامات نواب صاحب کے توسط سے معزز مہمانوں کو دئے گئے۔ نواب آف بھوپال نے مولانا حالیؔ اور اُن کے احسانات کے عنوان پر تقریر کی جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

''پانی پت کی سرزمین پر اگرچہ بارہا ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے لیکن گذشتہ صدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہ ہے کہ وہ مولانا حالیؔ کا مولد و مدفن ہے۔ مولانا حالیؔ ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کے احسان شناس ہر ممکن ذریعہ سے ان کی یادگار کو قائم رکھیں تا کہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور تتبع کی تحریک ہو۔ بلا شبہ اُن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

"چہارسُو"

" زندوں کا دستور"

"عمل کی کتاب"

ڈاکٹر شنکر دیال شرما (سابق صدر جمہوریہ ہند)
ترجمہ: ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

عمل کی کتاب تھی
دعا کی کتاب بنادیا

It was a Command for action.
You turned it into a book of prayer.

سمجھنے کی کتاب تھی
پڑھنے کی کتاب بنادیا

It was a book to understand.
You read it without understanding.

زندوں کا دستور تھا
مُردوں کا منشور بنادیا

It was a code for the living.
You turned it into a manifesto of the dead.

جو علم کی کتاب تھی
اُسے لاعلموں کے ہاتھ تھمادیا

That which was a book of Knowledge;
You abdicated to the ignoramus.

تسخیرِ کائنات کا درس دینے آئی تھی
صرف مدرسوں کا نصاب بنادیا

It came to give knowledge of Creation.
You abandoned it to the madrasa.

مُردہ قوموں کو زندہ کرنے آئی تھی
مُردوں کو بخشوانے پر لگادیا

It came to give life to dead nations.
You used it for seeking mercy for the dead

اے مسلمانوں یہ تم نے کیا کیا؟

O' Muslims! what have you done!

"نیند کا ماتا"

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

جاگنا
ہوش میں آنا
یہ جاننا، وہ جاننا
راستہ پہچاننا
ممکن نہ تھا۔ میں رہ گیا
سوتا ہوا

پہلے ماں کی کوکھ میں، بے خبر
دنیا سے، مافیہا سے
بعد میں، پیدائش کے بعد ماں کی گود میں
اِس کی، اُس کی گود میں
سوتا رہا

اور بڑا ہو کر گرا
دنیائے دوں کی گود میں
خوابِ غفلت میں مگن
سوتا رہا

جاگنا، ہوش میں آنا
یہ جاننا، وہ جاننا، راستہ
پہچاننا، ممکن نہ تھا
زندگی میری تھی۔۔لمبی رات

جس کا دن نہ تھا
۔۔۔میں رہ گیا سوتا ہوا

صور جب پھونکا گیا
حشر کے میدان میں مجمع لگا
اب جو میں جاگا تو کیا
سویا تو کیا۔!!

سرمایۂ عشق

محمودالحسن
(راولپنڈی)

بُزرگ و برتر واعلیٰ تری جناب میں ہے
وہ ایک دل جومحبت کے پیچ وتاب میں ہے

سُنا ہے درج یہی عشق کی کتاب میں ہے
سکونِ غم میں ہے،تسکین اضطراب میں ہے

وُہ عشق جس پہ کہ کرتے ہیں ناز ہم دونوں
مرے عمل میں ہے زاہد تری کتاب میں ہے

خُدا گواہ کہ ہر گز مُسرتوں میں نہیں
وہ ایک لذّتِ پیہم جو اضطراب میں ہے

جنابِ صُوفی و مُلاّ کو کیا خبر اُس کی
جوعشق میرے دلِ خانماں خراب میں ہے

ترے لبوں میں جو رکھی ہے دستِ قدرت نے
ہے قند ہی میں وہ لذّت، نہ شہدِ ناب میں ہے

مجھے ہوئی ہے جومحسوس پیرمن میں ترے
ہے یاسمن میں ہی خوشبو، نہ وہ گلاب میں ہے

ہیں جس سے عارضِ تاباں ترے درخشندہ
وہ نُور مہر میں ہے اور نہ ماہتاب میں ہے

خراب وخستہ و بے حال ہی سہی محمودؔ
ترا غلام ہے حاضر تری جناب میں ہے

○

اور پھر......

پروین شیر
(کینیڈا)

زماں کے چاک پر رقصاں
ہے اک انبار مٹی کا
بہت تیزی سے چکراتے ہوئے
یہ ڈھیر شکلوں میں بدلتا ہے
نئے پیکر ابھرتے ہیں
نئی ہیئت بدلتے ہیں
ابھر کر پھر......
ہواؤں میں بکھرتے ہیں
بکھر کر پھر......
نئی صورت میں ڈھل جانے کی خاطر یہ
دوبارہ چاک پہ چکراتے رہتے ہیں
تماشہ یہ
ازل سے چاک پر مٹی کا جاری ہے
رہے گا
کوزہ گر تخلیق سے اپنی
نہ جانے مطمئن کیوں کر نہیں ہوتا......!

○

میں اپنے قبیلے کا رزمیہ نگار ہوں

ڈاکٹر جواز جعفری
(لاہور)

میرے قبیلے میں لوگ
صرف ایک بار پیدا ہوتے ہیں
مگر مجھے اپنی پیدائش کے تجربے سے
دوبار گزرنا پڑا
ایک بار تو میں اپنی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا
اور دوسری بار میں نے خود
بطور شاعر جنم لیا
ہر بار میں جنگ کی بھٹی کا ایندھن بنا
میری پیدائش پر دونوں بار قبیلے میں جشن منائے گئے!
میں اپنے قبیلے کا واحد رزمیہ نگار ہوں
اپنے سُورماؤں کے کارناموں کو لافانی بنانے والا
اور اپنے قبیلے کی آبرو کا رکھوالا
لوگ اپنی بیٹیوں کی قسمت
میرے دامن سے وابستہ کرنے میں
فخر محسوس کرتے ہیں!

جنگ کا لوہا گرم ہونے کے بعد
میں لڑنے والوں کی اگلی صف میں ہوتا ہوں
اور جنگ سے بھاگ جانے کا سوچ کر
میرے پاؤں پتھر کے ہوجاتے ہیں
اپنے سامنے
سورماؤں کے اُڑتے سروں کو دیکھ کر
میرے ذہن میں
نئی نظم کا مواد ترتیب پانے لگتا ہے!
میرے رجز
جنگ کی آگ کو بھڑکاتے ہیں
(جو میرے دوستوں اور دشمنوں میں یکساں مقبول ہیں)
اپنے سامنے بچی
لہو رنگ مقتل کو دیکھ کر
میرے بہادر
موت سے نہیں ڈرتے
انہیں یقیں ہے
کہ مرنے کے بعد وہ میرے اشعار میں
ہمیشہ زندہ رہیں گے
جنگ کی آگ کی لپک
میری جلد کو چاٹنے لگی ہے
میں اپنے قبیلے کی آبرو کی حفاظت کرتے کرتے
خود بھی مر جاؤں گا
کبھی نہ مرنے کے لیے!

❍

یادیں

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

وہ آئے دل میں ہمارے ہمیں خبر ہی نہ تھی
جو وار دل ہوا اُن پر انہیں خبر بھی نہ تھی

میں ہمکلام رہا ان سے راہِ الفت میں
کھلی جو آنکھ تو میری وہ ہمسفر ہی نہ تھی

ہزار بار کہا دل نے کوئے یار چلو
قدم اُٹھائے مگر ان میں کچھ سکت ہی نہ تھی

وہ آئے در پہ میرے چپ رہی زباں میری
جو دیکھا میں نے تو بولے میری گزر یہ نہ تھی

نہاں تھی بات جو دل میں لبوں پہ لا نہ سکے
جو پوچھا ان سے تو بولے میں منتظر ہی تو تھی

یوں راہ و رسم بڑھے اُن کے آنے جانے سے
ملے وہ جب بھی نگاہوں میں اک چمک ہی سی تھی

اسی ادا پہ ہوا دل کسی کا دیوانہ
جو تھی نگاہ میں شوخی وہ دلبری ہی تو تھی

ریاضؔ کیسے بھلا دوں میں بیتے لمحوں کو
جو آئے زیست میں ایسے ہمیں خبر ہی نہ تھی

○

قلبِ ماہیت

نیلم احمد بشیر
(لاہور)

میں اک جالے میں رہتی ہوں
حالانکہ مکڑی بھی نہیں ہوں
یہ تالاب بھی کہتا ہے
جس میں میرا عکس دکھائی دیتا ہے
میں تو بس اک تتلی ہوں
خوش رنگ اور خوش نما، متحرک
زندگی بھرپور، آرزو سے چور
متوالی آزادی کی
پیاری سی شہزادی سی
ادھر سے اُدھر اڑنے پھرنے، گنگنانے والی
تتلی تھی جب جنم لیا
آغازِ سفر کیا
پروں کو ہولے ہولے پھڑ پھڑایا، آزمایا
کتنے رنگ جھڑے تھے مجھ سے
آج مگر ہوں جکڑی ہوئی
جیسے میں کوئی مکڑی ہوئی

○

میں جب کسی کو۔۔۔۔

ظریف احسن (کراچی)

میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
دعا کرنے والے عقیدت سے سجتے
گلوں میں بستے، رستے مہکتے
شام کے آتے جگنو چمکتے
منت کی چادر سر پہ اٹھائے
محبت کا تعویذ دل سے لگائے
آنکھیں چرائے، نظریں بچائے
چاہت کے موتی چنتے ہی جائے
عشق کی مالا جپتے ہی جائے
بس ایک گلی کے چکر لگائے
خوابوں کا شہزادہ
محبتوں کا دلدادہ
دعا کرنے والے، آنکھوں کو جچتے
میں جب کسی کو دغا کرتے دیکھوں
دغا کرنے والے کے دل میں کدورت
عداوت کا مادہ
رنجش کی بساط بچھائے
نفرت کے مارے کچھ پیادے
بغاوت کا آمادہ
دغا کرنے والے ہر آنکھ کھٹکتے
میں جب کسی کو، دعا کرتے دیکھوں
ظریف احسن دعا کرنے والے
میری طرح ہی یہ انساں ہیں سارے
جوگی، ملنگ، درویش، صوفی
بزرگ، قلندر، سجن، سانول، ولی
یار، سائیں، ڈھولا، محبوب، پیّا
آپ، جناب دعا کرنے والے
جھلمل، جھلمل یہ سارے انساں
ظریف احسن، محبت کے محسن
یہ انسان سارے، انساں کے محسن

دَھنک کے جھُولنے میں

شبہ طراز

(لاہور)

سنو شاعر!
جو تُم لفظوں کو تھوڑا موڑ دے کر توڑ دیتے ہو
ادھورا چھوڑ دیتے ہو
یہیں سے درد اُگتا ہے،
یہیں سے کونپلیں رنج والم کی پھوٹتی، اور
آسماں سے رنگ چھنتے ہیں
زمیں دلدل اُگلتی ہے
یہیں پہ بادلوں سے پیاس جھڑتی ہے
یہیں پہ سیپ موتی جنتے جنتے ٹوٹ جاتے ہیں۔
تو پھر بارش نہیں ہوتی
تو پھر پنچھی درختوں سے کہیں اُڑ کر نہیں جاتے
تو پھر بادِ صبا رُک رُک کے چلتی ہے
سحر دم شبنمی قطرے چمن سے روٹھ جاتے ہیں
سنو شاعر!
یہیں اِک موڑ پر اک داستاں بُنتی ہوئی، مَیں
وقت کی چوپال میں آنسو سجاتی ہوں
یہیں پر ہیر گاتا ہجر کا جوگی
ملن کے خواب بوتا ہے۔۔۔۔۔
اُمیدیں نیلگوں آنکھوں سے رستے کھوجتی ہیں
ہاں مگر۔۔۔۔قرنوں اُدھر، چوپال نگری کی سبھی رسمیں تو
دہشت کو وِنی کر دی گئی تھیں۔۔۔۔۔
تو ہم کب تک محبت کے کناروں پر
ہرے لفظوں کی گیلی کشتیاں باندھیں
دھنک کے جھولنے میں کب تلک جھولیں
سنو شاعر ۔۔۔۔!

ناشتے کی میز پر

اقتدار جاوید
(لاہور)

پلک نواز
بوڑھے والدین کی نگاہ
اہلِ خاندان پر پڑے
تو
دور۔۔۔افق کی گہری گھاٹیوں سے
صبح
اپنے رنگ ونور سے لدی پھندی
نکل پڑے
مکاں، جہاں مقیم بوڑھے والدین ہوں
وہاں رُکے
رُکے تو اپنا سونے جیسا روپ
اس مکاں پر وار دے
مکاں کے سارے رنگ کو اتار دے

یہ لوگ تو عظیم شہر ہیں
عظیم شہر کا قدیم اندرون ہیں
یہاں وہاں تھڑے ہیں
جن پہ لوگ بیٹھ کر
تمام دن کی راکھ کو اڑا سکیں
کسی کے ساتھ بیٹھ کر
ذرا سا مسکرا سکیں
ذرا سا اپنے آپ کو رُلا سکیں
یہ لوگ تو سرائے کی کلید ہیں
جہاں پہ دنیا والے
اک سکوں کی رات کاٹ لیں
جو
چاروں اور گھیرتا ہے
وہ محیط پاٹ لیں

یہ لوگ تو خلا کی ثقل ہیں
فلک کا رنگ ہیں
اگر نہ ان کا ساتھ ہو
نہ دھوپ ہو کرن بھری
فلک نہ نیل رنگ ہو

یہ کون ہیں
کہ جن کی عطر سے بھری ہوا
کہ جن کا عطر سے بھرا وجود
عکس ریز ہے
کہاں سے آ رہی ہیں
ارغنون کی دُھنیں
یہ ارغوانی باغ ہے
کہ ناشتے کی میز ہے

نزار، کم بدن
جو ایک قاش سنگترے کی
ناشتے کی میز سے اٹھائیں
تو پھلوں میں رس پڑے
جو
دھیرے سے ذرا مسکرائیں
سارا خاندان ہنس پڑے!

○

وہ جومیرے گلشن کے پھول تھے

(سانحہ پشاور 2014)

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

وہ مرا چمن میرا باغ تھا
کہیں شاخ شاخ جل گئی
کہیں پتی پتی بکھر گئی
وہ بچے میرے ہی گھر کے تھے
جنہیں کالی آندھی نگل گئی
میرا گھر مرا وہ چمن لٹا
اِس بار ایسا وطن لٹا
میں دیکھتی ہوں کہاں کہاں
ایک جہاں لٹا ایک گگن لٹا
کہاں گل رکھوں اور دیے جلاؤں
میں اُن ماؤں کو کیا بتاؤں
کہ جن کی گودیں اجڑ چکی ہیں
میں کیسے اُن کا غم بٹاؤں
اُس روشنی کو کہاں سے لاؤں
میں خالی آنگن میں کیا سجاؤں
وہ جو میرے گلشن کے پھول تھے
جنہیں آندھی آ کے مسل گئی
وہ مرا چمن میرا باغ تھا
کہیں شاخ شاخ جل گئی
کہیں پتی پتی بکھر گئی

○

۱۶۔دسمبر ۲۰۱۴ء کے شہدائے پشاور کے نام

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

پھونک ڈالو دیس کے سرو و سمن!!
کیا سکھایا دین نے ایسا چلن؟؟

پھر وطن کی سرزمیں خوں رنگ ہوئی
پھر درندوں نے اجاڑا یہ چمن!
پھر فضائیں سوگ میں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں سے تر ہے پھر ہر اک سخن!

چھین سکتی ہی نہیں ہرگز خزاں!
پھول سے بچو! تمہارا بانکپن!
اُن چراغوں کو بجھا سکتا ہے کون؟
جن میں ہو اک جرأتِ خیبر شکن

اے شہیدانِ وفا تم پر سلام!
تم پہ نازاں ہے تمہارا یہ وطن،

ہے انیسؔ بے نوا کی یہ دعا!
رحم فرما، اے خدائے پنجتن

○

گمشدہ لاش

نقشبند قمر نقوی بخاری

(امریکہ)

ویسے تو ''انتقال'' کے معنی ہیں ''منتقل ہونا''، یعنی اگر کوئی شخص ایک مکان سے دوسرے مکان میں سکونت اختیار کرنے کے لیے جائے تو اس کو ''انتقال'' کہا جا سکتا ہے، لیکن اگر کسی ''منتقل'' ہونے والے سے کہا جائے:

''تمہارا انتقال ہو گیا۔۔۔مبارک باد''

تو وہ شخص یقیناً سخت فساد برپا کر سکتا ہے۔ اور مبارک باد کہنے والا اچھی خاصی مشکل میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

لہٰذا فسادات سے حفظ ماتقدم کے طور پر لفظ ''انتقال'' کو ''موت'' سے ہی مربوط رکھا جاتا ہے۔

امریکہ میں رواج کچھ ایسا ہے، کسی کی موت کے بعد اس کو ایک آدھ دن فیونرل ہوم کے سرد خانے میں رکھا جاتا ہے، تاکہ دوسرے شہروں سے متوفی کے اعزا و اقربا جمع ہو سکیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ متوفی کو نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں تو لاش کو چارپائی پر لٹا دیا جاتا ہے یا کسی مضبوط تختے پر۔ لیکن امریکہ میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ لاش کو ''لاش بردار'' صندوق میں بند کر کے سرد خانے میں رکھ دیا جاتا ہے۔

حسب ضرورت لاش کا صندوق مردہ خانے سے مسجد لایا جاتا ہے جہاں نمازِ جنازہ ہوتی ہے۔ اگر نماز جنازہ میں کوئی عرب بھی شریک ہو تو ان میں کا ایک مقتدر شخص یا مسجد کا امام۔ امریکہ کی اکثر مساجد پر عربی قابض ہیں، وہ بھی ایک خاص فرقے اور عقیدے کے عربی۔ چنانچہ نماز جنازہ کے بعد عربی امام، یا ان میں کا کوئی بزعم خود ملا، تقریر کرتا ہے، حاضرین اور شرکا کو ''موت'' کے فوائد وعواقب سے آگاہ کرتا ہے، مردے کے لواحقین کو متوفی کی مغفرت کی بشارت دیتا ہے۔

عربی تو اسلام کا ٹھیکیدار اور جنت کا نائب رضوان ہوتا ہے۔ اس نے اگر نماز جنازہ پڑھا دی تو مغفرت پکی بات ہے۔

اگر متوفی کا کوئی عزیز یا دوست اس کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو اجازت ہوتی ہے کہ اس بیان وقصیدہ خوانی میں جس قدر مبالغہ ممکن ہو کر لے۔

پھر لاش قبرستان لے جائی جاتی ہے۔ لاش لیجانے والی موٹریں بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ اپنی کار یا ٹرک پر لاش رکھی اور یہ جا وہ جا۔ فیونرل ہوم کی مرسڈیز بنز لاش بردار گاڑی یہ کام کرتی ہے اور لاش کو حفاظت و آرام کے قبرستان پہونچا دیا جاتا ہے۔

عیسائیوں کے قبرستان تو عین شہروں کے درمیان بھی ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کے قبرستان بالعموم شہر سے باہر ہوتے ہیں۔

زیادہ تر لاش بردار صندوق ایک ہی ڈیزائن اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ الا یہ کہ پس ماندگان متمول ہوں اور وہ خصوصی ڈیزائن کے صندوق استعمال کریں۔ ایسے صندوقوں میں اوپر کی لکڑی بھی اچھی قیمتی ہوتی ہے اور اندر بھی نہایت نرم اور قیمتی مخمل یا ساٹن وغیرہ عمدہ کپڑے کا استر اور نہایت اچھے گدّے لگے ہوتے ہیں۔ لیکن عام طور سے ایک ہی ڈیزائن کے صندوق استعمال ہوتے ہیں۔

جتا خاں پر اللہ کی رحمت ہوئی تو ان کا انتقال ہو گیا۔ اگرچہ رحمت کا نزول کسی قدر تاخیر سے ہوا، لیکن اس کا وقت مقرر تو نہیں، جب بھی نازل ہو جائے، عام عقیدے کے مطابق موت کا ایک دن معین ہے لیکن وہ کسی کو معلوم نہیں۔

جتا خاں بہت دن سے بیمار تھے، انہیں کبھی تو اتنی شفا ہو جاتی کہ گھر لے آئے جاتے، کبھی حالت یکبارگی ہی غیر ہو جاتی اور انہیں بھاگم بھاگ ہاسپٹل لیجایا جاتا۔ ہاسپٹل کے ڈاکٹروں کو جتا خان کے امراض اور حالات زبانی یاد ہو گئے تھے۔ ان کے پہونچتے ہی وہی سب کام دوبارہ شروع ہو جاتا جو پہلے ہو چکا ہوتا تھا۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ ہاسپٹل کے سرپرستوں کی فہرست میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کی آمد و رفت سے ہاسپٹل کو مناسب مالی فوائد حاصل ہوتے تھے۔

جتا خاں کا انتقال پُر ملال نہ صرف اعزا کے لیے بلکہ ہاسپٹل کے اسٹاف کے لیے بھی افسوس کا باعث تھا، ان کے افسوس کی وجوہات کا تذکرہ صیغۂ راز میں رہنا بہتر ہے۔

ہاسپٹل سے لاش، ایک نہایت مرصع ایمبولنس کے ذریعے سے فیونرل ہوم پہونچا دی گئی، جہاں لاش کو نہلا دھلا کر حسب معمول کفن پہنا دیا گیا۔ لاش بردار صندوق موجود تھا، لاش اس میں رکھی گئی اور وہ صندوق سرد خانے کے ایک ''خانے'' میں رکھ دیا گیا۔ اس جگہ جتا خان مرحوم کو دو روز رہنا تھا تاکہ ان کے دو تین اعزا دوسرے شہروں سے آکر تدفین میں شریک ہو سکیں۔

تیسرے دن جمعہ تھا۔ اس روز سارے اعزا و احباب جمع بھی ہو گئے تھے۔ لاش کا صندوق فیونرل ہوم کی مرسڈیز بنز میں رکھ کر مسجد لایا گیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد ان کے جنازے کی نماز امام مسجد نے بہ خضوع وخشوع پڑھائی۔ نماز کے بعد حسبِ معمول تقریر کی، متوفی کے ایک عزیز نے بھی اپنی قوت خطابت کی آزمائش کے لیے تین منٹ میں کہی جانے والی بات دس منٹ میں کہہ ہی دی۔ تب صندوق اٹھایا گیا اور بے شمار لوگوں نے اس کو اٹھا کر باہر مرسڈیز تک لیجانے میں مدد کی۔ گویا تابوت کو ''کاندھا'' دیا۔

صندوق میں تو کنڈے لگے ہوتے ہیں۔ انہیں پکڑ کر ہی صندوق

اٹھایا جاتا ہے کاندھوں پر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

قبرستان میں قبر اسی وقت تیار کی گئی تھی، قبر کھودنے کے لیے ٹریکٹر موجود رہتا ہے جو ذرا دیر میں ہی قبر کھود دیتا ہے، امریکہ میں عربوں کی ہدایات کے مطابق قبر صندوقی بنائی جاتی ہے اور اس کو بند کرنے کے لیے لکڑی کا "مضبوط" تختہ رکھا جاتا ہے اس پر مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ تختے کا "عربی مقصد" یہ ہے کہ وہ جلد ٹوٹ جائے اور قبر میں مٹی بھر جائے تا کہ اوپر قبر کا نشان باقی نہ رہے۔ ان کے مذہب میں قبر کا نشان رہنا ناجائز ہے۔

جمّا خاں کی لاش قبرستان لائی گئی۔ کار قبر کے قریب ہی آ گئی۔ وہاں لاش کو صندوق میں سے نکالا گیا اور ہاتھوں ہاتھ ان کی لاش کو قبر میں رکھ دیا گیا۔ ایک شخص جو لاش اٹھا کر رکھنے میں شریک تھا اپنے ساتھی سے بولا۔۔۔

"جمّا بھائی کا قد جیسے ذرا لانبا لگ رہا ہے۔۔۔"

"اللہ کی شان ہے۔۔۔ مرنے کے بعد وزن بھی زیادہ ہو گیا ہے۔"

کئی لوگوں نے ان کی باتیں سنیں، لیکن اب قبر کے نزدیک بلند آواز سے امام مسجد سورہ تبارک الذی پڑھنے لگے تھے اس لیے سب خاموش ہو رہے۔ طویل دعاؤں کے بعد سب نے مٹی ڈالی اور ٹریکٹر نے قبر کو بھر کر فی الحال اونچی قبر بنا دی۔

چند روز گزر گئے تھے۔

مسجد میں جو ایک شخص کفن دفن کا منتظم ہوتا ہے، اس نے جمّا خاں کے بھائی کو فون کیا۔۔۔

"میں ایک بہت افسوسناک بات کہنے والا ہوں۔۔۔" اس نے کہا وہ بھی عربی تھا۔

"اللہ خیر کرے۔۔۔ کیا بات ہے برادر؟"

"جمّا خاں کی لاش بدل گئی ہے۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" شمّا خاں نے گھبرا کر کہا

"ہوا یہ کہ آج۔۔۔ ایک اور شخص کی لاش کا صندوق اٹھا کر قبرستان لیجایا گیا، وہ لوگ عیسائی ہیں۔۔۔ انہوں نے صندوق کو قبر میں رکھ دیا، اور ساری رسومات انجام دی گئیں۔ قبر بند کرنے سے پہلے ان کے ایک عزیز نے صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو اندر لاش کسی اور کی تھی ان کے عزیز کی لاش نہیں تھی۔۔۔"

"ارے۔۔۔ یہ تو عجیب بات ہے۔۔۔ کس کی لاش تھی۔۔۔"

"شاید تمہارے بھائی جمّا خاں کی لاش ہے۔ میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔۔۔"

"ارے ارے۔۔۔ یہ کیا غضب ہوا" وہ تقریباً چیخ پڑے۔

"ہاں بہت برا ہوا۔۔۔"

"تو ہم نے جس کو دفن کیا وہ۔۔۔؟" شمّا خاں نے پوچھا

"وہ جمّا خاں نہیں تھے۔۔۔ عیسائیوں کا مردہ تھا۔۔۔"

"پھر اب کیا کریں۔۔۔؟" شمّا خاں نے پوچھا۔

"تم آ جاؤ تو ہم قبرستان چلتے ہیں، وہاں لوگ تمہارے منتظر ہیں۔"

شمّا خاں کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آئی، لیکن وہ تیار ہو کر مسجد پہونچے اور وہاں سے عربی منتظم کے ساتھ عیسائیوں کے قبرستان جہاں ایک بڑا مجمع تھا اور متوفی کے اعزا بہت برافروختہ اس کے منتظر تھے۔ شمّا خان کار سے اتر کر بہت تیزی سے قبر کی طرف گئے بہت سے لوگوں نے ان کو گھیر رکھا تھا۔

انہوں نے قبر میں جھانکا۔۔۔

جمّا خاں بہت آرام سے صندوق میں لیٹے تھے۔۔۔

"یہ تو میرا بھائی جمّا خاں ہے۔۔۔" شمّا خاں چیخے

"ہاں۔۔۔ ہمارا آدمی کہاں ہے۔۔۔؟" ایک شخص نے بڑھ کر شمّا خاں سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم مسٹر۔۔۔" شمّا خان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ میری غلطی نہیں ہے۔۔۔" شمّا خاں نے کہا

"تم نے جس لاش کو دفن کیا اس کو دیکھا نہیں۔۔۔؟" ایک شخص نے خفا ہو کر کہا۔

"تم نے دیکھے بغیر لاش کو دفن کر دیا۔۔۔"

شمّا خاں خاموش رہے واقعی انہوں نے لاش کا منہ تو دیکھا ہی نہیں تھا لیکن کسی کو بھلا ایسا شک کیسے ہو سکتا تھا کہ لاش بدل گئی ہے۔ وہ سب تو یہی سمجھتے رہے کہ لاش جمّا خاں کی ہے۔

"یہ فیونرل ہوم والوں کی غلطی ہے۔۔۔" ایک شخص نے بہت خفگی کے ساتھ اعلان کیا۔ فیونرل ہوم کا منتظم بھی موجود تھا وہ بولا:

"ہماری کیا غلطی۔۔۔ لیجانے والے نے صندوق اٹھا لیا اور لے گیا۔۔۔"

"مجھے اپنے بھائی کی لاش چاہیے۔۔۔" شمّا خاں نے مردہ آواز سے کہا۔

"ہمیں اپنے آدمی کی لاش چاہیے۔۔۔" ایک شخص بولا۔

"میں یہ لاش لیجاؤں گا۔۔۔"

"تم اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، پہلے ہمارے عزیز کی لاش لاؤ۔۔۔"

شمّا خاں اور ان کا عربی ساتھی حیران و پریشان۔۔۔ معاملے کی نوعیت ہی عجیب تھی، ایسا تو کسی نے نہ سنا نہ کسی کو اس کا حل ہی معلوم تھا۔

"ہمارے عزیز کی لاش لاؤ، تب اسے لیجا سکتے ہو۔۔۔"

"عدالت کے حکم کے بغیر۔۔۔" منتظم بولا "یہ صندوق نکالا نہیں جا سکتا۔۔۔"

یہ اطلاع سب کے لیے حیرت ناک تھی۔

"تو پھر۔۔۔ عدالت چلو۔۔۔"

ایک صدی کا قصہ

کشور کمار

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

پرڈیوسر آر۔سی۔تلوار اپنے زمانے کا ایک جانا مانا فلمساز تھا۔ ایک بار اُس نے ممبئی کے ایک مشہور گلوکار سے ایک گانا ریکارڈ کرالیا۔معاوضے کی رقم آٹھ ہزار طے ہوئی تھی۔ریکارڈنگ ختم ہونے کے بعد جب وہ گلوکار پیسے مانگنے پرڈیوسر کے پاس گیا تو پتا چلا کہ پرڈیوسر غائب۔اُس گلوکار کو فلمساز کی اس حرکت پر بڑ غصہ آیا۔اگلے روز اُسنے یہ کیا کہ وہ گھر سے نکل کر سیدھے اُس پرڈیوسر کے گھر پر پہونچا اور گھر کے باہر اونچی تان میں گانے لگا۔''ہے تلوار دے دے میرے آٹھ ہزار''۔یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک آر۔سی۔تلوار نے اُسکے آٹھ ہزار ادا نہیں کئے۔

آپ جانتے ہیں میں کس کی بات کر رہا ہوں۔میں مشہور اداکار اور گلوکار کشور کمار کی بات کر رہا ہوں۔کشور کمار جس کا اصلی نام ابھاس کمار گنگولی تھا۔یہ چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔سب سے بڑے اشوک کمار تھے جنہیں لوگ دادامنی کے نام سے جانتے ہیں۔اُسکے بعد بہن سیتا دیوی تھی جس کا بیاہ مشہور فلمساز ششادھر مکھرجی سے ہوا تھا۔اُسکے بعد انوپ کمار تھا۔ کشور کمار کا جنم 4اگست 1929 کو کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں ہوا تھا۔کشور کمار کے والد کنج لال گنگولی ایک جانے مانے وکیل تھے۔ماں گوری دیوی ایک صاحب ثروت بنگالی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔کشور کمار ابھی بالی عمر میں ہی تھا جب کہ اُسکے بڑے بھائی اشوک کمار نے بمبئی کی فلم انڈسٹری میں اپنے پیر جما لئے تھے۔اُنکا منجھلا بھائی بھی اپنے بڑے بھائی کی مدد سے فلموں میں آ گیا تھا۔کشور کمار اور اشوک کمار کی عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔اشوک کمار کے لئے تو وہ ایک بچے کی طرح تھا۔وہ اپنے بھائیوں سے ملنے کے لئے اکثر بمبئی آیا کرتا تھا۔اپنے دونوں بھائیوں کو فلموں میں کام کرتے دیکھ کر اُسکے دل میں بھی فلموں میں کام کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

دادامنی اشوک کمار نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کشور کمار کی گائیکی کی شروعات رونے سے ہوئی۔ہوا کیا کہ ایک بار کشور کمار کو چوٹ لگی۔چوٹ کیا لگی تھی اُس نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔اُسکے رونے میں یہ خوبی تھی کہ وہ سُر میں رو رہا تھا۔یہ سلسلہ کئی دنوں تک چالو رہا۔شاید یہیں سے اُسکے گلوکار بننے کی ابتدا ہوئی۔وہ کے۔ایل سہگل کو اپنا گورو ماننے لگا اور اُسی کے انداز سے گانا گانے کی کوشش کرنے لگا۔اُسنے اپنا نام ابھاس کمار سے بدل کر کشور کمار رکھ لیا اور اپنے بھائی کی مدد سے پہلی بار اُسے ایک کورس میں گانے کا موقع ملا۔1946 میں ریلیز ہوئی فلم ''شکاری'' میں اُسنے ایک چھوٹا سا رول ادا کیا۔اس فلم کے ہیرو اشوک کمار تھے۔اُسکے بعد بمبئی ٹاکیز کے بینر تلے بننے والی اگلی فلم ''ضدی'' میں اُسے اُس زمانے کے مشہور سنگیت کار کھیم چند پرکاش نے پہلا سولو گانا گوایا۔گانے کے بول تھے۔''مرنے کی دعا کیا مانگوں۔جینے کی تمنا کون کرے''۔اس فلم کے ہیرو دیوآنند تھے جسکے لئے اُسنے پلے بیک کیا تھا۔یہ گانا اُسنے خالص سہگل صاحب کے انداز میں گایا تھا۔یہ گانا ہٹ ہوا اور اسکے بعد کشور کمار کو کئی آفرس ملے مگر وہ من موجی قسم کا آدمی تھا۔اُسنے اپنے کام کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ 1949 میں پوری فیملی بمبئی شفٹ ہوئی۔اُنہوں نے کھنڈوا چھوڑ کے بمبئی میں باضابطہ سکونت اختیار کی۔انہی دنوں اشوک کمار نے اپنی ایک فلم میں کشور کمار کو ایک چھوٹا موٹا رول ادا کرنے کے لئے کہا۔پہلے تو وہ مان گیا۔جب فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو وہ ایسے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اشوک کمار کی خواہش تھی کہ کشور کمار بھی اُسی کی طرح ایک ایکٹر بنے۔وہ اُسے مناتا رہا۔بالآخر کشور کمار کو اپنے بڑے بھائی نے فلموں میں کام کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔''آندولن'' نام کی ایک فلم میں اُسے ہیرو کے رول میں پیش کیا گیا۔اس فلم کے ہدایت کار فنی مجمدار تھے۔یہ فلم 1951 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کی نمائش کے بعد کشور کمار کو کئی فلموں کے آفرس ملے مگر وہ ایکٹنگ سے کہیں زیادہ گلوکاری میں اپنا ہنر آزمانا چاہتا تھا۔بمل رائے جو کہ فلم ''نوکری'' بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔اُنہوں نے کشور کمار کو ہیرو کے رول میں سائن کیا۔کشور کمار چاہتا تھا کہ وہ اس فلم میں بھی اپنے گانے خود ہی گائے۔اس فلم کے موسیقار سلیل چودھری اس بات کے حق میں نہیں تھے۔وہ کشور کمار کو گلوکار تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کشور کمار نے موسیقی کی کوئی باضابطہ ٹریننگ نہیں لی ہے۔وہ باتھ روم گویا ہے اسلئے اُس سے گانا گوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہاتا۔جب کشور کمار کو لگا کہ سلیل چودھری اُسے گانے کا موقع نہیں دینے والے ہیں تو اُس نے اپنے بڑے بھائی کو رجوع کیا۔اشوک کمار کی مداخلت سے کشور کمار کو ایک گانا گانے کا موقع ملا جو کہ ہیمنت کمار گانے والے تھے۔گانے کے بول تھے۔''چھوٹا سا گھر ہوگا''۔یہ گانا بعد میں کافی مقبول ہوا۔

یہ 1950 کی بات ہے۔ایس ڈی برمن اکثر اشوک کمار کے گھر پر آیا کرتے تھے۔ایک دن اُنہوں نے اشوک کمار کے گھر میں کسی کو سہگل صاحب کے انداز میں گاتے ہوئے سنا تو برمن دا نے دادامنی سے پوچھا کہ یہ کون گا رہا ہے۔دادامنی نے کہا کہ یہ اُنکا چھوٹا بھائی ہے جس کا نام کشور کمار ہے۔اُسنے کشور کمار کو بلا کر اُسے آشیرواد دیا مگر ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ سہگل صاحب کو نقل کرنے کی کوشش نہ کرے۔وہ اپنے اسٹائل سے گائے تو بہتر رہے گا۔کشور کمار نے برمن دا کی بات گرہ میں باندھ لی اور اپنے اسٹائل میں گانے کی کوشش کرنے لگا۔اُنکے منجھلے بھائی انوپ کمار کو انگریزی گانے سننے کا

بہت شوق تھا۔ وہ ٹیکس مارٹن اور جمی روجرس کے گانے اکثر سنا کرتا تھا۔ان ہی گانوں کو سن کر اُسمیں یاڈلنگ کا اسٹائل پیدا ہوا۔(یاڈلنگ یعنی گانے کے ساتھ منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا)۔ اسی سال برمن دادا نے کشور کمار کی آواز میں فلم ''منیم جی'' کے گانے گوائے۔اس فلم کا ہیرو دیو آنند تھا۔اس فلم کے سنگیت نے تہلکہ مچا دیا۔فلم تو زبردست ہٹ ہوئی ساتھ ہی کشور کمار کا ستارہ بھی چمک اُٹھا۔اُسی سال دیو آنند کی ایک اور فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' ریلیز ہوئی جس کا ہیرو دیو آنند تھا اور موسیقار ایس ڈی برمن تھے۔اس فلم کے گانے بھی دھوم مچا بیٹھے۔اُسکے بعد فلم ''گھر نمبر۴۴'' میں بھی برمن دادا نے کشور کمار کو ہی گوایا۔اس فلم کے گانے بھی ہٹ ثابت ہوئے۔یہ فلم 1955 میں ریلیز ہوئی۔

کشور کمار کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔فلم ''فنٹوش'' کا گانا ''دکھی من میرے سن میرا کہنا۔جہاں نہیں چینا وہاں نہیں رہنا'' نے کشور کمار کو صف اول کے گلوکاروں میں لا کے کھڑا کر دیا۔یہ برمن دادا کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اُسنے ایک پتھر کو تراش کر ہیرا بنا ڈالا۔کشور کمار ایک کے بعد ایک کامیابی کی منزل پار کرتا چلا گیا۔1957 میں اُسکی دو فلموں نے دھوم مچا دی۔یہ دو فلمیں تھیں ''نو دو گیارہ'' اور ''پینگ گیسٹ''۔دونوں فلموں میں بطور ہیرو دیو آنند تھے اور سنگیت برمن دا نے ترتیب دیا تھا۔اسی سال کشور کمار کی دو فلمیں بطور کلاکار بھی ریلیز ہوئیں۔یہ فلمیں تھیں ''نئی دلی'' اور ''آشا''۔ایس ڈی برمن کو چھوڑ کے کئی اور مشہور موسیقار بھی کشور کمار کی آواز کے قائل ہو چکے تھے۔شنکر جے کشن جن کا من پسند گلوکار مکیش تھا اُنہوں نے بھی فلم ''نئی دلی'' میں کشور کمار سے گانے گوائے۔اسی طرح سی رامچند رنے بھی فلم ''آشا'' میں کشور کمار سے کئی بہترین گانے گوائے۔اس فلم کا گانا ''انا مینا ڈیکا'' آج بھی صدابہار گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

فلم ''چلتی کا نام گاڑی'' واحد فلم تھی جسمیں تینوں بھائیوں نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔یہ فلم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس فلم کے موسیقار بھی ایس ڈی برمن تھے۔اس فلم کے سبھی گانے کشور کمار نے گائے تھے جو بیحد مقبول ہوئے۔اس فلم کی ہیروئن مدھوبالا تھی۔دونوں اس فلم میں ایک دوسرے کے بیحد قریب آ گئے۔یہ فلم اُنکی ذاتی پروڈکشن میں بنی تھی۔اس فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا۔اس فلم کے سبھی گانے آج بھی بڑے چاؤ سے سنے جاتے ہیں۔خاص طور سے یہ گانا ''دے دے میرے پانچ روپے بارہ آنے''۔

کشور کمار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنکی قسم کا انسان تھا۔وہ عجیب طرح سے پیش آتا تھا۔ایک بار مشہور فلمساز ہدایت کار اینچ۔ایس۔رویل اُنکے کچھ پیسے ادا کرنے اُنکے گھر پر چلے گئے تو کشور کمار نے چپ چاپ پیسے لئے۔جب رویل صاحب نے جاتے ہوئے اُس سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو کشور کمار نے غصے میں آ کر اُسکا ہاتھ اپنے منہ میں ڈال کر اُسے کاٹ ڈالا اور پھر چلّا کر بولا۔''کاغذ پر میرا سائن نہیں دیکھا کیا''۔رویل صاحب اُسکے اس رویے سے بھونچکے رہ گئے۔اسی طرح ایک بار مشہور فلمساز جی پی سپی اُس سے ملنے اُس کے بنگلے پر چلے گئے۔وہ جونہی وہاں پہونچے تو کشور کمار کار میں بیٹھ کر نکل گیا۔سپی صاحب نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکا نہیں بلکہ پوری رفتار سے اپنی کار دوڑانے لگا۔سپی صاحب نے مُڈھ ایرلینڈ تک اُسکا پیچھا کیا۔آخر ایک سنسان جگہ پر اپنی گاڑی روک کر وہ کھڑا ہو گیا۔سپی صاحب نے قریب آ کر اُس سے پوچھا کہ وہ اس طرح کا برتاؤ کیوں کر رہا ہے تو کشور کمار نے اُسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا اور ساتھ میں اُسے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ یہاں سے چلے نہیں گئے تو وہ پولیس کو بلا لے گا۔سپی صاحب اُس کے اس رویے سے ہکا بکا رہ گئے۔وہ چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔اگلے روز کشور کمار سپی صاحب کی ریکارڈنگ پر پہونچ گئے۔سپی صاحب جلے بھنے بیٹھے تھے۔اُسنے کشور کمار کو دیکھ کر پوچھا کہ کل اُس نے اسطرح کا برتاؤ کیوں کیا تو جواب میں کشور کمار نے سپی صاحب کو ہی غلط ٹھہرا دیا۔اُسنے سپی صاحب سے کہا کہ کل اُنہوں نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔وہ تو کل بمبئی میں تھا ہی نہیں۔وہ تو کھنڈالا میں تھا۔سپی صاحب اُسکا منہ تکتے رہ گئے۔

ایک بار ایک فلمساز نے کشور کمار کے رویے سے عاجز ہو کے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔فلم ساز نے کشو کمار پر الزام لگایا کہ وہ کام کے دوران ڈائرکٹر سے تعاون نہیں کرتا ہے اور اپنی من مانی چلاتا رہتا ہے۔عدالت نے یہ حکم صادر فرمایا کہ کشور کمار اپنے ہدایت کار کے ہر حکم کا پالن کرے گا۔فلم شوٹنگ کا قاعدہ یہ ہے کہ شاٹ شروع ہونے سے پہلے ڈائرکٹر اسٹارٹ بولتا ہے تو سبھی حرکت میں آ جاتے ہیں۔جب شاٹ پورا ہوتا ہے تو ڈائرکٹر ''کٹ'' بولتا ہے۔اگلے روز شاٹ ایسا تھا کہ کشور کمار کار میں سوار ہوتا ہے اور تھوڑی دور جا کر اُسے کار کو روکنا ہے۔جب شاٹ شروع ہوا تو ڈائرکٹر نے اسٹارٹ بول دیا۔کشور کمار نے ہدایت کار کی ہدایت کے مطابق کار اسٹارٹ کی۔کار چلتی گئی۔ہدایت کار ہڑبڑاہٹ میں کٹ کہنا بھول گیا۔بس پھر کیا تھا۔کشور کمار نے اپنی گاڑی 90 کلومیٹر دوڑائی۔وہ بمبئی سے سیدھے کھنڈالا پہونچ گیا اور کھنڈالا میں جا کر اُس نے اپنی کار روک لی۔ایسے تھے کشور کمار۔

1950 میں کشور کمار نے بنگال کی ایک مشہور گلوکارہ اور ایکٹرس روما گوہاٹھکراتا سے شادی کی گانٹھ باندھ لی۔ان کا ایک بیٹا ہوا جس کا نام امیت کمار رکھا گیا۔یہ شادی آٹھ سال سے زیادہ نہ چلی۔1958 کے بعد وہ اور روما گوش الگ الگ رہنے لگے۔بیٹا امیت کشور کمار کی دیکھ ریکھ میں پلتا رہا جب کہ روما گوش بنگال میں ہی اپنے کام میں مصروف رہی۔اسی بیچ وہ مدھوبالا کے قریب آ چکا تھا۔مدھوبالا کو اُس کا پاگل پن پسند تھا۔اس عشق کی ابتدا فلم ''چلتی کا نام گاڑی'' سے ہوئی۔اصل میں مدھوبالا اپنی پہلی محبت میں چوٹ کھانے کے بعد ایک سہارے کی تلاش میں تھی۔اُسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو اُسے ہر طرح سے خوش رکھ سکے۔کشور کمار مرنجاں مرنج قسم کا آدمی تھا۔وہ کوئی نہ کوئی

اُلٹی سیدھی حرکت کرکے دوسروں کا ہنساتا رہتا تھا۔ 1958 سے لے کے 1961 تک اُن کے بیچ یہ پیار کا سلسلہ چلتا رہا۔اس بیچ اُنہوں نے ایک اور فلم کی جس کا نام جھمرو' تھا۔

کشور کمار کی غلط عادتوں کی وجہ سے پرڈیوسر پریشان ہونے لگے۔ وہ شوٹنگ پر ہمیشہ لیٹ آتا تھا۔پھر شوٹنگ ڈیٹس بھی خلط ملط کرکے رکھ دیتا تھا۔ پتا چلا کہ جس پرڈیوسر کو اُس نے ڈیٹ دی ہے وہ وہاں نہیں پہونچا بلکہ دوسرے فلمساز کے سیٹ پر پہونچ گیا۔اُسکی اس لیٹ لطیفی کی وجہ سے اُسکی فلمیں شکار ہونے لگیں اور اُسکی فلمیں لگا تار فلاپ ہونے لگیں۔وہ ایک فلم کر رہا تھا جس کا نام''ہاف ٹکٹ'' تھا۔اس فلم کے پرڈیوسر اور ڈائرکٹر کشور کمار سے بہت دکھی اور پریشان تھے۔اس فلم کا جو سرمایہ کار تھا اُس کا نام کالی داس بتوابیل تھا۔اُسنے کشور کمار کے گھر پر انکم ٹیکس کا چھاپہ ڈلوادیا۔کچھ دن بعد کشور کمار نے اُسے اپنے گھر پر مدعو کیا اور اُسے دو گھنٹے تک کمرے میں بند کرکے رکھا۔دو گھنٹے کے بعد اُسنے اُسے آزاد کیا اور جاتے جاتے اُسے تنبیہ کی کہ وہ آئندہ اُسکے گھر میں قدم نہ رکھے۔

کشور کمار نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا کے رکھا تھا کہ دام ملیں تو کام نہیں تو رام رام۔اصل میں شروعاتی دور میں کئی لوگوں نے اُسکا معاوضہ ادا نہیں کیا تھا اسلئے وہ بنا پیسے لئے کام کرنے کے لئے راضی نہیں ہوتا تھا۔اُسکا ایک ڈرائیور تھا جس کا نام عبدل تھا۔عبدل اُسکا سب کچھ تھا۔دوست بھی سیکرٹری بھی، ناصح بھی ہمراز بھی۔وہ جب کسی بھی گانے کی ریکارڈنگ میں پہونچ جاتا تھا تو گانا ریکارڈ کرنے سے پہلے وہ عبدل سے پوچھتا۔چائے ٹھنڈی کہ گرم؟ اگر وہ کہتا ٹھنڈی تو مطلب پیسے نہیں ملے اگر گرم تو مطلب پیسے ملے۔اگر پیسے نہیں ملے تو وہ گلے کی خرابی کا بہانہ کرکے اسٹوڈیو چھوڑ کے بھاگ جاتا تھا۔اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک فلم میں وہ بطور اداکار کام کر رہا تھا۔شوٹنگ کے دوران اُسے پتا چلا کہ پرڈیوسر نے اُسکا آدھا پیسہ روک لیا ہے۔دوسرے دن جب وہ سیٹ پر آیا تو اُسنے چہرے کے ایک طرف میک اپ کروایا تھا۔ہدایت کار نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کشور کمار برجستہ بولے۔آدھی پےمنٹ، آدھا میک اپ۔پورا پیسہ پورا میک اپ۔ایسے تھے کشور کمار۔فلم''بھائی بھائی'' کے ہدایت کار ایم۔وی۔رمن کو پانچ ہزار روپے کشور کمار کو ادا کرنے تھے۔کشور کمار نے سیٹ پر آکر سین کرنے سے منع کر دیا۔اس فلم میں اشوک کمار بھی کام کر رہے تھے۔اشوک کمار نے بھائی کو سمجھا دیا کہ وہ یہ سین کرلے۔کشور کمار نے کچھ نہیں کہا۔وہ ہرن کی طرح سیٹ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک قلانچیں بھرتا ہوا چلا گیا پھر سیٹ کے آخری کونے پر پہونچ کر وہ چلایا۔پانچ ہزار روپے اور پھر سیٹ سے چھو منتر ہوگیا۔

ہری کیش مکھر جی بہت ہی قدآور ڈائرکٹر مانے جاتے تھے۔کشور کمار خود اُنکی شخصیت سے متاثر تھے۔یہ ہری کیش مکھر جی ہی تھے جس نے کشور کمار کو فلم ''مسافر'' میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔تب کشور کمار کی گنتی سی گریڈ ایکٹروں میں کی جاتی تھی۔ہری کیش مکھر جی این۔سی۔سپی کی فلم ''آنند'' بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔وہ محمود اور کشور کمار کو لیکر یہ فلم بنانے کا من بنا چکے تھے۔وہ اس زعم میں تھے کہ جب وہ کشور کمار کو اپنی فلم میں کام کرنے کے لئے کہے گا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے گا۔رشی کیش مکھر جی ایسے ہدایت کار تھے جن کے ساتھ کام کرنے میں کوئی بھی کلاکار فخر محسوس کرتا تھا۔کشور کمار بذات خود رشی دا کا گرویدہ تھا اور اُنکی بیحد عزت کرتا تھا اسلئے رشی دا کے لئے کشور کمار کو سائن کرنا کوئی بڑا مسلہ نہ تھا۔ایک دن این۔سی۔سپی نے رشی دا سے کہا کہ وہ جا کر کشور کمار سے مل لے اور اُسے اس فلم کے لئے سائن کرالے۔رشی دا کشور کمار سے ملنے اُسکے بنگلے پر پہونچ گئے۔جب وہ بنگلے پر پہونچ گئے تو گیٹ پر کھڑے واچ مین نے رشی دا کو دیکھ کر اپنی ناک بھوں سکیڑ لی اور اُنہیں اندر جانے نہیں دیا بلکہ اُنہیں بڑی بدتمیزی سے وہاں سے بھگا دیا۔رشی دا اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکے۔اُنہوں نے سپی صاحب سے کہا کہ وہ زندگی میں اب کبھی کشور کمار کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔محمود صاحب کو جب اس واقعے کا پتا چلا تو اُس نے بھی اس فلم میں کام کرنے سے منع کر دیا۔رشی کیش مکھر جی نے نئے کلاکار لینے کا فیصلہ کیا۔سپی صاحب نے اپنے ڈائرکٹر کا ساتھ دیا اور رشی دا نے راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔اصل میں ہوا کیا تھا کہ ایک بنگالی نے کشور کمار سے بنگال میں ایک اسٹیج شو کروایا تھا۔اسٹیج شو تو ہوا مگر کشور کمار کو پیسے نہیں ملے اور اُنہیں خالی ہاتھ بنگال سے لوٹنا پڑا۔بمبئی پہونچ کر کشور کمار نے اپنے دربان کو ہدایت دی کہ وہ بنگالی دوبارہ اُسکے گھر کے آس پاس اگر دکھائی دے تو اُسے دھکے مار کر بھگا دیا جائے۔دربان نے رشی کیش مکھر جی کو غلطی سے وہی بنگالی سمجھا اور اُنہیں گھر کے باہر سے ہی بھگا دیا۔

کشور کمار بخیل ضرور تھا مگر کبھی کبھی وہ سخی کو بھی مات دیتا تھا۔اُسنے راجیش کھنہ کی ذاتی فلموں میں جب بھی گانے گائے اُس نے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔اسی طرح ڈینی سے بھی اُنہوں نے کبھی بھی گانا گانے کے پیسے نہیں لئے۔ایک بار اداکار سے بنے فلمساز بپن گپتا کی فلم''دال میں کالا'' پیسہ نہ ملنے کے سبب بیچ میں ہی لٹک گئی۔کشور کمار نے بپن گپتا کی بیس ہزار روپے دیکر مالی اعانت کی۔اسی طرح ارون کمار مکھر جی نام کا ایک گم نام اداکار جب مر گیا تو کشور کمار اُسکے گھر میں باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہا۔کشور کمار کے رنگ ہی نرالے تھے۔اُسنے اپنے بنگلے کے باہر ایک تختی لگا کے رکھی تھی جس پر لکھا تھا۔''کشور کمار سے بچ کے رہیے''۔کہا جاتا ہے کہ ایک دن کشور کمار اپنی ہی فلم کا گانا ریکارڈ کرنے جب اسٹوڈیو پہونچ گئے تو بہت دیر تک وہ عبدل کے اشارے کا انتظار کرتے رہے کہ پیسے ملے کہ نہیں۔جب عبدل کی طرف سے کوئی اشارہ نہ ملا تو وہ ریکارڈنگ چھوڑ کے بھاگا۔جب عبدل کو پتا چلا تو وہ اُسکے پیچھے بھاگا اور اُسے ایک جگہ روک کے سمجھایا کہ یہ فلم کسی اور کی نہیں بلکہ اپنی ہے۔یہ بات سن کے کشور کمار واپس اسٹوڈیو چلا آیا اور اپنی فلم کا گانا ریکارڈ کیا۔

اسی بیچ مدھولا کی طبیت اچانک خراب ہوگئی۔ ایک دن شوٹنگ کرتے کرتے اُسنے خون کی قے کر دی۔ اُسے اسپتال پہونچا دیا گیا جہاں یہ تشخیص ہوئی کہ اُس کے دل میں ایک سوراخ ہے۔ اُن دنوں اس طرح کی بیماری کا علاج بہت کم میسر تھا۔ مدھو بالا جانتی تھی کہ اُسکی زندگی کم بچی ہے اسلئے وہ کشور کمار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ دلیپ کمار کو تڑپانے کے لئے یہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ کشور کمار بھی مدھو بالا سے شادی کرنے لئے اتاوٗلا ہوا جارہا تھا۔ اُسنے اپنی پہلی بیوی سے طلاق بھی لی تھی۔ مدھو بالا کے والد کا اصرار تھا کہ وہ پہلے علاج معالجے کے لئے لنڈن چلی جائے۔ پھر وہاں سے لوٹنے کے بعد کشور کمار سے شادی کر ڈالے۔ مگر مدھو بالا بضد تھی کہ وہ پہلے شادی کرے گی پھر لنڈن چلی جائے گی۔ عطا اللہ خان کو بیٹی کی ضد کے آگے جھکنا پڑا۔ 1960 میں اُنہوں نے کورٹ میں جا کر شادی کر لی۔ کشور کمار کے گھر والے اس شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ اُسکی وجہ یہ تھی کہ مدھو بالا مسلمان تھی۔ اپنے گھر والوں کو خوش کرنے کے لئے اُنہوں نے ہندو رسم رواج کے مطابق بھی سات پھیرے لئے مگر حالات بدستور رہے۔ شادی کے فوراً بعد مدھو بالا علاج معالجے کے لئے لنڈن کے لئے روانہ ہوئی۔ کشور کمار اُسکے ساتھ تھا۔ جب وہ لنڈن سے لوٹی تو کچھ ہی ہفتے اپنے سسرال میں گزارنے کے بعد وہ واپس اپنے میکے لوٹ گئی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کشور کمار کے گھر والوں کی سرد مہری نے مدھو بالا کو اتنا دل برداشتہ کر دیا کہ وہ اپنے پتی کا گھر چھوڑ کے چلی گئی۔ غرض لوگ طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ لنڈن میں ڈاکٹروں نے کشور کمار کو متنبہ کیا تھا کہ وہ مدھو بالا سے کسی قسم کا جسمانی تعلق بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو مدھو بالا کی جھٹ پٹ موت ہو سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدھو بالا جوان تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ کشور کمار ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کر کے اُسے ٹالتا رہتا تھا۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اسنے مدھو بالا کو اُسکے میکے میں جا کر چھوڑ دیا۔ اب اسمیں سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا یہ تو اوپر والا ہی جانے۔

کشور کمار کی ذاتی زندگی خوشحال نہ رہی۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا تھا۔ اُسکا کوئی دوست نہ ساتھی تھا۔ وہ اکھل کھرا کر زندگی جی رہا تھا۔ اُسکے قریبی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پیڑ پودوں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک بار ایک خاتون جرنلسٹ اُسکا انٹرویو لینے آئی تو وہ اُسے اپنے باغیچے میں لے گیا اور اُسے کئی پیڑوں سے متعارف کرایا جو کہ اُسکے دوست تھے۔ اُسنے ان پیڑوں کے باقاعدہ نام بھی رکھے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ رات کو اُٹھ کر گھر کے برتن گننے لگتا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ سنکی قسم کا آدمی تھا۔ 23 فروری 1969 کو مدھو بالا اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔ اُسکے گزر جانے کے بعد کشور کمار نے یوگیتا بالی نام کی ایک ایکٹریس سے تیسری بار بیاہ رچایا۔ یہ شادی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چلی۔ یہ شادی 4 اگست 1976 سے 1978 تک محض دو سال تک چلی۔

یوگیتا بالی نے کشور کمار سے الگ ہو کے ایک مشہور ادا کار متھن چکرورتی سے شادی کر ڈالی۔ 1980 میں اُسنے ایک اور مشہور اداکارہ لینا چندر وارکر سے چوتھی شادی کی جس سے اُنکا ایک بیٹا ہوا جس کا نام سمیت رکھا گیا۔

1970 سے لے کے 1980 تک کشور کمار نے ہندی فلموں کے تمام ٹاپ کے ایکٹروں کے لئے گانے گائے۔ وہ چاہے امیتابھ بچن ہو یا راجیش کھنہ۔ فلم ''آرادھنا'' سے دونوں کا پنر جنم ہوا۔ راجیش کھنہ راتوں رات اسٹار بن گیا جب کہ کشور کمار نے اپنی کھوئی ہوئی شہرت واپس پالی۔ ایس ڈی برمن نے کشور کمار کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا۔ ''آرادھنا'' کی کامیابی کے بعد کشور کمار نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ مقبولیت کے بام عروج پہ تھا۔ اسی دوران اُسے سنجے گاندھی کا فرمان ملا کہ وہ اُنکے ایک پروگرام میں گانا گائے۔ سنجے گاندھی کا اُس وقت ایسا دبدبہ تھا کہ کوئی مائی کا لال اُنکا فرمان ٹال نہیں سکتا تھا۔ کشور کمار تو کشور کمار تھا۔ وہ کہاں ڈرنے والا تھا۔ اُسنے اپنے اصول کے مطابق پیسے کی ڈیمانڈ کی۔ سنجے گاندھی کے چیلے چانٹے کشور کمار کی اس گستاخی سے چراغ پا ہو اُٹھے۔ پھر کیا تھا کشور کمار پر یک بیک سیاسی قہر نازل ہوا۔ اُن دنوں سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہی تشہیر کا ذریعہ تھا۔ سنجے گاندھی کے اشارے پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کشور کمار کے گانوں کا بلیک آوٹ کیا گیا۔ یہ خبر پھیلتے ہی فلم انڈسٹری میں کھلبلی مچ گئی۔ جن پرڈیوسروں نے کشور کمار کو سائن کیا تھا وہ اُسے خارش زدہ کتا سمجھ کر اُس سے دور دور بھاگنے لگے۔ کشور کمار بیکار ہو کے رہ گیا۔ کوئی اور ہوتا تو جا کے ان بدمست سیاست دانوں کے تلوے چاٹتا۔ اُنکی تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملاتا۔ یہ تو کشور کمار تھا جو جتنا مذاقیہ تھا اُتنا ہی ضدی بھی تھا۔ اُس پر پابندیاں لگ گئیں پھر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ تو بھلا ہو رفیع صاحب کا جو کہ یہ خبر سنتے ہی دلّی بھاگے اور سبھی لوگوں سے مل کر اور اُنہیں سمجھا بجھا کر کشور کمار پر سے پابندی ہٹوائی۔

کشور کمار ہمہ جہت فن کار تھا۔ اُسنے ابتدا گلوکاری سے کی۔ بعد میں اُسنے اداکاری میں بھی اپنا ہنر آزمایا۔ پھر وہ پرڈیوسر، ڈائرکٹر، اسکرپٹ رائٹر اور گیت کار بھی بنا۔ اُسنے کئی فلموں میں موسیقی بھی دی۔ اُسنے اپنے ذاتی بینر کے تلے کئی فلمیں بنائیں۔ ''جھمرو''، ''بڑھتی کا نام داڑھی'' (1978) ''دور وادیوں میں کہیں'' (1980) ''زندگی'' (1981) اور ''ممتا کی چھاوں میں''۔ اس فلم کے لئے اُسنے امیتابھ بچن سے مہمان اداکار کے طور پر فلم میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ امیتابھ بچن نے اُسکی درخواست ٹھکرا دی۔ کشور کمار نے اسکے بعد اُسکے لئے گانے نہیں گائے۔ اسی طرح جب یوگیتا بالی نے اُس سے طلاق لے کر متھن چکرورتی سے شادی کی تو کشور کمار نے اُسکے لئے بھی کئی سال تک پلے بیک نہیں دیا۔ بطور اداکار اُسنے بہت ساری فلموں میں کام کیا۔ اُسکے ساتھ مزاحیہ اداکار کا لیبل لگا ہوا تھا جب کہ سچ یہ بھی ہے کہ اُسنے جتنی بھی سنجیدہ فلموں میں کام کیا وہ بے مثال تھا۔ کشور کمار نے کل ملا کر 92 فلموں میں بطور اداکار کام

کیا۔دس فلموں میں سنگیت دیا۔اُسنے ہندی کے علاوہ مراٹھی، بنگالی ، آسامی، گجراتی، کنڈا، بھوجپوری، ملیالم، اُڑیا اور اُردو زبان میں گانے گائے۔کتنے گانے گائے اُنکا حساب لگانا مشکل ہے۔اُسنے آٹھ فلم فیئر ایورڈ حاصل کیئے۔اُسے مدھیہ پردیش سرکار نے لتا منگیشکر ایورڈ سے نوازا۔

1969 میں فلم ''آرادھنا'' کی ریلیز کے بعد کشور کمار کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔ایس۔ڈی۔برمن کے انتقال کے بعد اُنکے بیٹے راہول دیو برمن نے کشور کمار کی آواز کو ایک نئی رفعت اور سمت دے دی۔کشور کمار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ محمد رفیع،مکیش،طلعت محمود بے کار ہو کر رہ گئے۔مزے کی بات یہ ہے کہ کشور کمار نے سنگیت کی بنیادی تعلیم حاصل کیئے بنا سنگیت کی دنیا میں اتنا اونچا مقام پایا۔اُسنے ہر طرح کے گانے گائے۔شوخ، چنچل، چلبلے، دکھی ،سنجیدہ رومانٹک اور کلاسیکل گانے اور وہ بھی خاص مہارت کے ساتھ۔اُسنے سبھی سنگیت کاروں کے ساتھ کام کیا۔وہ ہر سنگیت کار کے معیار پر کھرا اُترا۔

بمبئی فلم نگری کا یہ چارلی چپلن زیادہ دنوں تک جی نہ سکا۔13 اکتوبر 1987 کو اشوک کمار کے گھر میں اُنکا 76 واں جنم دن منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔خبر یہ آئی کہ شام کے چار بج کے پنتالیس منٹ پر کشور کمار کی حرکت قلب بند ہونے سے موت ہوگئی۔جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ دادامنی کشور کمار کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے۔اس خبر نے اُن کی کمر توڑ کے رکھدی۔کشور کمار کی موت کے بعد اُنہوں نے کبھی اپنا جنم دن نہیں منایا۔

کشور کمار ذاتی زندگی میں جیسے بھی رہے ہوں ، اُسنے فلم سنگیت کو اپنی آواز سے مالا مال کر کے رکھ دیا۔آج بھی لوگ کشور کمار کی آواز کی نقل کر کے اپنی روٹی روزی چلاتے ہیں مگر کشور کمار بار بار نہیں بلکہ ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے۔اُسکی شوخ، چنچل اور لوچ دار آواز ہمارے کانوں میں تب تک گونجتی رہے گی جب تک اس دنیا میں سنگیت موجود ہے۔

- بقیہ -

''مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی''

خصوصیت اُردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے حقیقت میں وہ اُردو شاعری کے دَورِ جدید کے بانی اور موجد ہیں۔انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملک اور قوم کی اصلاح میں صرف کر دیا اور اس کا نتیجہ ہے وہ غیر فانی اور عدیم المثال کتاب ''مدوجزر اسلام'' المعروف بہ مسدس حالیؔ جس کی نسبت سر سید علیہ الرحمۃ نے بجا فرمایا ہے کہ قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لایا تو میں مسدس حالیؔ پیش کردوں گا۔مرحوم کے مقدمہ شعروشاعری نے شعراء کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہوگیا اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے جس کی مثال میں دورِ حاضر کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبالؔ کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔حالیؔ کے کام میں تعصبِ مذہبی کا شائبہ بھی نہیں ہے اور ان کے پندونصائح سے تمام اہل وطن یکساں فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔میرے نزدیک یہ سب سے بڑا سبق ہے جو ہم کو مرحوم کی زندگی سے لینا چاہئے کیوں کہ اگر ہم آپس میں رواداری کا برتاو کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے سارے جھگڑے مٹ جائیں گے۔ہمارے بزرگوں نے اسی ملک میں ہزار برس تک باہم شیر و شکر رہ کر زندگی بسر کی ہے کیا وہ اپنے مذہب کے سچے پرستار نہ تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ہر مذہب نکو کاری کی تلقین کرتا ہے، ہر مذہب ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے تو پھر کیا ہم ان اصول اصلیہ کے اشتراک کے باوجود بھی لکم دینکم ولی دین کے زریں اصول پر کار بند نہیں ہوسکتے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا برتاو نہیں کرسکتے۔''اس تقریر کے بعد حالیؔ اسکول میں بڑے پیمانہ پر ایٹ ہوم ہوا اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔راقم اس تحریر کے آخر میں یہی کہے گا۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گُل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس سے پہلے میرے کئی احباب اور شناساؤں نے اس کے مشمولات کو انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا اور مجھے تہنیت کے کئی فون آ چکے تھے۔ اردو رسائل میں چہارسو ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آج کے اس تجارت اور منفعت کے دور میں شاید دنیا کا یہ واحد ادبی جریدہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ بس دلِ مضطرب اور نگاہ شفیانہ کی ضرورت ہے۔ غالب نے بہت عرصہ پہلے کہا تھا:

سُرمہ مُفت نظر ہوں مری قیمت کیا ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

معلوم نہیں اب تک کتنی آنکھیں آپ کی عنایات کا بارِ احساں اُٹھا چکی ہیں۔ آپ نے اس بار میری تحریروں کا انتخاب اور میرے سوانحی حالات اور بہت سے اہلِ قلم کے تاثرات شائع کر کے میری قدر افزائی کی ہے جس کے لیے نہایت ممنون ہوں۔ اس سلسلے میں برادرِ عزیز نند کشور وکرم کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے آپ کے اس یادگار نمبر کے لیے بہترین مواد فراہم کیا اور کم وبیش ساٹھ صفحات میرے بارے میں شائع ہوئے۔ سرورق کی تصاویر الگ رہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے حیدرآباد دکن کا میں واحد ادیب ہوں جسے آپ کے خصوصی گوشے میں جگہ پانے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ ویسے آپ کے رسالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مضامین اور نظم ونثر سرحدوں کے پابند نہیں۔

میرے بعض قدر دانوں کو شکایت رہی کہ میرا پتہ اور فون نمبر اس میں شامل ہونے سے رہ گئے جس کی وجہ سے ان کو مجھ سے ربط پیدا کرنے اور مبارک باد دینے میں دشواری پیش آئی۔

مجتبیٰ حسین

11-5-152/3. Flat No. B-107, Royal Orchid
Red hills, Hyderabad-500004 (India)
Tel: 040-23396633 Mobile: 0949-008-6633

میرے بہت ہی پیارے گلزار، ساری دعائیں تمہارے لیے۔
نامعلوم یہ کس کے شعر کا مصرع ہے:

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اب یہ جناب مجھے معلوم نہیں کہ آپ قتل کر رہے ہیں یا کرامات البتہ یہ ضرور بتلا سکتا ہوں کہ تازہ چہارسو قریب قریب سارا ہی ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ مجتبیٰ صاحب نا صرف لاجواب انسان ہیں بلکہ باکمال مصنف بھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں اُن سے کئی بار انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ڈاکٹر خلیق انجم کی ہمراہی میں نہ صرف مل چکا ہوں بلکہ بارہا اُن کی خوبصورت گفتگو سے حظ بھی اٹھا چکا ہوں۔ مجتبیٰ صاحب پر تحریر کردہ مضامین اس قدر دلچسپ ہیں کہ اُنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ثانی، پروفیسر نارنگ صاحب، بیدی سحر صاحب، فکر تونسوی صاحب، اور دیگر تمام احباب کے مضامین بھی انتہائی لاجواب ہیں۔

اور آپ نے مجتبیٰ بھائی کی جو چار تخلیقات صادقین، وزیر اعظم شاعر، اردو کا آخری قاری اور ادیبوں کے حالات کا انتخاب کیا ہے وہ بھی زبردست ہے۔ اس کے بعد افسانوں کی طرف آتے ہیں تو وہاں بھی محترمہ عذرا اصغر، ڈاکٹر احسان صاحب، رونق جمال صاحب، رومانہ رومی صاحبہ، نیئر اقبال علوی، نصرت بخاری اور شکیل خان نے اپنی اپنی جگہ عمدہ کاوش کی ہے مگر ڈاکٹر احسان صاحب، نیئر اقبال صاحب اور رونق جمال صاحب نے تو کمال ہی کر ڈالا۔

ڈاکٹر فیروز عالم البتہ اس بار ہمارے ساتھ زیادتی نہیں بلکہ ظلم کر گئے ہیں۔ بھلا کیا ضرورت آن پڑی تھی ڈاکٹر صاحب کو اتنے خوبصورت سلسلے کو یوں اچانک منقطع کر دیا کہ جیسے کوئی اجنبی ہاتھ چھڑا کر کہے ''میں اپنی راہ لیتا ہوں تم اپنی راہ لو''۔ اب اگر یہاں پروین شیر صاحبہ قاری کو نہ سنبھالتیں تو کم از کم میرے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل ہوتا۔ پروین شیر صاحبہ کا سفر نامہ دلچسپ بھی ہے اور ہارٹ ٹچنگ بھی۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد شاعری کی بابت یہی کہوں گا کہ ہر تخلیق اپنی جگہ آفتاب ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ''انکل مجتبیٰ حسین نمبر'' موصول ہوا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ مجتبیٰ صاحب کی فیملی سے ہمارے گھریلو مراسم رہے ہیں اور یہ رشتہ ابھی بھی قائم ودائم ہے۔ میرے پاپا اور مجتبیٰ انکل نے ایک ساتھ ہی NCERT دہلی جوائن کیا تھا اور کئی سال ہم لوگ ایک دوسرے کے پڑوسی بھی رہے ہیں۔

مجتبیٰ انکل پر چہارسو کا خاص نمبر دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ مجتبیٰ انکل جیسے طنز ومزاح نگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے اردو ادب کا قاری صدیوں تک محظوظ ہوتا رہے گا۔ بہت خوب کیا کہنے۔ دلی مبارکباد قبول کیجیے اس قدر راور بھرپور نمبر نکالنے پر مبارک باد۔

پرویز مظفر (برمنگھم، یوکے)

برادرم گلزار صاحب، آداب۔

پچھلے دنوں آپ کے مقبولِ خاص وعام جریدے ''چہارسُو'' میں جو

گوشے ہمدست ہوئے وہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے میری مطلوبہ توجہ نہ پاسکے۔اس میں میری کم مائیگی بھی شامل رہی۔

ڈاکٹر رینو بہل جو بھارت کے پنجاب ہریانہ ہما چل پردیش اور چنڈی گڑھ کی واحد خاتون اردو افسانہ نگار ہیں،اپنی نگارشات کی خُوبی سے برصغیر میں اپنا مقام حاصل کر چکی ہیں۔مردوں کی اس دنیا میں عورت کی مجبوریاں اور لاچاریاں سسکیاں بن بن کر آپ کے کرداروں میں نظر آتی ہیں۔لیکن حالات کے ظلم وستم میں یہ عورت اپنے استقلال کے ساتھ ایک نئی اُمنگ لے کر اُبھرتی ہے۔اس گوشے کی ترتیب قابلِ تعریف ہے۔خاص طور سے اپنی والدہ سے متعلق ان کی تخلیق قابلِ تحسین ہے۔

مجتبیٰ حسین پر''چہارسُو'' کا گوشہ مدتوں محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ موصوف بین الاقوامی سطح کے مزاح نگار ادیب ہیں۔ فی زمانہ نئی تہذیب اور پرانے اقدار کے تال میل سے بنتے بگڑتے انسانی کردار وفعل پر آپ جس ظریفانہ انداز سے طنز کرتے ہیں وہ داد کے قابل ہے۔طنز ایسا کہ دل کی گہرائیوں تک اُتر جائے، ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دے مگر اس پر بھی قاری کو ہنسنے پر مجبور کر دے۔لطف یہ کہ قاری جو اپنی کمزوریوں کو محسوس بھی کرتا ہے اور مزا بھی لیتا ہے۔یہی مزاح نگاری کا اعجاز ہے۔اس گوشے کو منظر عام پر لانے کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کرشن گوتم (چنڈی گڑھ، بھارت)

''چہارسُو'' کے محنتی اور محبی باغبان۔گلزار جاوید

عطر بیز، شگفتہ شگفتہ پھولوں کی طرح مہکتے رہو۔صحت وتندرستی، ایمان کی سلامتی کے ساتھ زندہ رہو۔آمین

چہارسُو کی جانفزا مہکار میرے ناتواں جسم وجان کے لیے توانائی اور تازگی کا ایک ''انمول ٹانک'' ہے۔ میں سب سے پہلے نمبر ون ٹانک ''براہِ راست'' نوشِ جان کرتی ہوں۔ مدلل اور موثر سوالات اور ان کے دل پذیر جوابات پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ میں ''کورے'' مٹی کے پیالے میں رَو (گنے کا رس) جس میں تروتازہ کینوؤں کا رس ملا ہو مزے مزے سے گھونٹ گھونٹ پی رہی ہوں۔ پھر پلنگ کی ''ٹھوٗ'' سے ٹیک لگا کر باری باری دلکش اور دلگداز تحریروں سے اپنے تشنہ دل کو سیراب کرتی ہوں۔سرورق پیکر پیرزادہ قاسم رضا اور کلام پیرزادہ سے جگمگا رہا ہے۔

مجھے تو نعتِ نبی شاد کام رکھتی ہے
یہ ایک گُہر ہے بہت شاعری کے لیے

ولولہ ہائے شوق، روحِ گرنوحہ کناں، دانشوری کی پیکر، خوں سے جب جلایا دیا، جذبہ خاک پروری، درد کی زمینوں میں، خواب ہو جانے سے پہلے، ایک خواب نادیدہ، مرادوں کی کھیتیاں اور درد کی کائنات۔گلزار جاوید۔۔ قرطاسِ اعزاز کے ان انمول تخلیق کاروں پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ان کے لیے خلوص ومحبت سے بھری دعائیں۔

''روشنی بانٹتے لوگ'' امجد اسلام امجد زندہ بار۔اسی تسبیح کے دانے تم ہو۔ڈاکٹر فیروز عالم کی داستانِ حیات ایمان وایقان کی لازوال داستان۔میری بدقسمتی تمہارے بیٹے کی شادی میں ان سے ملاقات نہ کرسکی۔پروین شیر کا سفرنامہ بھی قابل داد ہے۔سیمیں کرن کی تحریر ''کلموہی کہیں کی'' ''چاند چہروں'' کے لیے چشم کشا حقیقت ہے۔

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

بھیا! آداب۔

''چہارسُو'' ملنے سے پہلے مجھے ''چہارسُو'' کی خبریں ملنا شروع ہوگئی تھیں۔جمیلہ شبنم صاحبہ نے تو اتنے دلچسپ اور دلنواز انداز میں ''چہارسُو'' میں چھپے مجتبیٰ حسین صاحب کے گوشے سے چیدہ چیدہ مندرجات فون پر پڑھ کر سنائے کہ ''چہارسُو'' کے انتظار میں دو دن کاٹنا مشکل ہوگئے۔پرچہ ملا تو سب سے پہلے ''صادقین'' کا مطالعہ کیا۔جمیلہ صاحبہ نے اس مضمون کی بطورِ خاص بہت تعریف کی تھی۔صادقین کے بارے میں کچھ میں تھوڑا بہت جانتی تو تھی اور ان کی خطاطی کے کچھ نمونے بالواسطہ طور پر میرے پاس موجود بھی ہیں۔اس زمانے میں ان کا مسکن لاہور کی شملہ پہاڑی ہوتی تھی۔مگر میں جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہوں اس میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی نہ اجازت تھی نہ فرصت۔لہٰذا دل کی دل ہی میں رہ جاتی تھی۔مجتبیٰ حسین کے مضمون نے صادقین سے بھرپور تعارف کرایا۔کیسی کیسی نابغہ شخصیات ہمارے درمیان سے اٹھ گئیں اور اٹھتی جا رہی ہیں۔بہر حال یہ ایک ناگزیر سرکل ہے۔ہمارے اختیار سے باہر۔مجتبیٰ حسین کا اندازِ نگارش کتنا خوبصورت ہے۔مزید پڑھنے کی ہوس ہے۔بطور خاص ان کے تحریر کردہ خاکے۔میں ایک ایک سطر ان سے متعلق پڑھتی چلی گئی اور ہر تحریر کے بعد منہ سے واہ واہ نکلتا رہا۔وہ یا دوسرے بیشک اس وصف کو کوشش یا ریاضت قرار دیں میں مگر اسے خداداد صلاحیت ہی قرار دونگی۔کوششوں کو بارآور بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔اس کی منشاومرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا۔آپ نے دیکھا ہوگا جب ہوا چلتی ہے تو درخت کے کچھ پتے سرسراتے ہیں اور قریب ہی کے کچھ ساکت رہتے ہیں پھر لمحہ بھر بعد وہ بھی لہلہانے لگتے ہیں۔یہ عجیب نظارہ مجھے مبہوت کر دیتا ہے۔تو بھیا کہنا میں یہ چاہتی ہوں کہ ربِّ جلیل وقدیر نے مجتبیٰ حسین صاحب کو تحریر کا، کردار کا، اخلاق واخلاص کا یہ وصف ودیعت کیا ہے۔جس کا ذکر ہر مضمون نگار نے بلاکم وکاست میں محبت آمیز انداز سے ان کے بارے میں کیا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے قلم کی جولانیوں کو استقامت بخشے اور انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے۔آمین۔

عموماً ہوتا یوں ہے کہ ''چہارسُو'' میں سب سے پہلے میں ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا ''ہوا کے دوش پر'' پڑھتی ہوں۔مگر اس مرتبہ یوں ہوا کہ مجتبیٰ حسین نے مجھے مستغرق کئے رکھا اور میں بس انہی کو انہماک سے پڑھتی چلی گئی۔ان سے

فارغ ہوکر ''ہواکے دوش پر'' زیرِمطالعہ آیا۔ میں آپ کو بتاؤں میرے مطالعے کا بہترین وقت صبح کی نماز کے بعد کا ہے۔ رات کو بھی اتنی یکسوئی میسر نہیں ہوتی۔ چائے کی گرم چسکیوں کے ساتھ رسالہ یا کتاب میرے دوسرے ہاتھ میں کھلی ہوتی ہے۔ چائے کے ساتھ ہی مطالعہ بھی اختتام کو پہنچتا ہے۔ اور پھر ''کتابِ خدا'' کھلتی ہے۔ آج بروز سنیچر ۱۷۔ جنوری ۲۰۱۵ء کو ''ہواکے دوش پر پڑھا''۔ اتنا پرلطف جیسے سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یقین کیجیے جانے کیوں میری آنکھیں نم ہوئیں مگر خود کو یہ سوچ کر ڈھارس بندھائی کہ بھئی تم کون؟ لیکن آخری پیراگراف پر میں اپنے آنسوؤں پر قابو پا ہی نہیں سکی اور بے تکلفی سے انہیں بہنے دیا۔ مایوسی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ سلسلہ موقوف کر دیا ہے۔ اپنی اس سرگزشت میں موصوف نے جس بے ساختگی اور کسی بناوٹ کے بغیر اپنے حالاتِ زیست قلمبند کیے ہیں اس سے ان کی عزت وتکریم میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ واقعتاً ایسے ہی سادہ اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ میری ان سے دو ہی ملاقاتیں ہیں۔ پہلی آپ کے صاحبزادے عمارؔ میاں کی شادی پر دوسری اپنے گھر پر۔ اس مرتبہ پاکستان تشریف لائے تو مجھ ناچیز کو فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ گھر کا حدود و اربعہ پوچھا اور علالت کے باوجود مجھ ہیچ مدان کو ملنے تشریف لائے۔ میں ایسے اخلاص و مروت اور محبت اظہار کن لفظوں میں کروں؟ شکریہ تو بہت چھوٹا اور رسمی سا لفظ ہے جو گراں قدر احساسات و جذبات کا عکاس نہیں ہو پاتا۔ میں بھلا کہاں کی ایسی معتبر ہوں کہ ایسے اعلیٰ درجے کے قلمکار اور بڑے لوگ مجھ غیر معروف اور نہایت معمولی شخصیت سے اپنی بے پناہ مصروفیت سے ملنے کا وقت نکالیں۔ بس یہ بھی اللہ کا کرم ہے مجھ پر۔ اس کا شکر۔ یہ دنیا اور بالخصوص ہمارا پاکستان ایسے ہی نیک نیت سچے کھرے لوگوں کے وجود سے قائم ودائم ہے ورنہ شاید کب کی قیامت آ چکی ہوتی۔ اس سلسلے میں آپ کو داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی کہ آپ کی چشمِ بینا جانے کہاں کہاں سے کھوج کے ادب کے ایسے آبگینوں کو ڈھونڈ لاتی ہے۔

ڈاکٹر احسان احمد شیخ کا افسانہ ''روح کا کینسر'' ان کے پیشے سے منسلک اچھا افسانہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر مدت بعد نظر آنا شروع ہوئی ہیں۔ رومانہ رومی کا افسانہ ''اپنوں کے درمیان'' نے طاہر نقوی کا ایک افسانہ یاد دلایا جس میں ان کی ملاقات اپنے افسانوں کے کرداروں سے ہوتی ہے۔ بہرحال رومانہ رومی کا قلم آج کل ماشاءاللہ خوب رواں ہے۔ اب تک چہارسو بس اتنا ہی پڑھا ہے اور شاعری کا کچھ چیدہ چیدہ حصہ۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کے ''ابدی پیاس'' کا یہ شعر خوب ہے:

مرتعش ذہن پہ ہیں آئینہ خانے کتنے
قریۂ جاں میں گزارے ہیں زمانے کتنے

کرشن پرویز کے قطعات:

دیدۂ اشکبار میں گزری
جستجوئے بہار میں گزری
وہ قیامت کی تھی گھڑی پرویزؔ
جو ترے انتظار میں گزری

روپڑ شہر کا نام میرے ذہن میں کچھ اجالا سا کر دیتا ہے۔

عذرا اصغر (کراچی)

پیارے بھائی جان، آداب۔

نئے سال کا پہلا شمارہ موصول ہوکر نظر نواز ہوا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے فن اور ان کے مخصوص لب ولہجہ سے تو ہندوپاک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے اہلِ ذوق واقف ہیں۔ آپ نے قرطاس اعزاز کے ذریعہ ان کی شخصیت کے بارے میں بھی قارئین کو کلی طور پر متعارف کرا دیا ہے۔ ان سے متعلق سبھی مشاہیر کے مقالات اور ان کے خود کے مضامین خاص طور پر ''صادقین'' اور ''اردو کا آخری قاری'' ان کی ادبی صلاحیتوں اور حصولیابیوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ ''براہِ راست'' کے ذریعے بھی آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ ان کے ذات وصفات کے کئی گوشے وا کیے ہیں۔ ایسے وسیع النظر ادیب اور دانش ور پر یہ خصوصی شمارہ شائع کر کے آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے جو لائق صد تحسین و آفرین ہے۔

اب کی بار سبھی افسانے بھی بہت جاندار ہیں خاص طور پر نیئرؔ اقبال علوی، عذرا اصغر، ڈاکٹر احسان احمد شیخ اور رومانہ رومی صاحبان کی کہانیاں۔ ہاں کئی مہینوں سے آپ کی افسانوی تحریروں کی شدید کمی محسوس ہو رہی ہے۔

منظومات میں حضرات تفتہ زاری، سرور انبالوی، غالب عرفان، صدیق شاہد، نسیم سحر، عرش صہبائی، پروین شیر، شگفتہ نازلی، سلیم انصاری، زاہدہ عابد حنا اور مناظر عاشق ہرگانوی کے کلام نے نسبتاً زیادہ مسحور کیا۔

اس بار ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی داستان حیات کی قسط جوان کی زندگی کے پہلے دور کی سرگزشت ہے بہت دلکش اور دلچسپ ہے اور اس میں ان کی جذبات نگاری جا بہ جا دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر جی اداس بھی ہوا کہ ان کی حسین یادداشتوں کے اذکار کی یہ آخری قسط ہے۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اس دل نشیں داستان حیات کو کتابی صورت میں ضرور شائع فرمائیں گے۔

راج کھوسلہ صاحب کے متعلق دیپک کنول صاحب کی تحریر بے حد دل چسپ اور معلوماتی ہے۔ واقعی انسانی زندگی دھوپ چھاؤں کی مانند ہے۔ ذہانت، اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ اچھی قسمت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تقدیر اگر مہربان ہو تو مٹی بھی سونا بن جاتی ہے اور انسان ہر قدم پر ترقی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے لیکن بُرے وقت میں انسان کی عقل وفہم بھی بیکار ہو جاتی ہے اور اسے چہارسو صرف ظلمات کے طوفان نظر آتے ہیں اور وہ دل شکستہ ہوکر بارہا شراب کا سہارا بھی لیتا ہے اور اس قول کو بھول جاتا ہے کہ:

انسان ہی کیا جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

دیپک کنول صاحب کچھ فلمی شعراء و کہانی کاروں کے بارے میں

بھی ایسی کچھ تحریریں منظر عام پر لائیں تو عین واجب ہوگا۔منٹو، کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس، ساحر، کیفی، مجروح، شکیل ایسے معروف شعرا وادباء کی زندگیوں میں بھی یقیناً ایسے کئی قابل ذکر واقعات وسانحات ہوں گے جو قارئین کے لیے باعث کشش ہوں گے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

پیارے دوست گلزار جاوید، آداب۔

اس خط کو تحریر کرتے ہوئے جذباتی ہو جانا قدرتی بات ہے کیوں کہ چار سال بعد چہارسو کا ایک ایسا شمارہ شائع ہو رہا ہے جس میں میں اپنی سرگزشت کے ساتھ موجود نہیں ہوں۔ یہ داستان گزشتہ پرچے میں اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ میرا دل آپ کے لئے اور بہت سے پڑھنے والوں کے لئے احساس تشکر سے بوجھل ہے۔آپ نے کمال محبت اور توجہ سے اس گمنام اور کم حیثیت ''عام'' انسان کی سوانح عمری کو اپنے باوقار جریدے میں ایک دو نہیں چار سال شائع کر کے نہ صرف مجھے عزت دی بلکہ میرا نام ہزاروں قارئین سے متعارف کروایا۔ میں آپ کا اور ان تمام قارئین کا احسان مند ہوں جنھوں نے اس خاکسار کی تحریر کو قابل توجہ سمجھا، اسے سراہا اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔ ''ہوا کے دوش پر'' اب جلد کتابی شکل میں منظر عام پر آنے والی ہے۔اگر آپ کی حوصلہ افزائی شامل نہ ہوتی تو شاید یہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پاتی۔ میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ کتاب کی بھی ایسی ہی پذیرائی ہو جیسی اسے چہارسو کے صفحات پر ملی ہے۔ ''چہارسو'' کی محفل میں شامل ہونے کی ایسی ''چاٹ'' پڑی ہے کہ کچھ دنوں کے آرام کے بعد انشااللہ ایک نئے منصوبے کے ساتھ جس میں کچھ مقصدیت بھی ہو پھر شریک محفل ہونگا۔

حسب دستور ''مجتبی حسین نمبر'' اپنے مشمولات کے لحاظ سے ایک دستاویز ہے۔ مجتبی حسین صاحب چند سال پہلے لاس انجلز تشریف لائے تھے اور میں ان خوش قسمتوں میں تھا جنھوں نے ان کی تخلیقات انکی اپنی زبان سے سنی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے ''براہ راست'' میں خاکساری سے کام لیا ہے مگر میرے خیال میں وہ فی الوقت اردو کی طنز ومزاح کی صنف میں سرفہرست ہیں۔ اسی کے ساتھ اس شمارے میں صادقین پر انکا مضمون خاکہ نگاری کی ایک اعلی مثال ہے۔ انکے کالموں کے نمونے اگرچہ میرے پہلے پڑھے ہوئے تھے مگر ایک بار پھر پڑھنے میں بہت مزہ آیا اس شمارے میں انکی قابل ذکر تحریر ''اردو قاری کی تلاش'' تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ اردو قاری کہیں گم ہو گیا ہے۔ کیا اس کی گمشدگی میں اردو ادب کے تخلیق کاروں کا ہاتھ ہے؟ یہ ایک قابل غور نکتہ ہے۔

افسانوں میں عذرا اصغر کا افق کے اس پار اچھا لگا مگر جس افسانے نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ احسان احمد شیخ کا روح کا کینسر تھا۔ شاید اس لئے کہ میں بھی کبھی کبھی اس موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہوں۔ احسان شیخ صاحب کی تحریر بیحد اثر انگیز ہے۔ دیگر افسانے بھی معیاری ہیں۔

چہارسو نے ایک بین الاقوامی محفل ادب سجا دی ہے، اللہ آپ کو ایک طویل عرصے اس محفل کی میزبانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فیروز عالم (امریکہ)

بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ شمارہ ایک بار پھر اس امر کی دلیل بن کر نظر نواز ہوا کہ آپ کی متلاشی نظریں ہمیشہ ایسے ہیرے جواہر کی تلاش میں رہتی ہیں جن کے لیے سرحدوں کے مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ بس! یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ وہ ہیرا جسے آپ نے تلاش کیا اُس کی تابندگی اردو کی چمک دمک کے لیے اقوامِ عالم کی کن نگاہوں کو خیرہ کررہی ہے! سید مجتبیٰ حسین جیسے طنز ومزاح نگار کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے چہارسو نے ایک نابغہ روزگار کو اپنے چاہنے والوں سے متعارف کروایا ہے۔ مبارکباد۔ ''براہِ راست'' میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ مجتبیٰ حسین اپنی تعطیلات میں اسکوٹر پر سوار علی گڑھ سے دہلی صرف اس لیے جاتے تھے کہ دوستوں سے ملاقات ہو سکے۔ حسنِ اتفاق! کہ خاکسار بھی ایک زمانے میں اسی مرض (اگر اسے ''مرض'' کہا جائے) میں مبتلا رہنے اور اتوار کا سارا دن دوستوں کی خاطر سڑکوں کی طوالت ناپنے میں گزارا کرتا تھا۔

''منظوم خاکہ'' سے لے کر ڈاکٹر مصطفی کمال کے مضمون ''مجتبیٰ حسین کا تخلیقی سفر'' تک میں نے لفظ بہ لفظ پڑھا اور موصوف کی ہمہ جہت شخصیت سے لطف اندوز ہوا پھر خود صاحبِ اعزاز کا مضمون ''اردو کا آخری قاری'' تو ایک کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا ہے میں نے اس تحریر کو کئی اور جریدوں میں بھی پڑھا ہے۔ ہاں ''براہِ راست'' کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا جس کے آخری صفحے پر آپ کے سوال کے جواب میں مجتبیٰ حسین نے یہ بیان کیا ہے ''میں نے ایک بار اپنے دوست کو ایک لطیفہ سنایا تو اُس نے بے چارگی کے عالم میں کہا ''یار اس وقت میں بہت مصروف ہوں گھر جا کر تمہارے لطیفے پر ضرور ہنسوں گا'' کیا بات ہے اس لطیفے کے لطیفے کی!

افسانہ! آج کل کی نئی نسل اب افسانوں میں ماورائی حقیقتوں کو خوبصورتی سے سمونے لگی ہیں جس سے آج کا فکشن نیا روپ دھارنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں نصرت بخاری کا ''قبرستان کا بھوت'' اور رومانہ رومی کا ''اپنوں کے درمیاں'' خوبصورت مثالیں ہیں۔

غالب عرفان (کراچی)

پیارے گلزار جی! نیا سال مبارک ہو۔

ماہنامہ چہارسو کا تازہ شمارہ برائے ماہ جنوری فروری موصول ہوا۔ اس مرتبہ آپ نے ہندوستان کے ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی پر گوشہ ترتیب دیا جسے پڑھ کر از حد مسرت ہوئی۔ یوں تو مجتبیٰ حسین کا نام پکارنے میں زبان کو تھوڑی سی مشقت کرنی پڑتی ہے لیکن ان کے مزاحیہ مضامین، خاکے، سفرنامے اور دیباچے پڑھتے ہوئے اُسی زبان کو کچھ راحت بھی ملتی ہے کیونکہ وہ

سادہ زبان میں ہوتے ہوئے دل میں بھی گدگدی سی پیدا کرتے ہیں۔اس سے پہلے فکر تونسوی نے برسوں تک پیاز کے چھلکے اتارتے ہوئے سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔دلیپ سنگھ،شوکت تھانوی کے علاوہ کنہیالال کپور صاحب کی قلم نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔آپ نے اس گوشے کے لیے حسین صاحب کو چنا یہ آپ کی دُور اندیش نظر کا ہی انتخاب ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔خاص کر کے ادبی ذوق رکھنے والے قارئین سدا رہی آپ کے احسان مند رہتے ہوئے آئندہ بھی آپ سے ایسے ہی گوشوں کے تمنائی رہیں گے۔نامور لکھکوں نے اپنی اپنی قلم سے حسین صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ان کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ اس داد کے مستحق ہیں یا یوں کہنا بجا ہوگا کہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اِن کی عمر دراز ہو اور وہ اسی طرح اپنی قلم سے مسکراہٹیں بکھیرتے رہیں۔لیکن کبھی کبھار دل میں یہ خیال بھی ابھرتا ہے کہ ہمارے جیسے بزرگ جب اس فانی دنیا سے کوچ کر جائیں گے تو بقول حسین صاحب کے (اردو کا آخری قاری) ڈھونڈتے ہوئے جب ایک صاحب سے اُس کے بارے میں پوچھا گیا تو اُس کا جواب تھا کہ میں یہ مانتا ہوں اردو ایک اچھی اور شیریں زبان ہے۔لیکن میں اس بھاشا سے اس لیے پرہیز کرتا ہوں کیونکہ میں شوگر کا مریض ہوں۔حسین صاحب کا تحریر کردہ یہ جملہ اپنے آپ میں ایک طنز ہوتے ہوئے اُس سچائی کو بیان کرتا ہے جس سے آج ہم سب اردو نواز اچھی طرح ان حالات سے دوچار ہیں۔ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن ہمارے بھارت میں تو اردو کا مستقبل اتنا اُجلا نظر نہیں آتا۔

افسانوں میں ’’افق کے اُس پار‘‘ ایک اچھا طنز ہے حقیقت ہے۔

’’روح کا کینسر‘‘ موجودہ دور کی ترجمانی کرتے ہوئے ہم سب کو خبردار کرتا ہے۔ خاص کر اُن عورتوں کی چھاتی کا کینسر جو کہ ان کے جسم کا وہ خوب صورت حصہ اس نامراد بیماری سے متاثر ہوتا ہے۔’’انسانیت کا جنازہ‘‘ پڑھ کر خاکسار کو اپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں دوسری کلاس میں پڑھتا تھا تو ہمارے گاؤں کی چاچی گلاٹی جو کہ ایک غریب مسلم عورت تھی۔مجھے گودی میں بٹھا کر اتنا لاڈ اور پیار دیتی تھی کہ کوئی بھی عورت اپنے سگے بیٹے کو بھی اتنا پیار کرتی ہو۔نہ کوئی مذہب کی دیوار تھی اور نہ ہی اونچ نیچ بس ممتا ہی ممتا تھی۔آج بھی جب کبھی خیال آتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔’’کامریڈ‘‘ نے دل کو چھو لیا سچ تو یہ ہے کہ کامریڈ لوگ اپنی آن کے پکے ہوتے ہیں۔لدھیانہ جیسے صنعتی شہر میں ایسے منظر اکثر دیکھنے کو ملتے تھے پر آج حالات بدل چکے ہیں پھر بھی ایک اچھی کہانی ہے۔’’قبرستان کا بھوت‘‘ کچھ حقیقت کچھ تصور ہے۔دراصل ہندو دھرم کے علاوہ بودھ،جین،سکھ، پنر جنم کو تسلیم کرتے ہیں۔اس کے برعکس مسلم،عیسائی وغیرہ پنر جنم کو تسلیم نہیں کرتے۔اسی طرح ہندو دھرم میں یہ مانا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جس بشر کی موت اچانک کسی حادثے میں یا بستر پر ہو جائے تو ہم لوگ اُسے اکال مرتو تصور کرتے ہیں۔مرنے والے کی گتی کرانا لازم ہے نہیں تو اس کی آتما تیرہ دن تک گھر کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے۔ایسے موضوع پر آج کل کچھ فلمیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ ایک اچھی کوشش ہے کچھ نیا ہے۔ہر بار کی طرح دیپک کنول جی کا فلمی مضمون اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔سونامی بھی آج کے فیشن پرست زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

غزلیں،نظمیں،دوہے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

قارئین کے خطوط پڑھ کر اچھا لگتا ہے خطوط سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ،بھارت)

جناب گلزار جاوید،السلام علیکم۔

’’چہارسُو‘‘ کا تازہ شمارہ بابت جنوری فروری ۲۰۱۵ء ملا۔یاد آوری کا شکریہ۔سب سے اول ’’رس رابطے‘‘ طویل ہونے کے باوجود کچھ حاصل نہ ہوا۔پھر ’’قرطاسِ اعزاز‘‘ کی طرف آیا۔مجتبیٰ حسین کے بارے میں متین امروہوی نے ایک اچھا منظوم خاکہ تحریر کیا ہے

کیسے معلوم تھا وہ پھول بن کر مجتبیٰ ہوگا

سید امتیاز الدین نے بھی مجتبیٰ حسین کے حالات بالترتیب خوب تحریر کیے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجتبیٰ حسین کی شوخیاں کے عنوان سے ایک اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔’’مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری‘‘ ڈاکٹر انور سدید کے قلم کا شاہکار ہے۔

عذرا اصغر کے افسانہ ’’اُفق کے اُس پار‘‘ نے ہلا کر رکھ دیا۔کس قدر خوبصورت انداز میں عذرا اصغر صاحبہ نے قوم کی بے حسی اور نالائقی کا رونا رویا ہے۔کاش دھرنے والے یہ سمجھیں اور لوگوں کو مارکٹائی اور افراتفری کے بجائے وہ تعلیم دیں جو اسلام نے دی ہے جسے ہم نے چھوڑ دیا اور مغرب نے اپنا لیا ہے۔ ڈاکٹر احسان احمد شیخ کا افسانہ ’’روح کا کینسر‘‘ ایک ایسی کہانی دہراتا ہے جو اکثر ہمارے ہاں ہوتا رہتا ہے۔یہ کوئی نئی بات نہیں۔

رونق جمال نے اپنے افسانے ’’انسانیت کا جنازہ‘‘ کے ذریعے انسانیت کا جنازہ نکال کر اس بات کو دہرایا ہے کہ تقسیم ملک کے وقت فسادیوں نے بے پناہ مسافر مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے جو آج بھی زندہ بدست مردہ ہیں۔انسانیت انسان کیسے بھانپتا ہے اگر یہ دیکھنا ہے تو میرا نیا ناول ’’بمبلا دلاور‘‘ پڑھیے جو زیر اشاعت ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترمی گلزار جاوید،آداب و تسلیم۔

نئے سال 2015ء کا پہلا ’’چہارسُو‘‘ روایتی طمطراق اور انفرادی آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔حضور والا! آپ قلزم ادب کے ایسے ماہر اور تجربہ کار شناور۔۔۔کہ ہر بار غوطہ لگا کر قارئین کے ذوق طبع کے لیے سمندر کی تہہ سے ایسا گوہر نکال لیتے ہیں کہ جس کی ضوفشانی سے طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔ اس مرتبہ یہ گوہر آبدار مجتبیٰ حسین کے روپ میں ظاہر ہوا۔واہ واہ! کیا بات ہے۔ ناگپور(بھارت) سے شائع ہونے والے مجلّے ’’قرطاس‘‘ میں دو ایک مرتبہ مجتبیٰ

حسین کو پڑھا، مگر جس طرح آپ نے ان کی قد و قامت کو فزوں تر کیا، گمان ہی نہ تھا کہ وہ برصغیر کے اتنے نامور اور بڑے مزاح نگار ہیں۔ بہ قول غالب:

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا!

''صادقین''، ''اردو کا آخری قاری''، ''ادیبوں کے گھریلو حالات بےتصویر''، ''نائب وزیرِ اعظم کا شاعر بننا'' جیسی تحریریں پڑھ کر ان کے مقام و مرتبے کا پتہ چلا۔

گلزار صاحب! آپ ایسی معصومیت اور مشاقی سے سوال اٹھاتے ہیں کہ ''براہِ راست'' میں آپ کا مخاطب غالبًانہ چاہتے ہوئے بھی اپنی نجی زندگی، پرائیوٹ لائف، گھریلو حالات اور تخلیقی سفر بارے ہر معلومات اگل دیتا ہے۔ پرت در پرت ہر شے قاری پر واضح ہوتی چلی جاتی ہے اور آخر میں اس پر منکشف ہوتا ہے کہ ''اوئے! میں تو مجتبیٰ حسین کو جنم جنم سے جانتا ہوں'' ان کی شخصیت اور طنز و مزاح'' پر لکھے گئے تمام مضامین اس حقیقت کے شاہد کہ ان میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک اچھے انسان اور اچھے قلمکار کا طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔

تمام افسانے اچھے لگے۔ عذرا اصغر صاحبہ کا ''افق کے اُس پار'' کے علاوہ (چھتیس گڑھ۔ بھارت) سے رونق جمال صاحب کی تقسیم ہند کے پس منظر میں تحریر کردہ کہانی ''انسانیت کا جنازہ'' بڑی الم ناک و دلگداز داستان تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ انسانوں نے وطن مالوف کے لیے کیسی کیسی روح فرسا قربانیاں دیں۔ ان کے سینے آزاد سرزمین کی آرزو میں کیسے مچلتے تھے۔ مگر تُف ہمارے سیاسی و مذہبی روسیاؤں پر جنہوں نے ارضِ پاک کا تیا پانچا کر ڈالا۔ ہمارے بزرگوں نے اپنی زندگیاں آزادی کی خاطر لٹائیں۔ مگر ان بےغیرتوں نے دھرتی ماں کو لوٹ لوٹ کر اس کے بدن کو نوچ نوچ کر اسے برہنہ و بےتوقیر کر ڈالا۔ خدا انہیں غارت کرے۔

نیّر اقبال علوی (لاہور)

پیارے گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو کا نادر نسخہ ملا۔ ممنون ہوں۔ پہلی نشست میں ''نائب وزیرِ اعظم کا شاعر بننا'' اور ''مجتبیٰ بھائی فکر بھائی مزاح والے'' کے دو گھونٹ پیے۔ مزاح والی رگ پھڑکی۔ ہونٹ کھلے، کھلتے ہی چلے گئے، پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ وسوسے اور سنجیدگیاں پر لگا کر اُڑنے لگے۔ اگلی نشست میں کیا کھُلا، کہاں بل پڑے اور کون کون پر لگا کر اُڑا، مطلع کروں گا۔ نسخہ کارآمد ہے۔

عزیز پریہار (لدھیانہ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

دلِ مضطرب، نگاہِ شفیقانہ کے بےلوث جذبہ کے تحت آپ نے اردو ادب میں ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ ستمبر اکتوبر ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں ڈاکٹر رینو بہل پر گوشہ شائع کیا ہے مگر میں اس کے متعلق بھی اپنی رائے نہ دے سکا جس کا مجھے نہایت افسوس ہے وجہ وہی ''فیس بک''۔ آپ نے ڈاکٹر رینو بہل پر گوشہ شائع کر کے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل اس اعزاز کی حقدار ہیں۔ میں اُن سے ۲۰۰۳ء سے واقف ہوں جب ایک ادبی تقریب میں ان کے ساتھ مجھے بھی ''لالہ جگت نارائن'' اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر رینو بہل مسلسل اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں اور یکے بعد دیگرے افسانوی مجموعے اردو ادب کی جھولی میں ڈال رہی ہیں۔ مجھے نہایت فخر ہے کہ میں ان کی افسانہ نگاری کے متعلق گزشتہ سال آل انڈیا ریڈیو جالندھر کے لیے اُن کا انٹرویو لیا جو ۲۲۔ اپریل ۲۰۱۴ء کو نشر ہوئی۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر رینو بہل کے افسانوی مجموعے کو پنجاب بھاشا و بھاگ کی جانب سے انعام سے نوازا گیا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ اسی طرح اردو ادب کی خدمت کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ پھر آپ کو اس نامور مصنفہ پر گوشہ شائع کرنے کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جنوری فروری کا شمارہ آپ نے مایہ ناز ہستی محترم مجتبیٰ حسین پر گوشہ شائع کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین میرے پسندیدہ قلمکار ہیں۔ ان کی تحریریں مجھے جنون کی حد تک پسند ہیں۔ آپ نے اُن پر اتنا مواد شائع کر دیا ہے جو اُن کے مجموعوں میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کے فن کے تعلق سے اردو کے نامور مصنفین کے مضامین نہایت پسند آئے۔ ''براہِ راست'' میں آپ نے مجتبیٰ حسین صاحب کے متعلق تفصیلی معلومات مہیا کروا دیں۔ آپ نے انہیں ''فکاہیہ اردو ادب کے شیر بیّر'' کا نام دیا ہے۔ واقعی اردو ادب میں اُن کا ہم پلہ کوئی نہیں ہے۔ واقعی وہ اردو ادب کے ایسے شیر بیّر ہیں جو ہمیں اسی طرح اپنی دہاڑ سناتا رہے جسے سُن کر ہم خوفزدہ ہونے کی بجائے اسی طرح محظوظ ہوتے رہیں۔

ایم۔انوار انجم (مالیر کوٹلہ، بھارت)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، مزاجِ گرامی قدر۔

''چہارسو'' نظر نواز ہوا۔ جناب مجتبیٰ حسین اور اُن کی تخلیقات و فتوحات کے بارے پڑھ کر مزید آگاہی ہوئی۔ ہم تو پہلے سے ہی اُن کی شخصیت اور فن کے مداح ہیں۔ اللہ اُنہیں سلامت رکھے آپ کے پرچے کا تواتر، تسلسل اور توازن سے اشاعت پذیر ہونا، آپ کی مستقل مزاجی اور اُردو سے محبت کا آئینہ دار ہے۔ اُردو کا آخری قاری اور ادیبوں کے گھریلو حالات کیا اچھی تحریریں ہیں، ہمیشہ زندہ سلامت رہنے والی۔ غزلیات میں جناب منظر ایوبی، مشکور صاحب، مہندر پرتاپ چاند، برادرم آصف ثاقب، پرواز انبالوی، صفوت علی کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ محترم مظفر حنفی کی غزل پڑھنے کے بعد اپنی ایک غزل یاد آئی کہ:

کسی گھر کو جلا دینے سے پہلے
ذرا سوچو ہوا دینے سے پہلے
یہ جنگل بے تحاشا جاگتا تھا
پرندوں کو اڑاد ینے سے پہلے

ہر اک فرعون کو ملتی ہے مہلت
کلیمی مُو عصا دینے سے پہلے

آج کل لاہور اُداس ہے۔محترم عقیل روبی، صابر لودھی اور محترمہ افضل توصیف صاحبہ ہمیں چھوڑ کر راہیٔ عدم ہو گئیں اللہ مغفرت کرے۔

کرامت بخاری (لاہور)

مدیرمحترم، سلام ورحمت۔

سال نو کا شمارہ محترم مجتبیٰ حسین صاحب کے قرطاسِ اعزاز کے ساتھ نظر نواز ہوا بہت شکریہ۔قرطاس اعزاز جب کسی مزاح نگار سے منسوب ہو (جو پہلے ہی دنیائے مزاح میں کم کم باد و باراں ہیں تو ذہن شگفتہ شگفتہ تحریروں سے باغ و بہار ہو جاتا ہے۔ پات ہرے ہونے اور پھول کھلنے لگتے ہیں، اگر پورٹریٹ کے ساتھ اُن کے کسی شاہکار نثر پارے سے کوئی اقتباس بھی سرورق کی زینت بن جاتا تو معنوی حسن مزید فزوں تر ہوتا نیز پورٹریٹ میکر کا نام بھی دیا کیجیے۔منظوم خاکہ جملہ پہلوؤں کو مدنظر رکھ کے مشاقانہ انداز سے لکھا گیا۔

صادقین صاحب پہ خاکہ نہایت قریبی موانست، ذہنی دلجمعی وفنی شیفتگی کے ساتھ تحریر ہوا (کاش ان کی خواہش کی تکمیل بھی ہو پاتی) جناب مشفق خواجہ نے بہت بجا لکھا کہ اس خانے میں ''صادقین چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں'' اُن کے بارے میں پڑھتے ہوئے محترمہ بانو قدسیہ کا یہ جملہ ذہن میں گردش کرتا رہا۔''جی چاہتا ہے کہ تمہارے خط کے جواب میں صادقین سے صرف شکریہ لکھوا کر بھیج دوں۔'' بانو آپا کا اس حوالے سے لکھنا میرے لئے دوہرے اعزاز سے کم نہیں۔۔۔مرزا فرحت اللہ بیگ سے لے کر یوسفی صاحب (آج کل شامِ سفرِ یاراں کے چرچے ہیں) تک جملہ معاصرین اور قدآور مزاح نگاروں کا ذکر انہوں نے جس نیازمندانہ احساس اور فنی عظمتوں کے اعتراف سے کیا وہ اُن کے اپنے بڑے پن کی دلیل ہے۔اُن کی اردو کی اُستاد زینت ساجدہ صاحبہ کی زیبِ داستاں کے حوالے سے نمائش ورہنمائی مجھے اپنی اردو کی لیکچرر مس نجش اور یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی یاد دلاتا چلا گیا جنھوں نے بالترتیب طرزِ تحریر و استفہامیہ انداز کو سراہا تھا واقعتاً طالبعلمانہ زندگی کے یہ ریمارکس اور معنی خیز تجزیے ہمارے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔۔۔

''براہِ راست'' کے مختلف زاویوں سے سوالات ممدوح تک رسائی کی لائقِ تحسین کاوش رہی جبکہ جوابات بھی کہیں کہیں اُداسی کی لہر کے باوجود سادگی، سچائی و پُرکاری کی خوشبو سے لپٹے ہوئے تھے اس دوران یہ سوال برابر ذہنی تعاقب میں رہا، کیا ہی اچھا ہوتا اگر کسی طور ترتیب پا جاتا کہ ''مختلف تخلیقی جہات رکھنے کے باوجود پڑوسی ہونے کے ناطے اُنہوں نے ایک دوسرے کو کب، کیسے اور کیونکر متاثر کیا۔۔۔'' جاپان چلو'' کو دوبارہ شوقِ فراواں سے پڑھا۔

کائناتی مطالعے ومشاہدے کا ذکر کلام پاک میں تواتر وتسلسل سے آتا ہے اور مختلف پیرائے میں اس کی ترغیب وتحریض دلائی گئی ہے۔اس مرکزی خیال کو ''افق کے اُس پار'' میں عصرِ حاضر کے تناظر کے ساتھ عمدگی سے فوکس کیا گیا ہے کیونکہ عہدِ رواں میں اس الہامی پیغام کی تلاوت وتفہیم کی ترجیحی بنیادوں پہ ضرورت ہے۔''قبرستان کا بھوت'' یہ بطور کہانی پُراسراریت کی عجب سی دُھند پھیلی ہوئی ہے کچھ انگریزی کہانیوں جیسی مسٹری بھی لگتی ہے اور آخر میں گورکن کا ڈپلومیٹک بیانیہ کسی بریکنگ نیوز سے کم نہیں کہ اُن کے تو موبائل نمبرز برائے رابطہ اب قبرستانوں کی دیواروں پر درج ہوتے ہیں۔''اپنوں کے درمیاں'' اپنے ہی تخلیق کردہ کرداروں کا محاسبہ ہے جو مخلصانہ بھی ہو سکتا ہے اور جارحانہ بھی۔کچھ ایسے ہی اپنے وضع کردہ تجزیاتی کردار کی تکنیک کو نجیب عمر صاحب نے بھی اپنی کہانی میں برتا تھا۔

ایک صدی کا قصہ میں راج کھوسلہ صاحب کے بارے میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ دیو آنند دوسروں کی خوبیوں کی جانچ پرکھ کی کیسی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔تلسی مرے آنگن کی اور دوستانہ بیرونِ پاکستان دیکھنے کا دلچسپ و پُرلطف اتفاق ہوا تھا۔گزشتہ دنوں ڈاکٹر انور سدید صاحب سے ملاقات ہوئی اُن کی علالت ہمارے لیے باعث ملال اور صحتیابی کے لیے ہم سب دعا گو ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

مجتبیٰ حسین جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر اِک جاندار گوشہ خاص پرچے کا اختصاص تھا اور ادیب کو اس کی زندگی میں ہی یہ اعزاز دے دیا جائے تو اور بھی خوبصورت روایت ہے اور ادبی جرائد اس میں اپنا حصہ بخوبی ڈال رہے ہیں!

مجتبیٰ حسین پر یوں تو سبھی مضمون خوب اور جاندار تھے مگر پروفیسر گوپی چند نارنگ، شہریار، شمس الرحمان فاروقی، مشفق خواجہ، فکر تونسوی اور ڈاکٹر انور سدید کے مضامین کا خاص طور پر تذکرہ کرنا چاہوں گی کہ شخصیت مذکور سے خوب انصاف کیا۔اس گوشہ خاص میں نہ صرف مجتبیٰ حسین پہ تحاریر تھیں بلکہ اُن کی اپنی تحریروں نے بھی اسے گل وگلزار کر دیا۔خاکہ صادقین، اردو کا آخری قاری، نائب وزیراعظم کا شاعر بننا اور ادیبوں کے گھریلو حالات کیا خوبصورت اور لازوال اثاثہ ہے اردو ادب کا!

افسانوں میں ''روح کا کینسر''، ''کامریڈ'' اور ''اپنوں کے درمیاں'' متاثر کن تھے مگر کامریڈ اپنی جگہ پر بہت موثر اور جاندار افسانہ تھا۔ جہاں بائیں اور دائیں بازوؤں کے درمیان پستا انسان دونوں طرف اک سے مسائل اور پھر ان پستے ہوئے انسانوں اور مسائل کی آگ میں پک کر تیار ہوا اک سچا ''کامریڈ'' یا پھر مردِ مومن اک خوبصورت تحریر تھی۔حصّہ غزل بھی جاندار تھا اور نظموں میں پروین شیر اور ندا فاضلی نے بڑی عمدہ نظمیں پیش کیں۔میرے افسانے پہ تمام احباب کی شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنی ناقدانہ رائے سے نوازا،

خصوصاً نسیم سحر صاحب کی کہ جنہوں نے تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا اور درست سمت میں افسانے کے تفہیم کو سمجھا۔

سیمیں کرن (فیصل آباد)

برادرم گلزار جاوید، تسلیمات۔

''چہارسُو'' کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا، ہمیشہ کی طرح معنوی وصوری خوبصورتیوں سے آراستہ و پیراستہ۔ پیرزادہ قاسم والے گوشے کا لطف ابھی دل و دماغ میں باقی تھا کہ آپ نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا گلدستہ قارئین کی لذتِ ذہن کے لیے پیش کر دیا۔ سبحان اللہ جتنی داد دی جائے کم ہے۔ عزتیں تقسیم کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔ تازہ گوشے کا حسن یہ ہے کہ نئے لکھنے پڑھنے والے جو مجتبیٰ حسین کو کم کم جانتے ہیں، اس سے زیادہ بہتر طور پر مستفید ہو سکیں گے۔ آپ کی ہمت اور مسلسل محنت کے لیے ڈھیر ساری داد و تحسین۔

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۵ء نظر نواز ہوا۔ سرورق پر مجتبیٰ حسین کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ متین امروہوی کے منظوم خاکے کا ہر شعر داد کے قابل ہے۔ ''براہِ راست'' میں مجتبیٰ حسین نے جس خلوص اور تفصیل سے سوالات کے جوابات دیے ہیں اس سے اردو تہذیب، طنز و مزاح ادب کی ہندوستان میں صورت حال اور اُن کا خاندانی پس منظر سامنے آ گیا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے جو اپنی خامیوں کا ذکر کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ ''صادقین'' اور ''ادیبوں کے گھریلو حالات بے تصویر'' سادگی اور تازگی سے پُر مجتبیٰ صاحب کی تحریریں ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا مضمون یا خاکہ لکھنے کا آغاز کرنا بہت منفرد ہے یہ بات ''نائب وزیر اعظم کا شاعر بن جانا'' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ صاحبِ قرطاسِ اعزاز پر معروف اہلِ علم و فن کی تحریریں کمال کی ہیں ان نگارشات سے مجتبیٰ حسین کی شخصیت کے مختلف پہلو اور فکر و فن کے متنوع زاویے سامنے آتے ہیں کس کس تحریر کی تعریف کی جائے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنی محبت کا اظہار بے تکلفی سے کیا ہے۔ مجتبیٰ صاحب کے ''بڑے پن'' کے حوالے سے یہ جملے کتنے اہم ہیں۔

''جب ان کو غالب ایوارڈ برائے مزاح ملا تو یہ میرے پاس رونی سی صورت لے کر آئے اور کہنے لگے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اچھا نہیں کیا۔ اس ایوارڈ کے حق دار فکر تونسوی تھے۔'' (ص۔۳۰)

فکر تونسوی نے شگفتگی سے ذاتی مراسم اور فن کو موضوع بنایا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب نے ''سفر نامہ جاپان چلو'' پر اہم مضمون میں خوب لکھا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے ''آپ کی تعریف'' کے حوالے سے خاکہ نگاری پر قلم اٹھایا ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم نے طنز و مزاح کا خانہ خالی میں اپنے خاص انداز میں اسلوب کی تعریف کی ہے۔ یہی لکھنا پڑے گا بقول ڈاکٹر رینو بہل:

''محنت آپ کرتے ہیں اور اس کا لطف ہم اُٹھاتے ہیں''

منظر ایوبی، سید مشکور حسین یاد، غالب عرفان، صفوت علی، نعیم الدین نظر، دیوی ناگرانی، مراق مرزا، زاہدہ عابد حنا، تصور اقبال اور شفیع ہمدم کی غزلیں ہمارے عہد کی زندہ آوازیں ہیں۔ تفتہ زاری کی غزل اپنی ذات کے احتساب کی دعوت دیتی ہے۔ آصف ثاقب کی غزل کا یہ شعر اُن کی شاعری کے لیے اس ناچیز کی طرف سے داد و تحسین ہے:

صحنِ گلشن میں شعر کہتا ہوں
داد دینے کو چاند اُترا ہے

نسیم سحر کی غزل کی ردیف ''عشق'' کو وسیع تناظر میں دیکھا ہے۔

شفیق ہمدم کی غزل سے ایک حمدیہ شعر نے بہت لطف دیا:

خالق جو میرا ماں سے بھی بڑھ کر شفیق ہے
خوش ہوگا کیسے مجھ کو جہنم میں ڈال کر

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی آخری قسط میں حسبِ معمول سچائی، سادگی اور دلچسپی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ فیروز عالم صاحب نے جہاں ڈاکٹر ناظر جیسے مطلب پرست کا چہرہ دکھایا ہے وہاں ڈاکٹر محسن احمد جیسے انسان دوست شخصیت کے احسان کو بھی یاد رکھا ہے۔ مصنف نے اختتام پر ''چہارسُو'' کے قارئین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کیا ہے۔ میں یہاں دل کی گہرائیوں سے جناب گلزار جاوید کا ''چہارسُو'' کے قارئین اور خصوصی طور پر اہلِ میر پور خاص کی جانب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ''ہوا کے دوش پر'' قسط وار شائع کی جس سے بہت سی باتیں، شخصیات اور واقعات تاریخ کا حصہ بن گئے۔ پروین شیر کا سفر نامہ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' متاثر کن ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار بھائی، آداب۔

اس بار طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ مجتبیٰ صاحب کو آپ گھیر کر اپنے دم میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کامیابی کے لیے مبارکباد اور اس میں آپ کے حصہ دار جناب نند کشور وکرم صاحب بھی ہیں۔ تو پہلے مبارک اُن کو پھر آپ کو۔ ''صادقین'' پر مجتبیٰ صاحب کا خاکہ، ''نائب وزیر اعظم کا شاعر بن جانا'' اور ان سب سے بڑھ کر ''اردو کا آخری قاری'' پڑھ کر زبان سے صرف واہ واہ ہی نکلا۔ حسبِ معمول ''براہِ راست'' دلچسپ رہا۔ خاص کر آپ کا سوال ''شاعر، ادیب (بالخصوص اردو والے) ہتھیلی پر دل۔۔۔'' اور خود کو دوہرانے کا خوف جب ستاتا ہے تو۔۔۔ بہت خوب۔ مجتبیٰ صاحب نے جو اپنی بیٹی کے انتقال کا ذکر کیا اور اس کی تدفین کے فرائض انجام دینے کے فوراً بعد اخبار کے لیے مزاحیہ کالم لکھ دینا، اُف دل کو چیر گیا۔ سلام ایسی شخصیت کو۔ آپ نے تو سبھی اعلیٰ درجے کے ادیبوں

کے مضامین شامل کر کے اُن کی محفل کی رونق دوبالا کر دی۔

افسانے سبھی پسند آئے۔ عذرا اصغر صاحبہ کی کہانیوں کی تو میں ہمیشہ منتظر رہتی ہوں۔ ''روح کا کینسر'' عنوان کے بجائے اگر ڈاکٹر احسان احمد شیخ کوئی اور عنوان دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کہانی پڑھنے سے پہلے ہی عنوان سے کہانی ظاہر ہو گئی تھی۔ کہانی بہت خوب تھی، مردوں کے چلن کو اُنہوں نے بہت اچھے سے کہانی میں دکھایا ہے۔ ''انسانیت کا جنازہ''، ''سونامی''، ''کامریڈ''، ''قبرستان کا بھوت'' اور ''اپنوں کے درمیاں'' اچھی کہانیاں ہیں۔ ایک مدت سے گلزار جاوید صاحب کی کوئی کہانی/ ڈرامہ چہارسو کی شان نہیں بنا۔ ذرا اس پر بھی غور فرمائیے۔

''ہوا کے دوش پر'' آخری قسط دیکھ کر افسوس ہوا۔ ایک عرصہ تک ایک عام آدمی کی خاص داستان بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا تھا مگر اب اسے بھی اپنے انجام تک پہنچنا ہی تھا۔ یہ سفر اچھا رہا۔ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' سلسلہ وار شروع کر کے آپ نے اچھا کیا۔ پروین شیر اپنے ساؤتھ افریقہ کے سفر کا بیان انتہائی دلچسپی سے کرتی ہیں کہ کہانی پڑھنے کا گمان ہوتا ہے۔ انہوں نے Dick Gregory کے ناول ''نگر'' کا بیان اس انداز سے کیا کہ میری اُسے پڑھنے کی دلچسپی انتہائی بڑھی کہ میں نے وہ نیٹ سے کتاب تلاش کر کے خرید ہی لی اور اب اس آٹو بائیو گرافی کا لطف اٹھا رہی ہوں۔ وہ کتاب واقعی دل کو چھو لینے والی ہے۔

راج کھوسلہ پر اس بار کا دیپک کنول کا مضمون ہمیشہ کی طرح فلمی دنیا کی نئی دلچسپی سامنے لے کر آتا ہے۔ شعری حصہ مزے سے پڑھا جا رہا ہے۔ نیویارک، امریکہ، راولپنڈی، کراچی، لاہور، انبالہ، نیو دہلی، جبل پور، میر پور خاص، کوروکھیشتر، شیخو پورہ اور دیگر جگہوں کے نامور اہلِ قلم کی آپ نے خوب محفل سجائی ہے۔ اس بار کرشن گوتم صاحب نے خاصی طویل نظم لکھ کر سبھی کو نئے سال کی مبارکباد دی ہے۔

دعا کرتی ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو، آپ صحت یاب رہیں اور ۲۰۱۵ء میں آپ کی محنت کے پھل قارئین ہر بار کی طرح مزے سے کھائیں۔

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

دعا ہے کہ آپ کا ''چہارسو'' ادب کے رنگ چہارسو پھیلاتا رہے۔ اس بار کے تازہ شمارے میں بھی بہت اعلیٰ افسانے، غزلیں اور نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ انسانیت کا جنازہ (رونق جمال)، افق کے اُس پار (عذرا اصغر) اور تخلیق کائنات ڈاکٹر ریاض احمد کی ایک اور کمال کی تخلیق سامنے آئی۔ اس نظم میں بیک وقت شعری، ادبی، سائنسی اور تحقیقاتی حسن جھلملاتا نظر آتا ہے۔

خدا کرے آپ کے رسالے میں ایسے ہی لکھنے والے رنگ رنگ کے موتی پروتے رہیں اور ہم پڑھنے والے یہ موتی چنتے رہیں اور سر دھنتے رہیں۔

جواد الرحمٰن (اسلام آباد)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار چہارسو میں قرطاسِ اعزاز ممتاز طنز و مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے نام ہے۔ جو اُن کا حق ہے۔ آپ کمال کے آدمی ہیں ادب کے ساتھ ساتھ اہلِ ادب کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ انہیں متعارف کروانے میں بڑا جاندار کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہر مرتبہ ایسے معتبر ادیب یا شاعر کو اعزاز سے نوازتے جو واقعی اس اعزاز کا مستحق ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کمال کے ہیں۔

براہ راست میں پوچھے گئے سوالوں کی وجہ سے مجتبیٰ حسین کے بارے میں بہت سے اہم پہلو سامنے آئے۔ چہارسو میں شامل دیگر دوستوں کی تحریریں بھی سراہے جانے کے قابل ہیں۔ افسانے، نظمیں، غزلیں، سوانح، سفرنامہ کس کس کا ذکر کروں ایک چمن ہے سجا ہوا۔ اتنا خوبصورت مجلّہ شائع کرنے پر میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے چہارسو کا مجتبیٰ حسین نمبر شائع کر کے ایک ایسے نامور انسان کے لئے عظیم ادبی خدمت سرانجام دی ہے جو ہمہ جہتی تعلیمی ادبی اور سماجی شعبوں میں تقریباً گذشتہ چھ دہائیوں سے قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے جن کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جناب مجتبیٰ حسین کے کام پر مسلسل علمی اور ادبی تحقیق کی جاری ہے اور اب تک پانچ تحقیقی مقالے پی ایچ ڈی اور تین پر ایم فل کی ڈگریاں جاری ہو چکی ہیں۔ اُن کے کام کا مختصراً احاطہ تو آسانی سے نہیں ہو سکتا لیکن قرطاسِ اعزاز میں متین امروہوی صاحب نے ان کے سوانحی بیانیہ میں جو منظوم خاکہ پیش کیا ہے قابل داد ہے اور خلوصِ دل سے لکھا گیا ہے۔ جناب مجتبیٰ حسین کے تفصیلی حالات، اعزازات، طنز و مزاح اور خاکہ نگاری سے آپ نے برصغیر کے مختلف حلقوں کو روشناس کر کے جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے بجا طور پر آپ اس محنت طلب اور کامیاب کاوش پر دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمارے میں ''جاپان چلو''، ''صادقین''، ''اردو کا آخری قاری'' پڑھ کر دل نے چاہا کہ ان کی دیگر تصنیفات کہیں سے خرید کر پڑھی جائیں۔

اسی شمارے میں اچھے افسانوں مثلاً ''انسانیت کا جنازہ'' (رونق جمال) ''روح کا کینسر'' (ڈاکٹر احسان احمد شیخ) اور دلچسپ نظموں اور غزلوں کے مجموعہ نے ''چہارسو'' کے قارئین کے ذوق کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ ایک سہو کی طرف توجہ دلانا لازمی ہے۔ میری نظم کا مندرجہ ذیل شعر درست طور پر اس طرح پڑھا جانا چاہیے۔

''یہ حاسد اب بھی تاک میں ہے
آدم نہیں لوٹے جنت میں''

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

......مت سہل ہمیں جانو......

(آیئے میر پڑھیے)

عبداللہ جاوید کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ انُ کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی شاعری روایت اور جدت کا امتزاج ہے۔ اظہار کا قرینہ اور دروبست کا شعور انہوں نے روایت سے لیا ہے، جب کہ ذات اور اپنے سماج کی عصری کیفیات کے بیان کا رویہ عہدِ جدید کی دین ہے۔ اُن کے شعر میں تخلیقی برجستگی نمایاں ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سنبھل کر شعر کہتے ہیں۔

ہماری شعری تہذیب میں میرؔ کا مقام آج بھی مستحکم ہے۔ میرؔ کی بڑائی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اپنی وفات کے دو سو برس بعد بھی اُن کے اشعار آج کی زندگی کے تجربے اور انسانی احساس کو بڑی خوبی سے بیان کرتے، اور ان پر پوری طرح منطبق ہوتے اور ہمارے دل کو منور کرتے ہیں۔ بڑے اشعار کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اُن کی خوشبو ماورائے زمانہ سفر کرتی ہے اور بڑے شاعر اپنے عہد اور اپنے مادّی وجود کی حدوں سے گزر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ اس امر کی صداقت کا ثبوت میرؔ کے اشعار سے آج بھی ملتا ہے۔ ''مت سہل ہمیں جانو'' میں عبداللہ جاوید نے عصری ادبی وسماجی رجحانات اور فکری ونظری عناصر کو میرؔ کے اشعار کی تفہیم کے لیے خوبی سے برتا ہے۔ عبداللہ جاوید خود شاعر ہیں اور ایک حساس اور باشعور انسان ہیں۔ میرؔ کے اس مطالعے سے ہمیں اُن کے ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اُن کی تنقیدی بصیرت کا بھی۔ اُن کا مطالعہ وسیع ہے اور ماشاءاللہ حافظہ بھی قوی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے اساتذہ کے اشعار اور دوسری زبانوں کے ادبی حوالوں کو بھی برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مطالعہ صرف تفہیم میرؔ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ قاری کے وسیع ادبی ذوق کی سیرابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ......ڈاکٹر جمیل جالبی

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی۔

...... کتاب الشعر ......

''کتاب الشعر'' نقشبند قمر نقوی بھوپالی کی ایسی تصنیف ہے جو صنف عروض سے شغف رکھنے والے ادباء کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ یہ ماہر عروض طبقے کے لیے بھی اگر کسبِ فیض کی نہیں تو یاد دہانی کا باعث ضرور ہے۔ اس دور میں جبکہ عروض کو سمجھنے اور پوری طرح برتنے والے نہ کے برابر ہیں نقشبند قمر نقوی بھوپالی نے اس تصنیف کے ذریعے ایک ایسا روشن باب کھول دیا ہے جس سے کہ بغیر کسی ذہنی الجھن کے ادباء شعراء اس کتاب سے اس کے دلچسپ اسلوب کے سبب مطالعہ کر سکتے ہیں اور اپنی تخلیقات کے شعری محاسن مزید نکھار سکتے ہیں۔ آج کے ادبی ماحول کو دیکھتے ہوئے مجھے نہیں لگتا کہ اس طرح کی تصنیف آئندہ بہت جلد وجود میں آئے گی، اس لیے کہ نقشبند قمر نقوی بھوپالی نے ''کتاب الشعر'' کی تصنیف میں جس طرح خون جگر ایک کیا ہے آج کے دور میں اس طرح کی ادبی مشقت کرنے والے چند ایک کے علاوہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے۔ ......میکش امروہوی

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۱۶۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت۔

...... مقصود الٰہی شیخ ......

(ادب ساز وادب نواز)

''مقصود الٰہی شیخ کی ادبی وصحافتی خدمات'' کے عنوان سے میں نے یہ مقالہ ایم۔ فل اُردو کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں قلم بند کیا ہے۔ اس کے پانچ ابواب ہیں۔ پہلا باب سوانح، سیرت وشخصیت، تصنیفات، اعزازات وایوارڈ پر مشتمل ہے۔ جب کہ دوسرے باب میں مقصود الٰہی شیخ کی افسانہ نگاری کا کتاب وار جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا ابواب ناولٹ نگاری پر محیط ہے۔ جب کہ چوتھا باب مقصود الٰہی شیخ کی ادبی صحافت نگاری پر مشتمل ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں مجموعی طور پر شیخ صاحب کے فن کا جائزہ اس انداز میں لیا گیا ہے کہ جن افسانہ نگاروں سے انہوں نے متاثر ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کے فنی مزاج اور چند اور تخلیق کاروں کے افسانوی مزاج کو سامنے رکھ کر مقصود الٰہی شیخ کے رجحان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں مختلف مشاہیر کی آراء کی روشنی میں مقصود الٰہی شیخ کا ادب میں مقام ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ ......میمونہ روحی

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: فضلی بک سپر مارکیٹ 507/3 ٹیمپل روڈ، اردو بازار، کراچی۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی